WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

PAKSOCIETY.COM

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

اللہ کی باندھی ہوئی حدیں

روزوں کی راتوں میں تمہارے لیے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا ہے۔O

(سورۃ البقرہ 187:2)

اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔ پھر روزہ رات تک پورا کرو اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو عورتوں سے نہ ملو۔ یہ حدیں باندھی ہیں اللہ کی سو ان کے پاس نہ جانا۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ بچتے رہیں۔O

(سورۃ البقرہ 187:2)

رسول ﷺ کا فرمان

روزے دار کی دو مسرتیں

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس دن کوئی شخص روزے سے ہو تو اسے چاہیے کہ نہ تو فحش کلامی کرے، نہ چیخے چلائے اور جھگڑے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "روزے دار کو دو مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جب افطار کرتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور جب اپنے رب سے ملے گا تو وہ بھی اس کے روزے کے سبب اس سے خوش ہوگا۔"

(بخاری کتاب 30: باب 9، مسلم کتاب الصیام، باب 30)

جنت کا دروازہ

حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جنت میں ایک دروازہ ہے، جس کا نام "ریان" (سیراب کرنے والا) ہے۔ اس دروازے سے روزِ قیامت صرف روزے دار داخل ہوں گے۔"

(بخاری کتاب 30: باب 4، مسلم کتاب الصیام۔ باب 30)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فہرست

دفاع نمبر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فہرست

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فہرست

دفاع نمبر

گوشۂ فلسطین

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بحران سے نکلنے کا محفوظ راستہ

پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کا علامہ طاہر القادری اور کپتان عمران خان دو ہفتوں سے محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔ اب تک سات سو ارب سے زائد کا نقصان ہو چکا ہے، امورِ مملکت ٹھپ ہوتے جا رہے ہیں، پارلیمان کی گزرگاہوں پر ڈنڈا بردار لوگ بیٹھے ہیں اور حکومت اور اسمبلیوں کی بساط لپیٹ دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ''آزادی'' اور ''انقلاب'' مارچ کے قائدین قانون، اخلاق اور شائستگی کی تمام حدیں عبور کرتے ہوئے اور شہادت کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ پورا ملک ایک غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار ہے جبکہ شمالی وزیرستان میں دہشت گردوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ جاری ہے جس میں کامیابی کے لیے فوج کو قوم کی فعال حمایت درکار ہے۔ بھارت نے پاکستانی چوکیوں پر حملے شروع کر دیے ہیں اور مغربی سرحد پر افغانستان کی طرف سے یلغار میں قدرے تیزی آ گئی ہے۔ خدانخواستہ اگر سیاسی بحران جاری رہا، تو بدامنی پھیل سکتی ہے جو دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت کو ایک انتہائی ہولناک آزمائش سے دوچار کر دے گی۔ یہ صورتِ حال کیوں پیدا ہوئی اور اس کے داخلی اور خارجی محرکات کیا کیا ہو سکتے ہیں، ان کا بھرپور تجزیہ طوفان تھم جانے کے بعد ہی کیا جا سکے گا جبکہ فوری ضرورت گہرے ہوتے ہوئے بحران پر جلد سے جلد قابو پا لینے کی ہے۔

گزشتہ دو ہفتوں سے ہمارے بیشتر ٹی وی چینلز دن رات ایسے ایسے مناظر دکھا رہے اور ایسے ایسے خوانی خطاب سنا رہے ہیں کہ اندر کی ہر چیز عیاں ہو گئی ہے اور خواہشات کے تمام بندھن ٹوٹ گئے ہیں۔ عوام کے غم سے نڈھال اور شوقِ شہادت سے بے قرار لیڈرانِ کرام اس زور سے دھاڑتے اور پیچ و تاب کھاتے ہیں کہ قوم کے اعصاب شل ہو گئے ہیں اور سروبال دوش بنتے جا رہے ہیں۔ دو اشخاص نے ایک جنون کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ایسے میں سلامتی کی راہ تک پہنچنا دشوار تر ہو گیا ہے۔ اہلِ خرد تاحال تدبر سے کام لیتے ہوئے گتھیاں سلجھانے کی مقدور کوششیں کر رہے ہیں، مگر ہیجان ہر لحظہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ پارلیمان میں بارہ میں سے گیارہ سیاسی جماعتیں آئین کی بالادستی، قانون کی حکمرانی اور اعلیٰ سیاسی روایات کے مطابق مذاکرات کے ذریعے معاملات طے کرنے کے لیے پرعزم ہیں جبکہ دھرنے دینے والے قائدین ''ہجوم'' کی طاقت پر تکیہ کیے ہوئے ہیں اور ہر چیز نیست و نابود کر دینے کے الٹی میٹم دے رہے ہیں۔ ''ہیروز'' کی فراوانی سے ہماری سرزمین بدقسمت دکھائی دیتی ہے۔ ہم ان کے حملوں سے محفوظ رہنے اور اپنے وطن کو بحران کے گرداب سے نکالنے کے لیے چند تجاویز پیش کرتے ہیں:

۱۔ عمران خان اور طاہر القادری جو زبان استعمال کر رہے ہیں اور دھرنے دینے والوں کے اندر جو اشتعال پھیلا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہے ہیں ان کا سب سے بڑا مقصد امن عامہ کا مسئلہ پیدا کر کے فوج کو مداخلت پر مجبور کر دینا ہے جو ان کے خیال میں حکومت اور جمہوریت کی بساط لپیٹ دے گی اور ایک تین سالہ عبوری حکومت قائم کر دے گی۔ بعد میں انتخابات کے ذریعے عمران خاں وزیراعظم بن جائیں گے اور طاہر القادری صاحب بھی کسی بڑے منصب پر فائز کر دیے جائیں گے۔ اس کوشش کو ناکام بنانے کے لیے حکومت کی یہ اولین کوشش ہونی چاہیے کہ مذاکرات کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے اور تصادم اور خونریزی میں کوئی لاش گرنے نہ پائے۔ عدالت عظمیٰ نے ریڈزون خالی کرانے کی جو ہدایات دی ہیں، ان پر اتنے سلیقے سے عمل درآمد کرنا چاہیے کہ کسی کی نکسیر بھی نہ پھوٹے۔ اب تک وزیراعظم نے کمال ضبط سے کام لیا ہے اور پارلیمان کے ناصرے کو بھی فساد کا باعث نہیں بننے دیا۔ دھرنے دینے والوں کو میڈیا کی طرف سے یہ احساس دلاتے رہنا چاہیے کہ حساس علاقے خالی کر دینا ان کے اپنے مفاد میں ہے ورنہ ایک روز وہ قانون کی زد میں آجائیں گے اور عوام کی نظروں سے اتر جائیں گے۔

۲۔ بدقسمتی سے دو سرپھروں نے ہجوم کو پارلیمان کے مدمقابل لا کھڑا کر دیا ہے۔ پارلیمان اٹھارہ کروڑ عوام کی نمائندہ ایک بالادست ادارہ ہے جس نے اپنا وزیراعظم اکثریت سے منتخب کیا ہے۔ اس تناظر میں وزیراعظم نواز شریف کو اپنے اعصاب پر قابو رکھتے ہوئے پارلیمان کے دونوں ایوانوں کی متفقہ قراردادوں کے مطابق اپنے منصب پر بڑی حوصلہ مندی سے سرفراز رہنا چاہیے۔ بیس تیس ہزار کی تعداد میں جذبات سے مغلوب ہجوم کے اس مطالبے کی کوئی آئینی اور قانونی حیثیت نہیں کہ نواز شریف استعفیٰ دیں۔ ہماری رائے میں انہیں مستعفی ہونے کے بجائے اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے بڑے سیاسی فیصلے کرنے اور مظاہرین کی جائز شکایات کے ازالے کے لیے فوری اور مؤثر قدم اٹھانے چاہئیں۔

۳۔ ۱۷ جون کے پچھلے پہر جو سانحہ ماڈل ٹاؤن میں رونما ہوا جس میں چودہ شہری جاں بحق اور درجنوں زخمی ہوئے، اس کی ایف آئی آر مدعیان کی طرف سے فوری طور پر درج کی جائے۔ لاہور ہائی کورٹ نے ایڈیشنل سیشن جج کے اس فیصلے کو برقرار رکھا ہے کہ مدعین کی طرف سے وزیراعظم کے علاوہ اکیس افراد کے خلاف ایف آئی آر درج کی جائے۔ اس نے اپنے فیصلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ثبوت کے بغیر کسی نامزد شخص کو گرفتار نہ کیا جائے۔ اس فیصلے کے خلاف اپیل میں جانے کے بجائے حکومت پنجاب متعلقہ ایس ایچ او کو سیشن کورٹ کے حکم کی تعمیل کرنے کا پابند کرے کیونکہ ایف آئی آر درج کرانا مقتولین کے ورثا کا بنیادی حق ہے۔ اس کے اندراج کے بعد تفتیش کا عمل شروع ہوگا اور جن نامزد اشخاص کے خلاف ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کیے جائیں گے ان کے نام خارج کر دیے جائیں گے۔ وزیراعلیٰ پنجاب کے لیے بالآخر قانون کا راستہ اختیار کرنا ہی ان کے لیے سب سے بہتر ہے، کیونکہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے سے جہاں وزیراعلیٰ پنجاب کو ایک بڑا قانونی دھچکا لگا ہے، اس سے کہیں بڑا اخلاقی دھچکا جسٹس باقر نجفی کی تحقیقاتی رپورٹ اور جائنٹ انویسٹی گیشن ٹیم کی رپورٹ کے ''لیک'' ہونے سے پہنچا ہے۔ ان دو رپورٹوں کے مندرجات سامنے آنے سے یہ تاثر پیدا ہوا ہے کہ پنجاب پولیس شہریوں کے خون کی ہولی کی ذمے دار تھی، اس کے ریکارڈ میں رد و بدل کی گئی اور وزیراعلیٰ بھی اس میں کسی طور ملوث ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ان مندرجات پر علامہ قادری نے زار و قطار روتے ہوئے جناب میاں شہباز شریف سے فوری طور پر مستعفی ہونے کا مطالبہ کر دیا ہے اور اب تو وہ نواز شریف اور شہباز شریف کو پھانسی دینے کی باتیں کر رہے ہیں جن سے اُن کی حد سے بڑھی ہوئی جذباتی اور مایوسی جھلک رہی ہے۔ دانش کا تقاضا یہ ہے کہ ایف آئی آر کی رجسٹریشن کے بعد انھیں دھرنا ختم کر کے قانونی عمل میں شامل ہو جانا اور ایف آئی آر میں بے گناہ لوگوں کے نام درج کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اس طرح ڈیڈلاک ختم ہونے کے امکانات بہت روشن ہو جائیں گے۔

۴۔ مذاکرات کے ذریعے جناب عمران خان کے چھ میں سے پانچ مطالبات مان لیے گئے ہیں جو ان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ وہ اس کامیابی کی بنیاد پر آگے چل کر بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ سینیٹر جعفر اقبال نے وزیراعظم صاحب کو اس ضمن میں ایک خط لکھا جس میں عمران خان کو ڈپٹی وزیراعظم بنانے کی تجویز دی۔ خان صاحب نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ انھیں لالچ دے کر نظام کی اصلاح کے راستے سے حکومت ہٹا دینا چاہتی ہے۔ انتخابات میں دھاندلی کا الزام ثابت ہوئے بغیر وزیراعظم سے استعفا طلب کرنا آئین، قانون اور سیاسی روایات کے خلاف ہے اور ٹیکنوکریٹس کی حکومت کا قیام تیسری طاقت کی مداخلت کے بغیر کسی طور قابلِ عمل نہیں۔ ان کے لیے جمہوریت کی بساط لپیٹ دینے کا الزام اپنے سر لینے کے بجائے عدالتِ عظمیٰ کے سہ رکنی کمیشن کے ذریعے انتخابات میں دھاندلی کی ہمہ پہلو تحقیقات پر اکتفا کرنا اور اس کی سفارشات کی بنیاد پر آئندہ کا لائحہ عمل بنانا مفید رہے گا۔ عدالتی کمیشن کی شرائط اور قواعد و ضوابط اس طرح وضع کیے جائیں کہ عدالتی کمیشن دھاندلیوں کی تمام صورتوں کا جائزہ لے سکے، اسے وفاقی محتسب جیسے اختیارات بھی دیے جائیں تاکہ مجرم قانون کے کٹہرے میں لائے جا سکیں۔ اس کے علاوہ تحقیقات کے لیے مناسب وقت دینا ازحد ضروری ہے۔ آپ انتخابات کے پورے عمل کو چیلنج کر رہے ہیں اس لیے حقائق تک پہنچنے میں خاصا وقت لگ سکتا ہے۔ اتنا بڑا کام فقط تیس دنوں میں مکمل نہیں پا سکتا۔

۵۔ عمران خان کو عجلت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے بلند مقاصد کے حصول کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔ آپ اگر انتخابی نظام کے اندر بنیادی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے دو چیزوں کا ہونا لازمی ہے۔ ایک پارلیمان اور دوسری انتخابی اصلاحات کا وسیع تناظر میں تعین۔ نئے انتخابات جن کا مطالبہ خان صاحب کر رہے ہیں اُن کا پورا فائدہ اسی وقت ہو گا جب پارلیمان کے ذریعے ایک نیا انتخابی نظام وضع کر لیا جائے گا، ایک متحرک، آزاد اور باصلاحیت الیکشن کمیشن وجود میں آ جائے گا، انتخابات کے لیے درکار لاکھوں افراد پر مشتمل عملے کی سلیکشن، تربیت اور اس کی آمد و رفت کا ایک قابلِ اعتماد نظام وضع ہو جائے گا۔ یہ سارے کے سارے معاملات بڑے اہم، حساس اور نازک ہیں اور اُن کی تشکیلِ نو غیرمعمولی احتیاط اور محنت کا تقاضا کرتی ہے۔ تمام انتخابات کے حوالے سے بنیادی اہمیت الیکشن کمیشن کو حاصل ہے مگر سالہا سال سے اس کی حالت ناگفتہ بہ چلی آ رہی ہے۔ سب سے بڑی کمزوری اس کی ساخت کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس کا چیف الیکشن کمشنر اور اس کے چاروں ارکان عدلیہ سے لیے جاتے ہیں چنانچہ وہ توانائیوں سے محروم اور انتظامی صلاحیتوں سے محروم ریٹائرڈ جج صاحبان پورے ملک میں ایک روز کے اندر انتخابات عالمی معیار کے مطابق اور قابلِ اطمینان طریقے سے کرانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ آئین کی بیسویں ترمیم نے چیف الیکشن کمشنر کو اختیارات سے یکسر محروم کر دیا ہے جس کے باعث اس کا الیکشن کمیشن پر کوئی کنٹرول نہیں رہا۔ اس تناظر میں ہمیں آئین میں ترمیم کر کے جج صاحبان کے علاوہ اعلیٰ درجے کے منتظمین اور اچھی شہرت اور قابلیت کے حامل ماہرینِ قانون و معاشرتی علوم کے ماہرین کو شامل کرنا ہو گا۔ بھارت میں الیکشن کمیشن میں ایک چیف الیکشن کمشنر اور دو ارکان ہوتے ہیں جن کا تعلق انڈین سول سروس سے ہے۔ اپنی غیرمعمولی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

انتظامی قابلیت کے باعث انھوں نے انتخابات کا ایک ایسا نظام قائم کر دیا ہے کہ بھارت کے اندر حال ہی میں جو عام انتخابات ہوئے اُن میں الیکشن ٹریبونل کے سامنے دھاندلی کی ایک شکایت بھی نہیں آئی۔ اس نظام کے تفصیلی مطالعے کے لیے پاکستان سے ایک وفد جانا چاہیے جس میں پارلیمان کے ارکان کے علاوہ سیاسی تجزیہ نگار اور قانون دان بھی شامل ہوں۔ اس کی رپورٹ انتخابات کو شفاف بنانے میں بہت مفید ثابت ہوگی۔

۶۔ ہمیں اس امر کا تعین کر لینا چاہیے کہ انتخابی اصلاحات کی اصل غرض و غایت کیا ہے۔ انتخابات میں دھاندلیوں کے عنصر پر قابو پانے کے علاوہ سب سے بڑا مقصد یہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ ایک عام شہری بھی اپنی صلاحیتوں کے ساتھ منتخب ہو سکے اور وفاق کی اکائیوں کی فیصلہ سازی اور بجٹ کی منظوری میں جائز حصہ مل جائے۔ موجودہ نظام کے اندر اشرافیہ نے مختلف طریقوں سے منتخب اداروں پر قبضہ جما رکھا ہے۔ ہمارے وطن کے مختلف حصوں میں جاگیرداروں، سرداروں اور گدی داروں کا قبضہ ہے۔ ان کی زمینوں پر جو مزارع اور ہاری کام کرتے ہیں وہ انتخابات میں کھڑا ہونے اور جیت جانے کا تصور نہیں کر سکتے۔ انھیں تو اپنی بیٹیوں اور بیٹوں کی شادیاں اپنی مرضی سے کرنے کا بھی اختیار نہیں۔ ان بڑے بڑے زمینداروں کے انتخابی حلقے بڑی حد تک محفوظ ہیں اور ہماری ۶۵ فیصد آبادی قصبوں اور دیہات میں ہے۔ اس طبقاتی نظام کے اندر منصفانہ انتخابات کیسے ممکن ہیں جبکہ سیاسی جماعتوں پر بھی یہی سردار و خوانین غالب ہیں۔ اس کے علاوہ ایک حلقے میں سب سے زیادہ ووٹ لینے والا امیدوار کامیاب ہو جاتا ہے جبکہ مجموعی طور پر اس سے زائد ووٹ لینے والے ناکام ہو جاتے ہیں اور ان کے ووٹر نمائندگی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی بنیادی نقص کے باعث گزشتہ سال کے انتخابات میں تحریکِ انصاف نے ۷۶ لاکھ ووٹ حاصل کیے اور اسے صرف ۳۳ نشستیں میسر آئیں جبکہ پیپلز پارٹی نے اُن سے بہت کم یعنی پچاس لاکھ ووٹ لے کر ۴۵ نشستیں جیت لیں۔ یہ صورتِ حال متناسب نمائندگی کا نظام رائج کرنے کی ضرورت کا احساس دلاتی ہے۔ اسی طرح خواتین کی مخصوص نشستیں سیاسی وڈیروں کی جیب میں ہیں اور ایک گھرانے میں دو دو تین تین ایم این اے اور ایم پی اے موجود ہیں۔ سینیٹ بھی اسی سیاسی اشرافیہ کا قبضہ ہے اس لیے ضرورت ہے کہ آئینی ترامیم کے ذریعے قومی اسمبلی کی میعاد چار سال اور سینیٹ کے انتخابات براہِ راست کرائے جائیں۔ ہر دو سال بعد پچاس فیصد ارکان ریٹائر ہو جائیں اور براہِ راست انتخابات کے ذریعے نیا خون شامل ہوتا رہے۔

۷۔ دوررس اور انقلابی اصلاحات کے لیے کم از کم دو تین سال درکار ہوں گے۔ ہمیں سیاسی جماعتوں کا ڈھانچہ تبدیل کرنا ہوگا، اقتداری نظام کی تشکیلِ نو کرنا ہوگی اور مراعات یافتہ طبقات بتدریج ختم کرنا ہوں گے اور عوام کو بااختیار بنانے کے لیے مقامی حکومتوں کا نظام نہایت مستحکم اور پائیدار بنیادوں پر استوار کرنا ہوگا۔ سب سے اہم بات یہ کہ جمہوریت کو حکمرانوں کی غلامی سے بچانا اور اسے دستوری تحفظ فراہم کرنا ہوگا۔ اسلام آباد کے دھرنے عوام اور سسٹم کے لیے آزمائش کا باعث بنتے جا رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ تشدد سے اجتناب کیا جائے گا اور بحران سے نکلنے کے بعد فکری سیاسی اور انتظامی تشکیل کا ایک نیا عہد شروع ہوگا۔ احساسِ ذمے داری سے جھک جانے والے عزتیں پائیں گے اور سرموئی کا زعم رکھنے والے گمنامی کی قبروں میں سو جائیں گے۔

ہر طرف سے ایک ہی کوشش ہونی چاہیے کہ آئین اور آئینی حکومت کا علم بلند رہے اور فوج کو عوام کی مکمل حمایت حاصل رہے جو پاکستان کی بقا اور سلامتی کی جنگ لڑ رہی ہے۔ دھرنوں کے باعث شمالی وزیرستان سے آنے والے متاثرین کے مسائل میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے اور آپریشن ضربِ عضب بھی پس منظر میں چلا گیا ہے۔ اس کا الزام ان قائدین پر آئے گا جو عقل و ہوش سے بے گانہ ہو چکے ہیں۔ انھیں بحران کا حصہ بننے کے بجائے بحران کا حل ڈھونڈنا چاہیے۔

الطاف حسن قریشی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اللہ کے شکر گزار بنیے

دینی و دنیاوی کامیابیاں پانے کا تیر بہدف نسخہ

جاوید احمد صدیقی

نسیم اور وسیم دونوں رشتے دار تھے۔ دونوں نے کاروبار میں مصروف رہ کر اللہ کا رزق سمیٹ رہے تھے۔ بزرگوں کی دعائیں اور سخت محنت رنگ لائی اور ان کے کاروبار چمک اٹھے۔ دونوں اکثر ملتے۔ کاروبار کی باریکیوں اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کے لیے مختلف پہلوؤں پر بحث مباحثہ کرتے۔

ایک ڈگر پہ چلتے چلتے وسیم کو محسوس ہوا کہ نسیم کچھ بجھا بجھا سا رہنے لگا ہے۔ ایک دن وسیم نے گھر آتے ہوئے اس کے گھر جانے کی ٹھان لی۔ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے سنجیدگی سے بات کرنے لگے۔ وسیم نے بڑے ہی محبت کے انداز میں نسیم سے بجھے بجھے رہنے کی وجہ جاننا چاہی۔ پہلے تو نسیم ادھر ادھر کی بات کر کے ٹالنے کی کوشش کرنے لگا مگر پھر دوست کے بے حد اصرار پر بولا:

"بھائی! ہمیں کاروبار کرتے کرتے پانچ سال ہو چکے۔ چند ماہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے ترقی رک سی گئی ہے۔ گاہکوں کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے۔ لگتا ہے، کمائی سے برکت ہی اٹھ چکی۔ جتنی مرضی عرق ریزی کر لوں نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ گھر میں سب ہی صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں مگر ایسے لگتا ہے جیسے برکت اٹھتی جا رہی ہے۔"

وسیم نے پوچھا "نسیم بھائی! یہ بتاؤ اللہ کا کرم ہونے کے باوجود شکرانے کے چند نفل ادا کیے ہیں یا نہیں؟"

نسیم فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ بولا: "واقعی اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے میں کوتاہی ہوئی ہے۔ اب یہ کبھی نہ ہوگا۔"

وسیم نے کہا "بھئی نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے ہی وہ پھلتی پھولتی ہیں۔ تب اللہ بندے کی ہر آسائش اور رزق کی حفاظت ہی نہیں کرتا بلکہ برکت بھی ڈالتا چلا جاتا ہے۔"

نسیم نے اسی دن نہ صرف شکرانے کے نفل پڑھے بلکہ غربا میں دیگ پکانے پر سامان خورونوش بھی تقسیم کرایا۔ شکر کی برکت سے جلد ہی اس کا کاروبار پھر چل پڑا اور گاہک

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بڑی تعداد میں آنے لگے۔

شکر ایک قسم کی عبادت ہے۔ انسان ہوش کی آنکھ کھولے تو اسے سب سے پہلی نصیحت یہی کی جاتی ہے کہ وہ خدا کا شکر گزار بندہ بنے۔ خدا کے ساتھ ان دو ہستیوں کا بھی جو اسے وجود میں لانے کا باعث بنیں یعنی والدین! سورۂ لقمان میں فرمایا گیا ہے ''میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا، میری ہی طرف پلٹنا ہے۔'' (۱۴) یہ حقیقت ہے کہ ''انسان اگر شکر کرے تو اللہ بھی اسے پسند کرتا ہے۔''

سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے ''لہٰذا تم مجھے یاد کیا کرو، میں تمہیں یاد کیا کروں گا۔ میرا احسان مانتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔''

حضور پاک ﷺ لمبی لمبی رکعات پڑھتے اور رات بھر اللہ کے حضور کھڑے رہتے۔ ایک صحابیؓ نے عرض کی ''یارسول اللہ ﷺ آپ کے تو اللہ تعالیٰ نے اگلے پچھلے قصور معاف کر دیے پھر آپ ﷺ اتنی زیادہ عبادت کیوں کرتے ہیں؟''

جواب آیا ''تو کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر نہ دکھاؤں؟''

اسی طرح ایک روایت میں حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ چار چیزیں جس آدمی کو مل گئیں سمجھو اسے دنیا اور آخرت کی سب خیر مل گئی:

(۱) شکر گزار دل (۲) ذکر کی گرویدہ زبان (ہر وقت اللہ کا ذکر زبان پر رہنا)، (۳) مصیبت کے وقت صابر بدن اور (۴) بیوی جو اپنی ذات میں یا اس کے مال میں کسی خیانت کی روادار نہ ہو۔

حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ ایک مسلمان جب کوئی اچھا اور مہنگا لباس خرید کر زیب تن کرے اور ساتھ ہی اللہ کی حمد اور تعریف اور شکر گزاری کرتا ہے تو اس کی قمیص گھٹنوں تک بھی پہنچ نہیں پاتی کہ اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔'' سبحان اللہ۔

اللہ نے خود فرمایا ہے ''اگر تم شکر گزار ہو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا۔'' اسی لیے کہا گیا ہے کہ نعمت کا تحفظ کرنے اور نعمت کو بچا رکھنے والی چیز کوئی ہے تو وہ شکر ہے۔ شکر وہ چیز ہے جو کھوئی ہوئی نعمت کو بھی لوٹا لائے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر چھوٹی سے چھوٹی نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ جو چھوٹی سہولت و نعمت پر شکر گزار نہیں بنتا اسے بڑی نعمت ملنے پر بھی شکر کا موقع نہیں ملتا۔۔۔۔۔ تندرستی، چلنا پھرنا، صحیح بولنا، دیکھنا اور کانوں سے سننا، یہ سب شکر گزاری کے ہی دائرے میں آتے ہیں۔ ہم تو اللہ کی صرف آنکھوں جیسی نعمت کا بھی کماحقہٗ شکر ادا نہیں کر سکتے، بے شک تمام عمر سجدے میں پڑے اس کا شکر ادا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

اللہ کی ہر نعمت بلکہ انسان کا سانس لینا اور پھر باہر نکالنا بھی اسی کی رضا اور توفیق سے ہے، یہ بھی شکر گزاری کے لائق ہے۔ اللہ کی شکر گزاری کرتے رہنا چاہیے تاکہ انسان اللہ کی ہر ہر نعمت پر شکر ادا کرنے کی عادت میں گم رہے اور کسی بھی سے غافل نہ ہو۔

ہمیں بچوں، عزیزوں اور اردگرد کے احباب کو شکر ادا کرنے کی عادت ڈالیے۔ ہر لمحہ ہر قدم اور ہر سانس کے ساتھ شکر ادا کرنے کی ازلی عادت پالنا ہی انسان کو اللہ کا شکر گزار بندہ بناتی ہے۔ یہ یاد رکھیے اس وحدہٗ لاشریک کا شکر ادا کرو گے تو اپنا فائدہ ہے ورنہ اسے اس کی کیا ضرورت؟''

◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

چادر ڈھونڈی اور نیچے پہنچی۔ سارا تایا کا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ میں فوراً مرکزی دروازہ کھول باہر آ گئی۔

شعلے اور دھواں دس گھروں کے فاصلے سے بھی جہنم کے منظر کی یاد دلا رہا تھا۔ آگے بڑھنے کی میری ہمت جواب دے گئی۔ مرے مرے قدموں سے گھر واپس آئی اور نماز پڑھنے لگی۔ پھر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ چچا نواز اور ان کے اہل خانہ سلامت رہیں۔ ابھی سلام پھیرا تو نبیل بھائی اندر آئے۔ میں بھاگ کر ان کے پاس پہنچی۔ "سب خیریت ہے ناں بھیا؟" میں سراپا سوال تھی۔

"خیریت کہاں گڑیا، سب کچھ جل گیا سب کچھ۔" انھوں نے افسردہ لہجے میں میرے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ہوا کیا ہے؟ آگ کیسے لگی؟ چچا اور بچے تو ٹھیک ہیں ناں؟"

میں نے ایک ہی سانس میں سارے سوال کر ڈالے۔

"ذرا صبر کرو۔ بھائی تھکا آیا ہے۔ اسے پانی لا کر دو۔ آتے ہی چھان بین شروع کر دی۔" امی نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔

میں جلدی سے پانی لے آئی۔ تب امی نے بتایا "نواز اور اس کی بیوی بیمار بھائی کی عیادت کرنے گئے تھے۔ چاروں بچے گھر پر تھے۔ دونوں بڑے تو ماں باپ کے جاتے ہی گھر سے نکل گئے۔ تین اور آٹھ سالہ ذیشان اور رضوان گھر پر رہے۔ انھوں نے کھیلتے کھیلتے کہیں ماچس کی تیلی جلائی۔ وہ کپاس کی خشک لکڑیوں میں گری اور آگ لگ گئی۔ چونکہ گھر پر کوئی نہ تھا اس لیے پتا نہیں چلا۔

"دونوں چھوٹے بچے بھی آگ تیز ہوتے ہی گھر سے باہر نکل آئے۔ لیکن کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ تیز ہوا نے جلد آگ کو پورے گھر میں پھیلا دیا۔ دوپہر کا وقت تھا ہمسائے محوِ خواب تھے۔ نماز کے لیے اٹھے تو نظر پڑی۔ مگر آگ بجھاتے بجھاتے سب کچھ ختم ہو گیا۔ اللہ کا شکر ہے جانیں بچ گئیں۔"

"تمھاری چچی کی حالت تو بہت ہی خراب ہے۔ رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔" نبیل بھائی کے لہجے میں دکھ اور پریشانی نمایاں تھی۔ "مجھ میں تو وہاں سب کچھ دیکھنے کا حوصلہ ہی ختم ہو گیا۔ کیسے انھوں نے تنکا تنکا جوڑ کر گھر بنایا سنوارا تھا، پل بھر میں سب کچھ ختم ہو گیا۔"

"سب کچھ ختم نہیں ہوا بیٹے! دیکھو دو جہاں کے مالک کی کتاب بالکل درست حالت میں موجود ہے۔ اور یہ دیکھو اس پہ لپٹا ہوا کپڑا بالکل جل چکا۔" ابو جی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

ان کے ہاتھوں میں قرآن پاک تھا۔ اس کی جلد پہ کپڑا جل کر چپکنے کے نشانات واضح تھے لیکن الفاظ کو آگ نے چھوا تک نہیں تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس کے اندر رکھے گئے ۲۰۰ روپے بھی درست حالت میں تھے۔

میں نے جلدی سے ابو جی کے ہاتھوں سے قرآن پاک لیا اور روتے ہوئے چومنے لگی۔

"یہ تو معجزہ ہے معجزہ! قرآن پاک کا زندہ معجزہ! اگر کاغذ پہ لکھے قرآن پاک کو آگ نہیں چھو سکتی تو جن دلوں کے اندر قرآن پاک ہے اور جن لوگوں کے جسم احکام قرآنی پہ عمل کر رہے ہیں، انھیں جہنم کی آگ کیسے جلا سکے گی؟" امی نم آنکھوں کے ساتھ قرآن پاک کو بوسہ دیتے بے ساختہ بول اٹھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور جن نے آسمان کی طرف منہ کرتے ہوئے کہا: "تو اللہ نے ہم جیسوں کو دکھانا تھا کہ گمراہی میں پڑے لوگو! آؤ دیکھو میرے کلام کی تاثیر کہ جہاں کپڑے کا ایک ٹکڑا نہ بچا یہاں تک کہ جستی پیٹی کے اندر رکھے کپڑے تک جل گئے، وہاں کھلے طاق میں کپڑے میں لپٹا قرآن پاک محفوظ رہا اور اس کے اندر رکھے تین سو روپے بھی۔

"میں نے کوارت سے کہا ہے بھائی، یہ تین سو روپے بہت بابرکت ہیں اور تیرے سارے دکھوں کا علاج بھی، تم دیکھو کہ اللہ پاک ان روپوں سے تیرے گھر میں بہت برکت ڈالے گا۔ تیرا گھر تو اللہ کی شان اور قرآن پاک کے معجزہ ظاہر ہونے کی جگہ ہے۔ تیرے لیے تو پروردگار اب خیر ہی خیر رکھے گا۔

وہ پھر بہت پرنور آواز میں کہنے لگے "میرا رب فرماتا ہے:

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (سورہ الحجر ۹)

(بے شک ہم ہی نے اسے اتارا اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔)

◆◆◆

سنہری باتیں

☆۔ بلاشبہ بہترین انسان وہی ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے۔ (القرآن)

☆۔ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔ (الحدیث)

☆۔ انسان ضعیف ہے تعجب ہے کہ وہ کیونکر خدا کے قوانین کی نافرمانی کرتا ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

☆۔ دنیا کا ہر جاندار یا تشدد و ظالم ہے مگر انسان سے بڑا کوئی ظالم نہیں۔ (ابوالعلا معری)

☆۔ انسان ہو کر ایسے کام نہ کرو جن سے انسانیت کا دامن داغدار ہو جائے۔ (ثوبان ثوری)

☆۔ جب تک کام میں لکھنے والے کی روح شریک نہ ہو کلام سرد ہوگا اور دلوں میں گھر نہیں کر سکتا۔ (مولوی عبدالحق)

☆۔ لفظ میں ایک جادو ہوتا ہے جو بے محل استعمال پھیکا پڑ جاتا ہے۔ (مولوی عبدالحق)

☆۔ استاد کی عزت کرو کیونکہ یہ وہ ہستی ہے جو تمہیں اندھیرے سے نکال کر روشنی کی راہ دکھاتی ہے۔ (مولوی عبدالحق)

☆۔ سکندر سے کسی نے پوچھا کہ آپ استاد کی باپ سے زیادہ کیوں تعظیم کرتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: "اس لیے کہ باپ مجھے آسمان سے زمین پر لایا اور میرا استاد (ارسطو) مجھے زمین سے آسمان پر لے گیا۔

☆۔ غصے اور طیش میں آ کر بچوں کو کبھی سزا نہ دو کیونکہ کوئی حکیم غضب کی حالت میں مریض کا علاج نہیں کر سکتا۔

☆۔ چھوٹے بچے کے دل میں رعب اور خوف کا ڈالنا ایسا برا ہے جیسا کہ نرم و نازک پودے پر باد صرصر کا تند جھونکا یا پھولوں پر لو کا چلنا۔

(نورین سکندر، عارف والا)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

560 روپے کی غیر معمولی بچت پائیے ● اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی حاصل کیجیے

اردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے

معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے

دلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُرلطف بنائیے

قیمت فی پرچہ -/100 روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360 روپے	1560 روپے	1000 روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام ________ فون نمبر ________

پتا ________ ای میل ________

میں ماہ ________ 20 سے اردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی پی سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔

2۔ میں مطلوبہ رقم -/1000 روپے کا چیک / ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔

3۔ میں نے -/1000 روپے اردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر 110-800380 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ اور اپنا ایڈریس ای میل کر رہا ہوں۔

4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔

5۔ ہمیں 0301-8431886 پر اپنا ایس ایم ایس کریں، ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔

تاریخ ________ دستخط ________

اردو ڈائجسٹ، سرکولیشن منیجر، سمن آباد لاہور 54500۔ پاکستان فون نمبر: +92-42-35290738 +92-42-37589957

ای میل: subscription@urdu-digest.com ویب سائٹ urdudigest.pk فیکس: +92-42-35290731

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بڑی باقاعدگی سے مکتوب لندن سے لکھتے رہے اور ہم جیسے طالب علم ان کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھتے جن میں جدید معلومات بھی ہوتیں اور ایک صحافتی قرینہ بھی۔ پھر فروری ۱۹۶۲ء میں نوائے وقت کے مدیر جناب حمید نظامی ایوب خاں کی پیدا کردہ گھٹن میں جان کی بازی ہار گئے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے کمال جرأت اظہار عطا کی تھی۔ ایک محفل میں ان کی پاکستان کے بڑے وکیل اور مسلمانوں کی تحریک احیا کے بہت عظیم لیڈر شیخ عبدالقادر کے صاحبزادے جناب قادر منظور سے ملاقات ہوئی۔ ان کے جناب حمید نظامی سے بہت گہرے مراسم تھے مگر جب انھوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو حمید نظامی نے اسے یہ کہہ کر جھٹک دیا کہ تم نے ایوب خاں کی خواہش پر ایسا دستور تیار کیا ہے جو ہماری قوم کو ایک فوجی آمر کا غلام بنا دے گا۔ اس واقعے کے بعد انھیں دل کا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ انھوں نے نوائے وقت کی ظاہری آن بان پر توجہ دینے کے بجائے اس میں چھپنے والے مواد کو اصل اہمیت دی تھی۔ ان کے عہد ادارت میں کوئی تصویر چھپتی تھی نہ فلمی اشتہاروں کا صفحہ شائع ہوتا تھا۔ وہ اشتراکیت کے خلاف ایک شمشیر برہنہ تھے اور ذاتی چپقلش کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کے انتقال سے پہلے جناب شورش کاشمیری کے مشورے پر جناب مجید نظامی لندن سے لاہور آ گئے تھے۔ بڑے بھائی کی وفات کے بعد انھوں نے روزنامے کی ادارت سنبھالی اور باون برسوں کے دوران اسے ایک عظیم ایمپائر میں تبدیل کر دیا اور اپنے برادر محترم کی اعلیٰ روایات کو زندہ رکھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ وہ امور مملکت طے کرنے میں بھی ایک اہم کردار ادا کرتے رہے۔ حکمران ان کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے اور ان کی تنقید برداشت کرتے تھے۔ زندگی کے طویل تجربات نے ان کے مزاج میں ایک ٹھہراؤ اور بلا کا وقار پیدا کر دیا تھا۔ وہ علمی، فکری اور صحافتی مجالس اور اپنے کارکنوں کی غمی اور خوشی میں شریک ہوتے۔ وہ ایک شجر سایہ دار کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔

میری ان سے پہلی ملاقات میاں بشیر احمد کی اقامت گاہ پر ۱۹۶۲ء کے اوائل میں ہوئی۔ میاں بشیر احمد کی وہ نظم سالہا سال زبان زد عام رہی جس کا پہلا مصرع تھا "ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح۔" قائداعظم اور مادر ملت فاطمہ جناح لاہور میں انھی کے وسیع و عریض بنگلے میں ٹھہرتے تھے جو لارنس روڈ پر واقع تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں لاہور کے اصحاب فکر و نظر جمع ہوتے اور اٹھنے والے ملی اور قومی ایشوز پر گفتگو کرتے۔ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ جو اورینٹل کالج کے پرنسپل اور علمی اور فکری محفلوں کے روح رواں تھے انھوں نے انگریزی کی جگہ اردو کو رواج دینے کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ اس مہم کو آگے بڑھانے کے لیے غالباً مارچ ۱۹۶۲ء میں میاں بشیر احمد کے ہاں اجلاس ہوا۔ اس میں جناب مجید نظامی نے بھی شرکت کی۔ اس وقت اردو ڈائجسٹ کے اجرا کو دو سال ہو چکے تھے جس میں رومن رسم الخط کے خلاف مہم چل رہی تھی کیونکہ ایوب خاں اردو کے بجائے رومن رسم الخط رائج کرنا چاہتے تھے۔ اس مجلس میں جناب مجید نظامی سے تبادلہ خیال کا موقع ملا اور پھر یہ تعلق آنے والے زمانوں میں استوار ہوتا گیا۔

مجید نظامی بے پایاں انسانی خوبیوں اور انتظامی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بعض غیر معمولی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

صفات نے انھیں اپنے عہد کا کیتا صحافی بنا دیا تھا۔ حکمرانوں کے سامنے بے دھڑک بات کر دینا ان کا طرہ امتیاز تھا۔ وہ طاقت ور سے طاقت ور انسان کی غلط بات برداشت نہیں کرتے تھے اور سرعام ٹوک دیتے تھے۔ مجھے وہ پریس کانفرنس بھی یاد ہے جو وفاقی سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر نے اعلان تاشقند کے بعد لاہور میں کی تھی۔ الطاف گوہر بہت بڑے دانشور ہونے کے علاوہ ایوب خان کی نہایت مستحکم اور جابر حکومت کے نمائندہ تھے اور ان سے اختلاف کرنے کی بہت کم لوگ جرأت کر سکتے تھے۔ انھوں نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ معاہدہ تاشقند کی برکات بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ اس معاہدے سے پاکستان میں ترقی کی راہیں کشادہ ہوں گی۔ اس پر مجید نظامی اُن پر برس پڑے کہ آپ نے پاکستان کو روس اور بھارت کا غلام بنا دیا ہے اور ہماری فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا ہے اور آپ ہمیں لوریاں دینے آ گئے ہیں۔ ماحول پر یکلخت سناٹا چھا گیا اور الطاف گوہر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کے بعد ہم نے انھیں جنرل یحییٰ خان اور جنرل ضیاء الحق کے سامنے بے باکی کا مظاہرہ کرتے دیکھا۔ یہی رویہ ان کا جنرل مشرف کے ساتھ بھی تھا۔ حق کی بات وزرائے اعظم سے بھی کرتے اور فوجی آمروں سے بھی۔ بیوروکریٹس کو بھی وہ یہ احساس دلاتے رہتے کہ انھیں بڑے بڑے مناصب پاکستان کی بدولت ملے ہیں اس لیے ان پر ملکی مفاد کے تحفظ کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

صحافت میں اُن کا نام اس لیے زندہ رہے گا کہ وہ اس کے تقاضے کی ذمے داریاں بہت حسن و خوبی سے پوری کرتے رہے۔ وہ ایک مکمل ایڈیٹر تھے اور اپنے اخبارات و جرائد کی پالیسی پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ تمام چھوٹے بڑے اخبارات کا مطالعہ کرتے اور شائع شدہ مواد سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ وہ اداریے کے علاوہ اپنی مطبوعات میں شائع ہونے والے تمام کالم خود پڑھتے اور کہیں کہیں قلم بھی لگا دیتے جس سے تحریر میں ایک نئی شان پیدا ہو جاتی۔ انھوں نے خود بہت کم لکھا ہے مگر سیکڑوں نوجوانوں کو لکھنے کا فن سکھایا۔ اُن کے قلم کی کاٹ اور شگفتگی اپنی مثال آپ تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو ادارے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ بہت اچھے منیجنگ ایڈیٹر بھی تھے اور اخبارات کی ضرورتوں کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ عام طور پر ایڈیٹر حضرات انتظامی امور سے ناواقف ہوتے ہیں مگر مجید نظامی دونوں ہی شعبوں میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ ہم اس اعتبار سے بڑے خوش نصیب ہیں کہ ہمیں صحافت کے امام جناب مجید نظامی کے عہد میں رہنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ چند ایک بشری کمزوریوں کے سوا وہ شرافت اور استقامت کے کوہ گراں تھے۔ پاکستان اور جمہوریت کے ساتھ ان کی غیر متزلزل وابستگی نئی نسل کے لیے مینارہ نور ثابت ہوگی۔ بھارت کو وہ پاکستان کا ازلی دشمن سمجھتے اور کشمیر کے منصفانہ تصفیے کے بغیر اس کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم رکھنے کے خلاف تھے۔ انھیں کامل یقین تھا کہ علامہ اقبال اور قائداعظم جس اسلامی اور فلاحی پاکستان کی تشکیل چاہتے تھے اس کی تعمیر ہی سے اس خطے میں امن قائم ہوگا اور پوری انسانیت کو فلاح نصیب ہوگی۔

جناب مجید نظامی اس حوالے سے بھی یاد رکھے جائیں گے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کئی ادارے قائم

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیے اور اپنے اثر و رسوخ سے انھیں مستحکم ڈھانچا فراہم کیا۔ نظریہ پاکستان ورکرز ٹرسٹ ایک بہت بڑا ادارہ ہے جس کے زیر اہتمام لاہور میں ایوانِ قائداعظم بھی تعمیر ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے انھوں نے ایوانِ اقبال کے تصور کو حقیقت میں ڈھالنے کا فریضہ بھی انجام دیا تھا۔ ان کی زندگی میں پرائیس انسٹی ٹیوٹ بھی قائم ہوا اور وقت ٹی وی چینل بھی وجود میں آ چکا تھا۔ اب یہ ادارے اس وقت تک برگ و بار لاتے رہیں گے جب تک ان کے منتظمین ان کی روح کی نگہداشت کرتے اور نظریات کو اہمیت دیتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ مجید نظامی مرحوم پر اپنی رحمتوں کی بارش نازل فرماتا اور نئی نسل کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا رہے۔ آمین!

اسی رمضان المبارک میں ایک اور بڑی شخصیت ہمیں داغِ مفارقت دے گئی جس کا تعلق اسلام، صحافت اور نظریہ پاکستان کے ساتھ بہت گہرا تھا۔ سید فیاض الدین کا لیسٹر (انگلستان) میں انتقال ہوا۔ وہ اپنے رب کے حضور دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ لیے پہنچ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے اخلاص کی روشنی سدا جگمگاتی رہے! میری ان سے پہلی ملاقات ڈھاکے میں ہوئی تھی جب میں فاضل چیف جسٹس جناب محبوب مرشد کا انٹرویو لینے گیا تھا۔ وہ اور ہمارے محترم دوست خرم مراد انجینئرنگ کی ایک کنسلٹنٹ کمپنی میں کام کرتے تھے۔ ان دونوں دوستوں کا جماعت اسلامی سے تعلق تھا اور یہ بہار سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ میرا جب بھی مشرقی پاکستان جانا ہوتا تو ان کے ساتھ طویل نشستیں رہتیں اور زیادہ وقت اس غور و خوض میں گزرتا کہ دونوں بازوؤں کو ایک دوسرے کے قریب کیسے لایا جا سکتا ہے اور عوام کو بااختیار بنانے کے لیے کیا کیا سیاسی معاشی اور معاشرتی اقدامات ضروری ہیں۔ ان دنوں مشرقی پاکستان میں جو اخبارات بنگلہ اور انگریزی زبان میں شائع ہوتے تھے وہ عوام کے اندر مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پھیلا اور شعوری طور پر بنگلہ قومیت کو ہوا دے رہے تھے۔ ایوب خاں نے ملک پر فوجی طاقت سے جو دستور مسلط کیا تھا اس نے مشرقی پاکستان کو عملاً سیاسی اقتدار اور صوبائی خودمختاری سے محروم کر دیا تھا جس کے نتیجے میں ۱۹۶۹ تک شیخ مجیب الرحمٰن سب سے بڑا لیڈر بن چکا تھا اور بنگلہ دیشی قومیت کا سیلاب امڈا چلا آ رہا تھا۔ ایسی مشکل صورت حال میں جماعت اسلامی نے ڈھاکہ میں سنگرام کے نام سے روزنامہ نکالنے کا فیصلہ کیا جس کے منتظم ایڈیٹر سید فیاض الدین مقرر ہوئے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ کی شام اس کا افتتاح ہوا جس میں شرکت کے لیے مغربی پاکستان سے مجیب الرحمٰن شامی، جناب صلاح الدین، تصیر احمد سلیمی اور ایک درجن کے قریب صحافی ڈھاکہ آئے۔ سنگرام کا اجرا ایک اچھی خبر بھی تھی اور ایک بہت بڑا چیلنج بھی۔ ہم سب افتتاحی تقریب میں شامل ہوئے اور صحافت کا ایک صحت مند پودا لگنے پر گہری خوشی کا اظہار کیا تھا۔ دوسرے روز پلٹن میدان میں جماعت اسلامی نے پہلے انتخابی جلسے کا اعلان کر رکھا تھا جس سے خطاب کرنے کے لیے سید ابوالاعلیٰ مودودی ڈھاکہ پہنچ گئے تھے۔ جلسہ شروع ہونے سے پہلے ہی عوامی لیگ نے خیمے اکھاڑ دیے اور حاضرین کو لہولہان کر دیا۔ مولانا کو جن سیکڑوں جاں نثاروں نے اپنے حصار میں لے کر چھاؤنی کے اندر محفوظ مقام تک پہنچایا تھا ان میں جناب اے اکیس ہاشمی کے علاوہ سید فیاض الدین بھی شامل تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

۱۹۷۱ء کے آخری مہینوں میں جب مشرقی پاکستان کے حالات بہت بگڑ گئے تو فیاض صاحب کی کمپنی نے انھیں کراچی بلا لیا۔ انھوں نے ڈیڑھ دو سال کے لگ بھگ تنظیم کے ذریعے عوام تک حقائق پہنچانے کی مؤثر کوشش کی اور شدید مزاحمت کے باوجود صحافت کی اعلیٰ اقدار کی حفاظت کی۔ وہ کراچی آئے تو جماعت اسلامی کے زیرِ اہتمام روزنامہ جسارت میری ادارت میں نکل چکا تھا۔ میں عام انتخابات کے بعد اپنی مصروفیات کے سبب واپس لاہور آ گیا اور جناب صلاح الدین نے ادارت سنبھال لی اور سید فیاض الدین ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے منیجنگ ایڈیٹر بنا دیے گئے۔ مسٹر بھٹو برسرِ اقتدار آ چکے تھے جو اپنی ذات اور اپنے اسلوبِ حکومت پر تنقید برداشت نہیں کرتے تھے۔ تقریباً چار سال جسارت اور ان کے ایڈیٹر بندش اور قید و بند کی آزمائشوں سے گزرتے رہے۔ اس دورِ ابتلا میں فیاض صاحب نے ادارے کو منتشر ہونے نہیں دیا اور وہ ایک چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ ان کا ایثار ناقابلِ فراموش تھا۔

جنرل ضیاء الحق کا دورِ حکومت آیا تو ریاض سے وامی (World Asembly of Muslim Youth) کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر احمد توتنجی پاکستان آئے تو فیاض صاحب کی ذکاوت اور بصیرت سے متاثر ہو کر انھیں وامی میں بطور ڈپٹی سیکرٹری جنرل کے طور پر آنے کی پیشکش کی۔ وہ ریاض چلے گئے اور انھوں نے مختلف ممالک میں نوجوانوں کے کیمپ قائم کیے اور اہلِ صحافت کو ایک مرکز پر جمع کرنا شروع کر دیا۔ ان دنوں احیائے اسلام کی تحریکیں مختلف خطوں میں چل رہی تھیں اور نوجوانوں کے سینے آرزوؤں سے معمور تھے۔ فیاض صاحب بڑی حکمت کے ساتھ ان آرزوؤں اور امنگوں میں ایک نظم پیدا کرتے اور انھیں صحیح رخ دیتے رہتے۔ پھر ایک ایسا وقت آیا جب سعودی عرب نے غالباً امریکی دباؤ کے تحت ان سرگرمیوں سے ہاتھ کھینچ لیا اور رابطہ عالم اسلامی کی طرح وامی بھی غیر فعال ہو گئی۔ ایسے میں پروفیسر خورشید احمد فیاض صاحب کو اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر لے آئے۔ وہاں انھوں نے محنت شاقہ سے فاؤنڈیشن کو وسعت دی اور اسے اسلامی دعوت کا ایک بلند پایہ مرکز بنا دیا۔ ان سے پہلے جناب خرم مراد علمی تحقیق و تربیت کے نئے منصوبے شروع کر چکے تھے اور جدید خطوط پر مختلف زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی تیاری کا معرکہ سر کر رہے تھے۔

اپنی زندگی کے آخری برسوں میں سید فیاض صاحب نے مذاہب کے ساتھ مکالمے اور مفاہمت کے میدان میں زبردست کام کیا۔ مکالمے کی ابتدا جناب پروفیسر خورشید احمد نے بیس پچیس سال پہلے کی تھی جس کے اچھے اثرات برآمد ہو رہے تھے۔ انگلستان میں رہتے ہوئے فیاض صاحب نے گہری نظر سے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس محاورے اور اسلوب کا سراغ لگایا جس کے ذریعے اہلِ کتاب تک اسلام کی دعوت جذب و تاثیر کے ساتھ پہنچائی جا سکتی ہے۔ مکالمے کو کلچر فروغ پانے سے چرچ میں دینی اسکالر مدعو کیے جاتے اور مساجد میں غیر مسلموں کو دعوت دی جاتی اور مشترک نکات دریافت کیے جانے لگے۔ اس طرح ایک ذہنی انقلاب آگے بڑھنے لگا اور انگلستان اور یورپ میں اسلام قبول کرنے کی شرح میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ باشعور طبقے اس حقیقت کا پورا ادراک کرنے لگے ہیں کہ اسلام جنگ و جدل کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بجائے مضبوط دلائل اور بہتر افکار کے ذریعے دلوں اور ذہنوں میں گھر بناتا اور زندگی کا رخ بدل دیتا ہے۔

سید فیاض الدین کئی برسوں سے سرطان کے مرض میں مبتلا چلے آ رہے تھے۔ پہلے ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا جو زندگی کے سفر میں ان کی بلند ہمت رفیقہ تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد وہ مرجھا سے گئے تھے مگر وہ حیات مستعار کے آخری لمحے تک برسرِکار رہے۔ وہ اکثر بستر سے فون پر پاکستان کے احوال پوچھتے اور ٹھہرے لہجے میں گفتگو کرتے۔ انھوں نے معاشرتی خرابیوں پر نہایت اثر انگیز کالم لکھے جو کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان آتے تو ملنے کے لیے بے چین رہتے۔ اب وہ خاموشی سے ہمیشہ میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ کس قدر عظیم شخصیت کے مالک تھے اس کے ذکر سے وہ ہمیشہ گریز کرتے اور ایک ہی دعا مانگتے کہ اللہ تعالیٰ میری کوتاہیوں سے صرفِ نظر فرماتا رہے! ان کے بھائی اور ایک بیٹی پاکستان میں رہتے ہیں جو عظیم وراثت کے امین ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ہمیں اپنے خاموش محسنوں کی روایات زندہ رکھنے کی توفیق سے نوازے! کیسے کیسے خورشید ماہتاب غروب ہوتے ہیں اور خدا کی رحمت سے میں پرامید ہوں کہ پہلے سے بھی زیادہ تابدار خورشید و ماہتاب طلوع ہوتے رہیں گے۔

◆◆◆

تجربات اور انسان

☆ دنیا میں سب سے پہلے انسان کے آگے تاریخ یعنی دنیا کے گزرے ہوئے واقعات آتے ہیں اور انھی سے وہ تجربے کی دانائی اور بصیرت حاصل کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ہمیشہ ایک ہی طرح کے واقعات ظاہر ہوئے اور ایک ہی طرح کے نتیجے نکلے۔ پس تجربہ بتاتا ہے کہ اب بھی ہمیشہ جب کبھی ویسی حالتیں پیدا ہو جائیں گی تو ویسے ہی نتائج نکلیں گے۔ اگر آگ کے شعلوں نے ہمیشہ انسان کے جسم کو دکھ دیا ہے تو ایسا کبھی نہ ہوگا کہ آگ کے شعلوں میں کود کر کوئی ٹھنڈک پائے۔

☆ تجربہ وہ خوب صورت نام ہے جو لوگ اپنی غلطیوں، بے وقوفیوں اور دھوکوں کو دیتے ہیں۔

☆ تجربہ ایک اچھا استاد ہے لیکن اس کی فیس بہت زیادہ ہے لہٰذا دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھاؤ۔ (بنجمن فرینکلن)

☆ ہم کرتے ہیں غلطیاں اور ان کا نام رکھتے ہیں تجربہ۔ (آسکر وائلڈ)

☆ تجربہ وقت اور عمر گنوانے کے بعد حاصل ہوتا ہے، مفت نہیں ملتا۔

☆ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا تو بڑی بات ہے، آدمی کے لیے یہ بات ہی قابلِ داد ہے کہ وہ اپنے تجربات سے فائدہ اٹھالے۔

☆ علم و آگہی کا واحد ذریعہ تجربہ ہے۔ (راجر بیکن)

☆ تجربہ دانائی کی ماں ہے۔

☆ تجربہ انسان کا بہترین معلم ہے اور زندگی کی ٹھوکریں اس کا ذریعۂ تعلیم۔

(مراسلہ: بشیر خان، پشاور)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سابق ڈائریکٹر جنرل ایم آئی، آئی ایس آئی اور چیئرمین جائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی

جنرل (ر) احسان الحق

سے خصوصی ملاقات

☆ پرویز مشرف سے اختلاف کیا تھا کہ مسئلہ کشمیر کا آؤٹ آف دی باکس حل تلاش نہیں کیا جا سکتا

☆ عالمی دہشت گردی کے تناظر میں ہمارے اور امریکی موقف میں بہت اختلاف ہے

☆ پاکستان میں اس پورے خطے کی قیادت کرنے کا زبردست پوٹینشل پایا جاتا ہے

☆ میں کیانی کو شمالی وزیرستان میں آپریشن کرنے کا مشورہ دیتا رہا

☆ بھارت دنیا کا واحد ملک ہے جو ہم پر حملہ آور ہو سکتا ہے

انٹرویو: الطاف حسن قریشی، عکاسی: محمد عرشیان

جنرل (ر) احسان الحق — الطاف حسن قریشی — طیب اعجاز قریشی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

غالباً ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کی بات ہے کہ مجھے نصف شب کے قریب ایک دوست کا فون آیا جو پنجاب کی انٹیلی جنس برانچ میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ پیر و مرشد کے ہاں کل صبح سویرے آ جائیے۔ ہم ایک مشترک دوست کو پیر و مرشد کے نام سے پکارتے اور اکٹھے ہوتے ملکی مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ میں انھیں فون کر کے صبح آٹھ بجے پہنچ گیا۔ دس منٹ بعد راشد صاحب آ گئے جو ان کا کوڈ نام تھا۔ انھوں نے بتایا کہ آپ کے فون دو روز سے ٹیپ ہو رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اوپر سے کوئی سخت پیغام آیا ہے۔

میں ان سے مل کر ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی "کیا اردو ڈائجسٹ کے ایڈیٹر الطاف حسن قریشی بات کر رہے ہیں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو مجھے بتایا گیا کہ ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس میجر جنرل احسان آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی اور خطرے کا احساس بھی۔ جنرل صاحب نے مجھ سے معلوم کرنے کے بعد بڑے شائستہ لہجے میں پوچھا "کیا آپ کل گیارہ بجے مجھ سے ملاقات کرنے آ سکتے ہیں؟" میں نے ہامی بھر لی اور ہوائی جہاز میں نشست ریزرو کرانے کے لیے اپنے ایک دوست سے کہہ دیا۔

ڈی جی ایم آئی کے لب و لہجے میں اپنائیت محسوس ہوئی۔ جب تین ماہ کے واقعات میرے حافظے کی سکرین پر ابھرنے لگے۔ میں نے اردو ڈائجسٹ کے شمارہ اگست ۱۹۹۹ء میں کارگل معرکے کا پوسٹ مارٹم کیا تھا اور وہ تمام واقعات قلمبند کر دیے تھے جو امریکی جنرل زینی نے اپنی کتاب میں ایک سال بعد تحریر کیے۔ میں نے اپنے خود

بڑے کمانڈروں سے لے کر لانس نائیک کے سپاہیوں سے ملاقاتیں کی تھیں۔ غیر ملکی اخبارات و جرائد کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ فوج کے چار جرنیلوں نے یہ منصوبہ تیار کیا تھا۔ ائیر فورس اور نیوی کے سربراہوں اور بیشتر کور کمانڈروں سے مخفی رکھا گیا تھا۔ سیاسی قیادت پر اس مہم سے پیدا ہونے والے اثرات پوری طرح واضح نہیں کیے گئے تھے۔

اس رپورٹ کی اشاعت سے مختلف حلقوں اور اداروں میں کھلبلی مچ گئی اور اخبارات میں اس نوعیت کی خبریں شائع ہوئیں کہ الطاف حسن قریشی نے یہ کام انٹیلی جنس بیورو سے کروڑوں روپے وصول کرنے کے بعد انجام دیا ہے۔ ان دنوں مشاہد حسین سید وفاقی وزیر اطلاعات تھے۔ وہ بتاتے رہے کہ تم پر حساس ادارے کی طرف سے اردو ڈائجسٹ کے خلاف ایکشن لینے پر سخت دباؤ ڈالا جا رہا ہے اور آپ کو بہت محتاط رہنے کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ضرورت ہے۔

میں 17 اکتوبر کی صبح گیارہ بجے میجر جنرل احسان صاحب سے ملنے پہنچ گیا اور اپنے اس ہنگامی سفر کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے بصد احترام خوش آمدید کہا اور اردلی کو قہوہ لانے کا آرڈر دیا۔ وہ بتاتے رہے کہ میں طالب علمی کے زمانے سے اردو ڈائجسٹ پڑھتا آیا ہوں اور ہفت روزہ زندگی بھی میرے زیرِ مطالعہ رہا ہے۔ آپ لوگوں نے پاکستانی صحافت کو پروان چڑھانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ماحول خوشگوار بنانے کے بعد انھوں نے گفتگو کا ذکر چھیڑا اور یہ اشارہ دیا کہ چیف صاحب سخت برہم ہیں اور انھوں نے احکام بھی جاری کر دیے ہیں جن کی مجھے بھنک پڑی ہے اور میں انھیں ایک غلط اقدام سے روکنے کی پوری کوشش کروں گا۔

بعد ازاں معلوم ہوا کہ اردو ڈائجسٹ بند کر دینے مجھے گرفتار کرنے اور عبرت کا نشان بنانے کے احکام جاری ہو چکے تھے جن پر عمل درآمد رکوانے میں ڈی جی ایم آئی اور کور کمانڈر لاہور نے موثر کردار ادا کیا تھا۔ وہ آرمی چیف کو یہ احساس دلانے میں کامیاب رہے تھے کہ صحافت پر یہ تازیانہ حکومت کو بہت مہنگا پڑ سکتا ہے۔ ان دونوں اصحاب نے اپنی فراست سے ہمارے ادارے کو ایک بہت بڑی آزمائش سے بچا لیا۔

اس وقت لاہور کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل خالد مقبول تھے۔ ان کے ساتھ میری تفصیلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ بریگیڈ ٹرپل ون کے سربراہ تھے۔ ان دنوں اوجڑی کیمپ کا حادثہ پیش آیا تھا جسے کنٹرول کرنے میں بریگیڈیئر خالد مقبول نے زبردست کردار ادا کیا تھا۔ میں نے اپنی تفتیشی رپورٹ میں ان کے مشاہدے اور تجربے کو مرکزی اہمیت دی تھی۔ اس کے بعد ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ دس بارہ سال گزر گئے تو اچانک ان سے ملاقات ہوئی۔

وہ تاریخی اہمیت کی ایک عجیب رات تھی جب بھارتی وزیراعظم واجپائی "دوستی بس" کے ذریعے لاہور آئے اور ان کے اعزاز میں شاہی قلعے میں وزیراعظم پاکستان نواز شریف نے عشائیے کا اہتمام کیا تھا۔ واجپائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فوج کو سڑکوں اور سرکاری اداروں میں نہیں آنا چاہیے ..... سرحدوں کی حفاظت اس کی اصل ذمے داری ہے

ان سے ایک خصوصی انٹرویو لیا جائے۔ رابطہ کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ ۱۷/اگست کی شام پاکستان سے باہر جا رہے ہیں۔ چنانچہ ہماری ٹیم نے ۱۶/اگست کی شام اسلام آباد پہنچنے کا پروگرام بنایا۔ اس ٹیم میں میرے علاوہ اردو ڈائجسٹ کے انتظامی ایڈیٹر عزیزم طیب اعجاز اور ان کے صاحبزادے عرشیان شامل تھے۔ عرشیان کو فوٹوگرافی کا بہت شوق ہے۔ بعد میں میرا پوتا عزیزی ایقان قریشی بھی شریکِ سفر بنا لیا گیا جسے کتابیں پڑھنے اور بڑی شخصیتوں سے ملنے کا بڑا اشتیاق رہتا ہے۔ اسلام آباد میں کھدائی کے باعث ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے زیادہ لگے۔

ہم ٹھیک دن کے بارہ بجے فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ جنرل صاحب ہنوز کسی مہمان کے ساتھ محوِ گفتگو تھے۔ ہمیں اسٹڈی روم میں بیٹھنے کی جگہ ملی جو کتابوں اور تلواروں سے آراستہ تھا جو انھیں بہادری کے کارنامے انجام دینے پر دی گئی تھیں۔ ایقان کتابوں کی طرف لپکا اور ان میں کھو گیا۔ عرشیان جنرل صاحب کی حاصل شدہ تلواروں کی تصویریں بناتا رہا اور میں کھڑکی سے اس چمنستان کی آرائش، رنگینی اور حسن کاری میں ڈوب گیا جو زمین پر جنت کا قطعہ معلوم ہوتا تھا۔ اس فارم ہاؤس میں داخل ہوتے ہی ہمارے مشامِ جاں عطر بیز ہونے لگے اور خیال کی رعنائی نے ایک انگڑائی لی تھی۔

دس بارہ منٹ بعد جنرل صاحب آ گئے۔ نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے۔ ان کا چہرہ اسی طرح شگفتہ تھا جو میں نے ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۹ء کی صبح کو دیکھا تھا۔ ان کا جسم بھی پہلے کی طرح دبلا پتلا اور لچکدار تھا۔ مجھے ان کی صحت پر بہت رشک آیا اور اس خیال کو تقویت پہنچی کہ صحت مند جسم کے اندر ہی ایک صحت مند اور تخلیقی دماغ کام کرتا ہے۔ ہم انٹرویو کے لیے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے اور سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے بنیادی نکات اٹھائے۔ عزیزی طیب اعجاز نے بھی تیکھے اور ہلکے پھلکے سوالات پوچھے اور ہمارے ایڈیٹوریل اسٹاف سے وابستہ غلام سجاد نے دفاعِ وطن کے حوالے سے ذہنوں میں پیدا شدہ خطرات کی نشان دہی کی۔ وہ بڑے ٹھہراؤ اور سلیس زبان میں جواب دیتے رہے۔ ان کے انٹرویو میں بڑے انکشافات بھی تھے اور پسِ دیوار کی روداد بھی۔ ان کے لہجے میں وہ شیرینی اور شادابی نمایاں تھی جو خطۂ خیبر پختونخوا کے لیے خاص ہے۔ سوال و جواب کا خزینہ قارئین کے حوالے ہے جن میں اربابِ اختیار بھی شامل ہیں جو ان دنوں کڑی آزمائش سے دوچار ہیں۔

س: فوج میں آنے کا شوق کیسے پیدا ہوا اور کیا آپ کے علاقے کے زیادہ لوگ فوج ہی میں جانا پسند کرتے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں فوج میں جانے کی روایت بھی ہے لیکن خاص طور پر ہمارے خاندان میں فوج میں جانے کا رجحان زیادہ ہے۔ میرے پردادا جن کا نام عبدالستار خان تھا، وہ ۱۹۰۷ء میں فوج سے بطور صوبیدار

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میجر ریٹائر ہوئے تھے جبکہ ٹھیک سو سال بعد ۲۰۰۷ء میں جنرل کی حیثیت سے میں سبکدوش ہوا۔ میرے پردادا برٹش انڈین آرمی میں تھے۔ انھوں نے افغانستان، مشرقِ وسطیٰ اور معلوم نہیں کہاں کہاں فوجی خدمات انجام دیں اور آخرکار وہ ملایا کے محاذ پر ریٹائر ہوئے۔

میرے والد صاحب کی صحت بچپن ہی سے اچھی نہیں تھی۔ میں جب کیپٹن تھا تو وہ ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ہم چار بہن بھائی ہیں: تین بھائی اور ایک بہن۔ ابھی ہم ٹھیک طور پر بولنا بھی نہیں سیکھے تھے کہ ہمارے والد نے ہمارے ذہنوں میں فوج کے حوالے سے باتیں ڈالنا شروع کر دی تھیں۔ انھوں نے اپنے ذہن میں طے کر رکھا تھا کہ بڑا بھائی آرمی میں، میں ایئرفورس میں اور چھوٹا بھائی بحری فوج میں جائے گا۔ ہم تینوں بھائی اسی سوچ کے ساتھ پروان چڑھے کہ ہم نے فوج میں جانا ہے۔ گھر میں باقاعدہ ہم بھائیوں کی اس بات پر لڑائی ہوتی کہ آرمی بہتر ہے یا ایئرفورس یا پھر نیوی۔ اسی حساب سے میرے بڑے بھائی کیڈٹ کالج حسن ابدال چلے گئے اور میں پی اے ایف پبلک اسکول سرگودھا میں داخل ہو گیا۔ چھوٹے بھائی کے متعلق والد کہتے تھے کہ یہ پٹارو جائے گا اور وہاں سے نیوی میں چلا جائے گا۔ یہ ۱۹۶۳ء یا ۱۹۶۴ء کی بات ہے جب میرے بڑے بھائی نے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ بہت سے لوگوں نے میرے والد کو مشورہ دیا کہ آپ کے بیٹے نے مکینیکل انجینئرنگ کی ہے تو اسے جرمنی یا کسی اور ملک بھیج دیں۔ جہاں یہ نئی سے نئی ٹیکنالوجی سیکھے گا، لیکن والد اپنی ضد پر قائم رہے کہ یہ آرمی ہی میں جائے گا۔

میں پی اے ایف پبلک اسکول سرگودھا میں تعلیم حاصل کرتا رہا اور جب فلائنگ کا مرحلہ آیا تو مجھے گھبراہٹ اور قے آنے لگی۔ میری رپورٹ میں "غیر حوصلہ افزا کارکردگی" لکھا آیا۔ تب انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو گراؤنڈ برانچ میں لے جاتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں، میں اگر ماہر ہوا باز نہیں بنوں گا تو ایئرفورس میں رہنا میرے لیے ناقابلِ قبول ہو گا۔ میں پھر سیدھا رسالپور سے کاکول پہنچ گیا۔ اس وقت کے پورے بیچ میں میں واحد شخص ہوں جو فور اسٹار جنرل بنا۔ اب وہ ایئرفورس والے روتے ہیں کہ ہم نے کیا کیا کیونکہ آخر میں میں ایئرفورس کا باس بھی بن گیا تھا۔

جب چھوٹے بھائی کو کیڈٹ کالج پٹارو بھیجنے کا وقت آیا تو اس وقت کیڈٹ کالج کوہاٹ بھی بن چکا تھا جو ہمارے گھر کے زیادہ قریب تھا۔ ہم نے والد صاحب کو قائل کرنا شروع کر دیا کہ چھوٹے بھائی کو گھر پر ہی رہنے دیں۔ یہاں امی، چھوٹی بہن اور آپ کے سوا کوئی نہیں لہٰذا اسے تو گھر پر ہونا چاہیے۔ بڑی مشکل سے ہم نے انھیں راضی کر لیا کہ کیڈٹ کالج پٹارو اور کوہاٹ میں کوئی فرق نہیں۔ پہلے ادھر جانے دیں بعد میں فیصلہ کریں گے کہ نیوی میں جانا ہے یا نہیں۔

دو تین سال بعد جب یہ فیصلہ کرنے کا وقت آیا کہ وہ انجینئرنگ کرے یا میڈیکل تو ہماری امی جذباتی ہو گئیں اور کہا کہ ضروری نہیں کہ یہ آرمی میں جائے یا نیوی میں، اس سے پوچھیں کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا: اسے ضرور ڈاکٹر بننا چاہیے، ہم سے ایک مرد تو گھر پر ہو۔ والد صاحب نے کہا: آپ لوگ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میرا جو وژن تھا کہ تینوں بیٹے آرمی، ایئرفورس اور نیوی میں ہوں وہ پورا ہونے سے رہ جائے گا۔

خیر ہم نے چھوٹے بھائی کا نام میڈیکل میں لکھوا دیا۔ دو تین ماہ بعد پرنسپل کا فون آیا کہ یہ لڑکا ایڈجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہمیں بھارت پہ یہ فوقیت حاصل ہے کہ ہم اس پر حملہ کرنے کی نیت نہیں رکھتے

نہیں ہو پا رہا۔ یہ کہتا ہے کہ مجھے آرمی یا نیوی میں جانا ہے اور ڈاکٹر نہیں بننا۔ ہم نے بھائی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ اس کا میڈیکل کرنا بہت ضروری ہے اور وہ ڈاکٹر بن کر بھی فوج میں شامل ہو سکتا ہے۔ تب کہیں جا کر وہ راضی ہوا لیکن ابھی وہ میڈیکل کر ہی رہا تھا کہ والد صاحب وفات پا گئے جس کے بعد چھوٹے بھائی کو امی اور بہن کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ بعدازاں جب آرمی میں میڈیکل کی نشستیں لازمی ہو گئیں تو چھوٹے بھائی نے بھی آرمی میں شمولیت اختیار کر لی۔ یہ وجوہ تھیں جن کی بنا پر میں آرمی میں آیا۔

میں یہاں ایک بات کا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ میں جب جائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کا چیئرمین بنا تو اللہ کے نظام کے متعلق سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا کیونکہ جب میں نے اپنے پہلے گارڈ آف آنر کا معائنہ کیا تو وہاں تینوں فورسز آرمی ایئرفورس اور نیوی موجود تھیں۔ میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ آواز ضرور سن لی جو ہمارے والد صاحب نے کہا تھا کہ میرے بیٹے تینوں فورسز میں ہوں۔

س: جنرل صاحب! یہ بتائیے کہ شروع سے ہمارے دفاع کے جو مسائل چلے آ رہے ہیں آج ان میں کیا کوئی فرق آیا ہے؟

ج: کچھ مسائل تو مستقل ہیں جیسے کہ جغرافیائی محل وقوع اور اس کا پولیٹیکل فال آؤٹ۔ اسی طرح کچھ تاریخی مسائل ہیں مثلاً بھارت کے ساتھ ہمارے کشیدہ تعلقات جو ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔ کچھ غیر حل شدہ تنازعات ہیں مثال کے طور پر کشمیر کا مسئلہ اور ہماری مشرقی سرحد۔ یہ سارے معاملات مستقل نوعیت کے ہیں۔ مغربی سرحد کو افغانوں نے شروع ہی سے قبول نہیں کیا اور وہ چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ ایسا وہ ۱۹۴۷ء سے کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں افغانستان نے "لویہ جرگہ" بلا کے یہ اعلان کیا تھا کہ ہمارے برطانوی حکومت کے ساتھ جتنے معاہدے تھے وہ منسوخ کرتے ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ جغرافیائی اور تاریخی مسائل تو مستقل ہیں لیکن کچھ معاملات وقت کے ساتھ ساتھ پیدا شروع ہو جاتے ہیں مثال کے طور پر ہماری غیر مستحکم سیاسی صورت حال جو ۱۹۷۰ء اور ۱۹۹۰ء میں پیدا ہوئی تھی۔ ہمارے اندرونی معاملات و حالات کے ساتھ ساتھ بیرونی ماحول کے اثرات بھی ہم پر اثر انداز ہوتے رہے۔ کچھ مسائل تو وراثتی تھے اور کچھ حالات و واقعات کی کروٹوں سے پیدا ہو کر سامنے آتے گئے جن کی وجہ سے ہمارے "خطرات کے تصورات" (Threat Perceptions) میں بھی تبدیلیاں آتی رہیں۔ لہٰذا بنیادی طور پر یہ مسائل متحرک ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

شروع میں ہماری سب سے زیادہ توجہ انڈیا کی طرف تھی کیونکہ یہ واحد ملک ہے جس سے ہماری سلامتی اور بقا کو حقیقی خطرہ لاحق ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ عظیم الشان سیاسی جدوجہد اور بے مثال قربانیوں کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کی اکثریت سے آزادی حاصل کی تھی مگر بدقسمتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

قیادت کا خیال تھا کہ یہ تو ایک عارضی تقسیم ہے جو بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ دراصل وہ پاکستان کی آزادی اور خودمختاری کو ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ پھر انڈیا کے ہمارے ساتھ جو مشترکہ مسائل تھے ان کو بھی حل کرنے کے لیے ہندو لیڈر تیار نہیں ہوئے۔ ۱۹۷۱ء تک تقریباً ایسی ہی فضا قائم رہی کہ انڈیا اور افغانستان چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے۔ جب ۱۹۵۶ء کا آئین منظور ہوا اور ون یونٹ بنانے کا اعلان کیا گیا تو اس وقت کابل میں ہمارے سفارت خانے پر حملہ ہوا۔ انھوں نے اس حملے کا یہ جواز پیش کیا کہ ہمارے پختونستان کو آپ لوگوں نے پاکستان میں شامل کر لیا ہے جسے وہ صوبہ پختونستان کہتے تھے۔

جب ہم نے سیٹو میں شمولیت اختیار کی تو افغانستان نے بڑے غصے کا اظہار کیا۔ پاکستان کے خلاف ووٹ دیا اور پھر سوویت یونین کے ساتھ ایک خصوصی معاہدہ بھی کر لیا۔ وہ ہمارے علاقے باجوڑ اور وزیرستان میں اکثر مداخلت کرتے رہتے البتہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں انھوں نے ہمارا اس حد تک ساتھ دیا کہ اپنی طرف سے ہمارے خلاف محاذ نہیں کھولا اس لیے ہم ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۱۹۷۱ء میں ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی جس کی دو تین وجوہ تھیں۔ مشرقی پاکستان کے الگ ہونے سے ہماری قوم کو ایک بہت بڑا دھچکا لگا۔ یہ ایک جاں ستانی تجربہ تھا جس نے ہمارے قومی وجود کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا۔ آج بلوچستان میں پتا بھی ہلتا ہے تو ہم تڑپ اٹھتے اور کہتے ہیں کہ یہ بھی شاید مشرقی پاکستان کی طرح ہم سے الگ ہو جائے گا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جیسے بنگلہ دیش بنا ہے تو یہاں بھی سندھو دیش بن جائے گا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نفسیاتی طور پر خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔ پاکستان تقسیم ہوا اور جدید تاریخ میں آج تک کوئی بھی ملک اس طرح تقسیم نہیں ہوا اس لیے ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔

ادھر مشرقی پاکستان کا سانحہ ہوا اور اُدھر انڈیا نے ایٹمی دھماکا کر دیا۔ اس سے ہمارے عدم تحفظ کے احساس میں مزید اضافہ ہوا۔ ساتھ ہی انڈیا افغانستان اور سوویت یونین نے مل کر بلوچستان میں انتشار پھیلانا شروع کر دیا۔ امریکا انڈیا کو مغرب میں ہمارے خلاف لیڈ کر رہے تھے۔ دوسرا ہمارے اوپر دباؤ پڑنا شروع ہو گیا کہ آپ ایٹمی دھماکا نہیں کریں گے۔ بڑی پابندیاں اور سختیاں شروع ہو گئیں۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں ایران میں انقلاب آیا اور پھر ایران عراق جنگ شروع ہو گئی۔ اس کے اثرات ہم پر بھی مرتب ہوئے اسی باعث پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی شیعہ سنی فسادات نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور شدید تناؤ کا ماحول پیدا ہوتا گیا۔

۱۹۷۹ء سے پہلے بھی افغانستان کے حالات میں کسی حد تک کشیدگی پائی جاتی تھی کہ وہاں سردار داؤد نے فوجی بغاوت کر کے ظاہر شاہ کو ملک بدر کیا تھا اور خود صدر بن بیٹھا تھا۔ اس نے دوبارہ پختونستان کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ ساتھ ہی افغانستان میں دائیں بازو اور بائیں بازو کے ونگ بنانے کی کوششیں شروع ہو گئیں جس کے نتیجے میں ان کی ملٹری بھی تقسیم ہو گئی۔ کچھ آفیسر دائیں ونگ میں شامل ہو گئے اور کچھ بائیں ونگ میں۔ اس طرح مسائل بڑھتے گئے۔ انڈیا کی طرف سے بھی ہماری قومی سلامتی کے لیے خطرات بڑھتے گئے۔ ہمارے داخلی عدم تحفظ میں اضافہ ہوا اور ساتھ ہی مغربی محاذ بھی ہمارے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاکستان کا ایٹمی پروگرام بھارت کی نسبت زیادہ جدید و موثر اور ترقی یافتہ ہے

خلاف لکھتا چلا گیا۔

۱۹۸۰ء میں افغانستان کے اندر جہاد کا سلسلہ چل نکلا اور ہماری مغربی سرحدیں کمزور ہونا شروع ہو گئیں۔ ۱۹۸۹ء میں روس افغانستان سے نکل جانے پر مجبور ہوا اور ملک کو تباہ حال چھوڑ کر چلا گیا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں افغانستان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور اس کا ملبہ پاکستان کے اوپر گرتا رہا۔ طالبان جو کہ ان کے اندرونی حالات سے پیدا ہوئے تھے، وہ ہمارے کھاتے میں ڈال دیے اور سارے الزامات ہمارے سر تھوپ دیے گئے کیونکہ ہم افغانستان کے ہمسایہ تھے۔ ہماری افغانستان کے ساتھ ۲۵۰۰ کلومیٹر طویل سرحد ہے۔ یہ دوسری بڑی تبدیلی تھی جس کے اثرات سے گزرتے ہوئے ہم نائن الیون تک آ گئے۔ نائن الیون کے بعد امریکی پھر واپس افغانستان میں آ گئے اور افغانستان میں جو کچھ ہوتا رہا، اس کا ذمے دار ہمیں ٹھہرایا گیا۔ پاکستان کو ایک بار پھر بہت بڑا چیلنج درپیش تھا کہ ہمیں بین الاقوامی کمیونٹی کے ساتھ کھڑا رہنا ہے یا نہیں؟ اس ایک بنیادی پالیسی کے نتیجے میں کئی اور مسائل پیدا ہوتے رہے۔

س: اس مرحلے پر پرویز مشرف نے جو کچھ کیا آپ کے خیال میں کیا وہ ایک دانش مندانہ فیصلہ تھا؟

ج: قریشی صاحب! یہ باتیں ہوتی رہی ہیں سیاسی ہیں۔ جب نائن الیون کا واقعہ ہوا اس وقت میں پشاور کا کور کمانڈر تھا۔ جناب عبدالستار وزیر خارجہ تھے۔ انھوں نے انھی دنوں ایک کالم لکھا تھا جسے انھوں نے بعد میں اپنی کتاب میں بھی شامل کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب نائن الیون کا واقعہ ہوا اور اس کی تصاویر ٹی وی پر آئیں تو مشرف صاحب نے ہم سب کو بلایا۔ ان میں ان کے سینئر ترین فوجی افسر بھی شامل تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سوچنا شروع کیا کہ ہمارے پاس کیا کیا آپشن ہیں اور ہماری پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ اس وقت پارلیمنٹ موجود نہیں تھی۔ پورا دن اس معاملے پر سوچ بچار ہوتا رہا۔ جنرل کولن پاول نے جو پیغام دیا وہ ایک یا دو دن کے بعد آیا تھا۔ اس وقت تک ایک پالیسی طے کی جا چکی تھی کہ ہم اس وقت عالمی برادری سے علیحدہ نہیں رہ سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو حکومت بھی ہوتی بنیادی فیصلہ یہی ہوتا تھا۔

میں آپ کو اس واقعے سے متعلق ایک دلچسپ بات بتاتا ہوں۔ ہم نے نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی میں ایک سکیورٹی ورکشاپ کا اہتمام کیا جس میں تمام سیاسی جماعتوں کے راہنما بھی مدعو کیے گئے۔ ہم وہاں ایک وار گیم چلاتے تھے اور اس گیم میں ہم نے ان کے سامنے بالکل نائن الیون والی صورت حال رکھی۔ ایک پارٹی کے راہنما کو ہم نے صدر بنا دیا، ایک کو وزیراعظم اور ایک کو وزیر خارجہ اور کہا کہ یہ مسئلہ ہے اس پر آپ کا کیا فیصلہ ہے۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ انھوں نے بالکل وہی فیصلہ کیا جو اس وقت کی حکومت نے کیا تھا۔

میں اس صورت حال پر نادم ہنستا رہا۔ میں نے ایک بہت سینئر لیڈر سے کہا کہ آپ تو خواہ مخواہ مشرف کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، آپ لوگوں نے بھی بالکل وہی فیصلہ کر دیا۔ وہ ہنسے اور کہنے لگے کہ آپ نے ہمیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

وزیراعظم جو بنا دیا تھا۔ حکومت کی تو ہمیشہ ایک سوچ ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمیں حکومت سے نکال کر اپوزیشن میں لے آئیں گے تو ہماری سوچ بھی بدل جائے گی۔

اصل سوچنے کی بات یہ ہے کہ آپ کے پاس اس وقت آپشنز کیا تھے؟ چین اور ایران بھی امریکہ کی حمایت کر رہے تھے۔ برطانیہ اور فرانس نے نیٹو اے کا جھنڈا اٹھا لیا تھا کہ یہ حملہ امریکہ پر نہیں بلکہ ہمارے اوپر ہوا ہے۔ حد یہ کہ روس نے بھی امریکہ کے حق میں ووٹ دے دیا تھا۔ ایسے میں ہم کیا کرتے؟ کیا یہ کہتے کہ ہمیں سوچنے کا وقت دیں پھر بتائیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ اگلے دن ۱۲ ستمبر کو یواین او کی سیکیورٹی کونسل کا نوٹس آ گیا جس میں واضح طور پر یہ پیغام دیا گیا تھا کہ ہر ملک امریکہ کا ساتھ دے گا اور مزید منظر پر حملہ کرنے والوں کو پکڑنے میں اس کی مدد کرے گا۔

یہ تو سیاسی باتیں ہیں کہ نیلی فون آیا تھا۔ دراصل نیلی فون بعد میں آیا تھا اور فیصلے پہلے ہو چکے تھے۔ ان فیصلوں کو آخری شکل دینے میں بھی بڑا وقت لگا کیونکہ افغانستان پر حملہ بھی کہیں جا کر ۷ اکتوبر کو ہوا۔ اس دوران پرویز مشرف حکومت نے تمام سیاسی جماعتوں سے رابطے کیے تھے اور میڈیا اور تھنک ٹینکس سے مشاورت ہوئی تھی۔ میرے خیال میں وہ ریکارڈ ابھی تک محفوظ ہے کہ سوائے دو تین لوگوں کے سب نے کہا تھا کہ جو آپ کر رہے ہیں ٹھیک ہے۔ بعد میں پھر اسی مہینے ۲۰ تاریخ کو کور کمانڈرز کی میٹنگ ہوئی تھی اور میں بھی اس میں شریک تھا۔

س: کیا ہم نائن الیون کے محرکات کے بارے میں امریکہ سے اتفاق کرتے اور القاعدہ کے حوالے سے یکساں نقطۂ نظر رکھتے ہیں؟

ج: بنیادی طور پر افغانستان اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالے سے ہماری اور امریکہ کی سوچ بالکل مختلف رہی ہے۔ پہلے دن سے ہمارا یہ خیال تھا کہ نائن الیون کو یہ جو واقعہ رونما ہوا ہے اس سے مسلم انتہا پسندوں کا ایک نیا رخ سامنے آیا ہے اور اس کی بنیادی وجوہ کا سراغ لگانا ضروری ہے۔ ہم نے بنیادی نکتہ یہ بیان کیا تھا کہ ان سب معاملات کے پیچھے دیرینہ تنازعات ہیں مثلاً کشمیر، فلسطین، چیچنیا اور بوسنیا کے سلگتے ہوئے مسائل اور مسلمانوں کی بے چارگی ایک ہیجان بپا کیے ہوئے ہے۔ ہم نے کہا کہ یہ جو غیرحل شدہ مسائل ہیں ان کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے جبکہ امریکہ کی سوچ بڑی مختلف تھی۔ بہرحال پاکستان اپنی سوچ کا اظہار مختلف فورم پر کرتا رہا۔ دوسرا اہم اختلاف اس معاملے پر تھا کہ یہ صرف فوجی ایشو نہیں بلکہ یہ ایک بہت بڑا سیاسی ایشو بھی ہے جس پر پوری یکسوئی کے ساتھ توجہ دینے اور اس کا آبرومندانہ حل نکالنا انتہائی ضروری ہے۔

جب افغانستان پر انھوں نے چڑھائی کر دی تو ہم نے کہا کہ اپنا فوجی آپریشن مختصر رکھیں اور اسے جلد سے جلد ایک سیاسی پالیسی کی طرف منتقل کرنے پر توجہ دیں۔ ہم نے اپنی طاقت سے زیادہ آواز اٹھائی لیکن ان کے دماغ میں پاکستان کے حوالے سے یہ تاثر قائم ہو چکا تھا کہ وہ طالبان کا حمایتی ہے۔ اس کے بعد افغانستان میں جو حکومت آئی تو وہ ہم سے بہت ناراض تھی جس کے باعث ہمارے مسائل بڑھتے چلے گئے۔

س: جنرل صاحب! شمالی وزیرستان میں جو آپریشن ہو رہا ہے اس کے سیاسی اور فوجی سطح پر کیا اثرات مرتب ہوں گے اور کیا ہم اس میں فتح حاصل کر لیں گے؟

ج: پہلی بات تو یہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاکستان کا ایک بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ کوئی حکومت ترقی کی طویل المیعاد منصوبہ بندی نہیں کر سکی

حکمت عملی بہت ہی پیچیدہ ہوتی ہے جسے ہم بنیادی طور پر سیاسی پالیسی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں آپ کو ان لوگوں کے ذہنوں کو جاننا ہوتا ہے جو انتہا پسندی اور دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ یہ کوشش ایک جامع حکمت عملی کا تقاضا کرتی ہے جس میں فوجی آپریشن بھی ہوتے ہیں، معاشی ترقی اور مہاجرین کی دیکھ بھال بھی شامل ہے۔ سماجی اور نفسیاتی مسائل کا بھی تعین اس کا لازمی حصہ ہے۔

مشرف دور میں بھی حکمت عملی یہی تھی اور زرداری کے دور میں بھی یہی تھی لیکن جب اس حکمت عملی کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے تو اس عمل میں کچھ تو سول ایجنسیاں کام کرتی ہیں اور کچھ فوج سرانجام دیتی ہے۔ فوج اور سول ایجنسیوں کی ذمے داری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دراصل اس حکمت عملی یا پالیسی کو بنانے میں کوئی وقت نہیں ہوتی البتہ اس کے متوقع نتائج حاصل کرنے میں مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں تک شمالی وزیرستان کا تعلق ہے تو وہاں برسوں پہلے آپریشن نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ یا منطق نہیں تھی۔

س: آپ کی نظر میں تاخیر کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

ج: یہ آپ کو کیانی صاحب سے پوچھنا پڑے گا کہ آپریشن کیوں نہیں کیا حالانکہ ذاتی طور پر ہم ان سے یہی کہتے اور اس مسئلے کے تمام پہلوؤں سے آگاہ کرتے رہے۔ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں کہ فرض کیجیے آپ کے گھر چوہا، سانپ یا کوئی اور خطرناک جانور گھس آئے اور آپ اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ آپ نے ایک کمرا چھان لیا پھر ڈرائنگ روم بھی کلیئر کر دیا، اسٹڈی روم بھی چیک کر لیا۔ اب آپ نے دیکھا کہ چوہا اسٹور میں گھس گیا ہے تو آپ رک گئے کہ اس کو ادھر ہی رہنے دیتے ہیں۔ میں وہاں اسے ڈھونڈنے نہیں جاؤں گا کیونکہ چوہا ناراض ہو جائے گا۔ ہم نے آپریشن کے ذریعے سوات، دیر، مہمند، خیبر، درہ آدم خیل، کرم ایجنسی اور جنوبی وزیرستان کلیئر کر دیا۔

سب کا خیال یہی تھا کہ ہم جنوبی وزیرستان سے شمالی وزیرستان جائیں گے لیکن وہاں آ کر ہم رک گئے اور پانچ چھ سال رکے رہے اور کہا کہ اس کے بڑے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو پہلے آپریشن کیے گئے، ان کے بھی تو خطرناک نتائج نکلے ہیں۔ میں پوچھتا رہا کہ بھائی آپ نے کرم ایجنسی میں آپریشن کیا، جنوبی وزیرستان میں کیا، پھر درمیان کا علاقہ کیوں چھوڑ دیا؟ جواب ملا کہ یہ بڑا مشکل علاقہ ہے۔ میں نے اس علاقے میں ملازمت کی ہے، کوہاٹ میں بریگیڈ کمانڈر تھا۔ ایک عرصے تک میں وہاں قائم مقام جی او سی بھی رہا۔ اس زمانے میں یہ پورا علاقہ میرے پاس تھا۔ یہ میں نائن الیون سے پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ میں اور میرے بچے میران شاہ میں دو دو تین تین راتیں گزارتے تھے اور ایف سی والے ہمارے لیے میوزک پروگرام ترتیب دیتے۔ انھوں نے بار ہوٹل وغیرہ رکھا ہوا تھا اور وہ لان میں گانے وغیرہ سناتے رہتے تھے۔ مجھے تو وہ میران شاہ خوب یاد ہے۔ نائن الیون کے بعد ۲۰۰۲ء تک میں ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہا۔ میران شاہ میں ہمارے لوگ ہر وقت بیٹھے رہتے تھے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ معلوم نہیں اس کے بعد انھوں نے ایسا کیا کر ڈالا کہ حالات پیچیدہ ہوتے گئے۔

میں اکثر کیانی صاحب اور سب سے کہتا رہا کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ ابھی ہم نے آپریشن کیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔ وہ ضرور واپس آئیں گے۔ سب سے اہم چیز یہ ہے کہ آپ ان کی بنیادیں اس قدر کمزور کر ڈالیں کہ اب وہ جہاں بھی ہوں گے آرام سے نہیں بیٹھ سکیں گے بلکہ مفروروں کی طرح چھپتے پھر رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ انھیں پھر سے منظم ہونے میں بھی وقت لگے گا۔ شمالی وزیرستان کی جتنی آبادی ہے وہ ضرور سکھ کا سانس لے گی۔ دہشت گرد وہاں کے بازاروں میں آزادی سے گھومتے پھرتے تھے۔ یہ ازبک اور تحریک طالبان والے تھے جو وہاں کے باشندوں کے لیے اذیت کا باعث بنے ہوئے تھے۔

س: جنرل صاحب! آج ہمارے ائیرپورٹ، مساجد، یہاں تک کہ کچھ بھی محفوظ نہیں رہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہم نے بہت نقصان اٹھایا ہے۔ ناکامی کی وجہ کیا یہ ہے کہ ہماری حکمت عملی میں کوئی بنیادی خرابی ہے؟

ج: بلاشبہ ہم نے بہت نقصان اٹھایا ہے اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنی داخلی سکیورٹی پر اس طرح دھیان نہیں دیا جس طرح دینا چاہیے تھا۔ داخلی سلامتی کے لیے تین چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں:

(۱) سرحدوں پر آپ کا موثر کنٹرول

(۲) تربیت یافتہ پولیس فورس

(۳) برق رفتار اور قابل اعتماد انٹیلی جنس سروس

انٹیلی جنس کا مطلب آئی ایس آئی، ایم آئی یا آئی بی نہیں بلکہ اس کا مطلب ہے کہ ہر محلے، گلی، گاؤں، شہر، مسجد، اسکول، مدرسے میں انٹیلی جنس کا ایک نیٹ ورک موجود ہو۔ یہ نیٹ ورک پہلے ہمارے پاس موجود تھا۔ پولیس کے ایک سپاہی کو اپنے شعبے میں پوری مہارت حاصل ہوتی ہے۔ اسے اپنے علاقے کے ہر شخص اور اس کے مکینوں کا علم ہوتا ہے کہ کون آ رہا ہے، کون جا رہا ہے اور کون کیا کرتا ہے۔ ۱۹۷۰ء تک ہمارے پاس یہ نیٹ ورک موجود تھا تاہم ۱۹۷۱ء کے بعد یہ سسٹم کمزور ہوتا چلا گیا۔ پھر ہمارے ہاں سیاسی طور پر سستی شہرت کا ایک رواج چل نکلا۔ ہم اس وقت نوجوان تھے اور سنا کرتے کہ عوامی حکومت آگئی ہے۔ عوامی حکومت کا مطلب یہ کہ آپ کسی کے بھی دفتر جا کر اس کی بے عزتی کر سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایوب خان کے زمانے تک ایک سسٹم کام کر رہا تھا۔ اس کے بعد یہ نیٹ ورک کمزور ہوتا چلا گیا۔

غرض داخلی سکیورٹی نظام کے یہ چار شعبے ہیں: ماڈی سرحدوں پر قابل کنٹرول، پولیس فورس، انٹیلی جنس سروس اور ریسکیو اینڈ ری اسٹرکچر منٹ۔ آپ نے دیکھا ہے کہ پچھلے بارہ تیرہ برسوں میں ہمارے ہاں ہزاروں کے حساب سے خودکش حملے ہوئے ہیں لیکن ریسکیو کی صورت حال کا جائزہ لیں تو زیادہ سے زیادہ ایدھی والوں کی ایمبولینسیں پہنچ جاتی ہیں۔ پنجاب میں بعد میں جا کر ۱۱۲۲ کی سروس شروع ہوئی ہے۔ مگر جب دھماکا ہوتا ہے تو مختلف علاقوں میں جائے وقوع پر اتنی بے ترتیبی اور انتشار ہوتا کہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اسے کرنا کیا ہے اور ریسکیو کا مرحلہ کس طرح طے ہوگا۔ ہم نے کبھی ان مسائل پر توجہ ہی نہیں دی۔

سب سے اہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ جو ریاست

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاکستان کا دفاع مضبوط بنانے کے لیے ہمارا اپنی سرحدوں پر ہمارا کنٹرول ہونا اشد ضروری ہے

اپنی سرحدوں کی حفاظت نہیں کرتی' وہ کبھی داخلی طور پر محفوظ نہیں ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اپنی سرحدوں پر کوئی کنٹرول نہیں۔ افغان سرحد کھلی ہے کہ جس کی مرضی آئے جس کی مرضی جائے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ ہم نے اپنے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ رکھے ہیں اور کہا یہ جا رہا ہے کہ سرحد بند ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ہماری سکیورٹی کا سب سے بڑا چیلنج ہے اور ہمیں اس پر قابو پانا ہے۔ بھارت کے ساتھ اتنی ہی طویل سرحد ہے جتنی ہماری افغانستان کے ساتھ۔ بھارتیوں نے کوہ ہندوکش سے لے کر کشمیر تک آہنی زنجیر تعمیر کر لی ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں پہاڑیاں، ریگستان اور دلدلی علاقے ہیں۔

س: آپ کے خیال میں ہماری اس سوچ کی وجہ کیا ہے؟ کیا ہمارے فیصلہ ساز سوچتے ہیں کہ سرحد کو کھلا رکھنے ہی میں پاکستان اور افغانستان کا فائدہ ہے؟

ج: بنیادی طور پر ہمارا یہ قومی عزم ہونا چاہیے کہ ہمیں اپنے ملک کو محفوظ رکھنا ہے۔ اس عزم کے بعد ہمارے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوگی۔ افغان سرحد کیوں کھلی ہے۔ اس کا ایک سبب افغانستان کا یہ موقف ہے کہ وہ ڈیورنڈ لائن تسلیم نہیں کرتا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا کشمیر کا معاملہ طے ہو چکا؟ اگر ابھی طے ہونا ہے تو بھارتیوں نے کنٹرول لائن پر تار بچھا کر اسے کیسے بند کر دیا؟ ہمیں واضح طور پر افغانستان سے کہنا چاہیے کہ آپ کا جو سیاسی مسئلہ ہے اسے گفت و شنید سے حل کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک طرف' لیکن سرحد کو کھلا رکھنا آپ کے لیے نقصان دہ ہے اور ہمارے لیے بھی۔ میں یہاں سرحد بند کرنے کا لفظ استعمال نہیں کرتا۔ میں ہر جگہ کہتا ہوں کہ اس کو بند نہیں بلکہ کنٹرول کرنا چاہیے۔

س: سرحد کھلی رکھنے کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں طرف ایک جیسے قبائل آباد ہیں؟

ج: ایک جیسے قبائل صرف دو ایجنسیوں، وزیرستان اور مہمند میں ہیں۔ اس کے علاوہ باقی ایجنسیوں میں کہیں بھی ایک جیسے قبیلے آباد نہیں۔ افغانستان میں میرے خیال میں کوئی اور کڑی نہیں' یہ ہماری افسانوی کہانیاں ہیں' ہمیں ان سے باہر نکلنا ہوگا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں اور جتنی بھی سرحدیں ہیں' ان کے دونوں طرف تقسیم شدہ قبائل آباد ہیں اور خاندان بھی۔ آپ اپنی سرحدوں ہی کا جائزہ لیں تو یہی صورت نظر آئے گی۔ ایران کے ساتھ سرحد کے دونوں طرف بلوچ قبیلے آباد ہیں۔ ادھر انڈیا کی سرحد جو پنجاب اور سندھ سے گزرتی ہے' اس کے دونوں طرف کشمیری بھی ہیں اور جاٹ اور میر بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ جتنے بھی ملک ہیں' ان کی سرحدوں کا واضح تعین اور ان پر موثر کنٹرول ایک محفوظ ریاست کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ جس کا اپنی سرحد پر کنٹرول نہیں' وہ ریاست ہی نہیں کہلوا سکتی۔ لہٰذا ہمیں افغانستان کے ساتھ برادرانہ طریقے سے بات کرنی چاہیے کہ سرحد کھلی رکھنے سے دونوں کا نقصان ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سرحد کھلی رکھنے کی دو تین وجوہ ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسے کھلا رکھنے سے لوگوں کا آنا جانا زیادہ ہوگا اور باہمی تجارت فروغ پائے گی۔ دوسرے یہ کہ ہمارے تعلقات اتنے مضبوط ہو جائیں گے کہ ایک مشترکہ سرحدی انفراسٹرکچر وجود میں آ جائے گا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جدھر سے ہماری سرحد کھلی ہے، ادھر سے لوگوں کا آپس میں رابطہ ہے نہ تجارت ہو رہی ہے اور نہ کسی قسم کی ترقی کا نام و نشان ہے، البتہ یہ تینوں چیزیں آپ کو چمن میں ملیں گی یا طورخم میں جہاں ہمارا سرحد پر مکمل کنٹرول ہے اور باقاعدہ گیٹ بنا رکھے ہیں۔ وہاں تجارت ہو رہی ہے، لوگوں کا آنا جانا بھی ہے اور وہاں ایک سڑک بھی تعمیر ہو چکی۔ اس کے برعکس جس طرف سے آپ نے سرحد کھلی رکھی ہے، ادھر کوئی صحت مند سرگرمی نہیں ہو رہی۔ صرف دہشت گرد آ جا رہے ہیں۔ جہاں آپ کا کنٹرول ہے، وہاں تجارت ہو رہی ہے، ترقی کے آثار بھی ہیں اور تقریباً روزانہ ساٹھ ستر ہزار لوگ آتے جاتے ہیں۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملا ہے کہ سرحد کو کھلا رکھنے کے بجائے اسے کنٹرول کرنا بہتر حکمت عملی ہے۔

اب میں یہ بتاتا چلوں کہ افغانستان کے ساتھ ہماری سرحد کیوں کھلی ہوئی ہے۔ وہ اس لیے کہ شروع سے افغانستان ہمارے معاملات میں دخل اندازی کرتا آیا ہے۔ جب کہ الزام ہم پر لگتا ہے کہ ہم افغانستان میں مداخلت کرتے اور وہاں انتشار پھیلاتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ 1947ء سے اب تک افغانستان ہمارے ملک میں انتشار پھیلاتا اور پاکستانی علاقوں پر دعوے بھی کرتا رہا ہے۔ سرحد کھلا رکھنے کے اول ذمے دار افغان اور دوم پاکستان کی شکست پارٹیاں ہیں جن کی سیاست اس کے اردگرد گھومتی رہی ہے۔ میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس سرحد کا موثر کنٹرول حاصل کریں۔

پاکستان میں سات قبائلی ایجنسیاں ہیں۔ آپ ہر ایجنسی میں ایک ایک درہ بنا دیں۔ ایک طورخم میں ایک باجوڑ میں ایک ایک مہمند اور کرم ایجنسی اور شمالی وزیرستان، جنوبی وزیرستان میں۔ آنے جانے کے لیے سڑکیں تعمیر کریں اور ان پر کسٹم پوسٹ اور امیگریشن کا نظام قائم کیجیے۔ ان سے کہیں کہ جانے کی اجازت ضرور ہے لیکن آپ کے پاس شناخت کے لیے کاغذات ہونے چاہئیں۔ ایک عارضی راہداری سسٹم بھی بنایا جا سکتا ہے تاکہ ہمیں معلوم ہوتا رہے کہ کون آ اور کون جا رہا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ سرحد پختونوں کے نام پر کھلی رکھی گئی ہے اور نقصان بھی سب سے زیادہ انہی کا ہو رہا ہے۔ ہماری قیادت کو اس پہلو پر فوری توجہ دینی چاہیے۔

س: جنرل صاحب! انڈیا جارحانہ طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے۔ نریندر مودی جدید اسلحے کے انبار لگانا چاہتا ہے۔ اس نے نیپال میں اسٹرٹیجک اہمیت کی میٹنگ کی ہے۔ پھر انڈیا کے نئے آرمی چیف کا پاکستان کے خلاف رویہ معاندانہ ہے۔ آپ کے نزدیک ان اقدامات کے نتائج کیا نکلیں گے؟

ج: جب وطن کے دفاع کی بات ہو تو آپ کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ اس میں جذباتیت اور نعرے بازی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ انڈیا کے ساتھ ہمارے دیرینہ تنازعات ہیں اور اگر ہمیں اس وقت کسی سے جارحیت کا خطرہ ہے تو وہ انڈیا ہے۔

س: کیا ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود ہمیں یہ خطرہ لاحق ہے؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہمیں دفاعِ وطن کے حوالے سے پیچیدہ مسائل تاریخ اور ہمارے جغرافیائی اسٹریٹجک محلِ وقوع سے ملے ہیں

تی: وہ نیوکلیئر پاور ہونے کے باوجود کہتے رہے ہیں کہ ایک تیز رفتار محدود جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ بھارت کے عسکری ماہرین، فوجی افسر اور سیاسی راہنما ہمیشہ یہ باتیں کرتے رہے ہیں اور آج بھی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انڈیا ہم سے کئی گنا بڑا ہے۔ پچھلے پندرہ بیس برسوں میں وہاں سیاسی استحکام کی بدولت معیشت میں خاصی بہتری آئی ہے جب کہ ان کے مقابلے میں ہماری معیشت سنگین سیکیورٹی مسائل کے باعث اس رفتار سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

ہمارے ناہموار داخلی معاملات، سیکیورٹی اور سیاسی مسائل اور پھر نائن الیون سے پیدا شدہ حالات کے نتیجے میں پاکستان کے اندر ایک مضبوط لابی تیار ہو چکی جس کے دو پہلو ہیں: ایک اس کا مثبت پہلو ہے جو انڈیا کے ساتھ تعلقات میں بہتری چاہتا ہے۔ دوسرا منفی پہلو ہے جو یک طرفہ جھکاؤ چاہتا ہے...... وہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہر صورت میں انڈیا کے ساتھ اچھے اور بہتر تعلقات قائم رکھنے چاہئیں۔ مگر عالمی سفارت کاری میں یک طرفہ تعلقات قائم ہو نہیں سکتے۔

ابھی انڈیا میں ایک بڑی سیاسی تبدیلی آئی ہے۔ اصل میں مودی صاحب کی شخصیت کے دو تین پہلو ہیں۔ ایک تو وہ بزنس فرینڈلی ہیں، کارپوریٹ ورلڈ کو پروموٹ کرتے ہیں اور اسی کی حمایت سے اقتدار میں آئے ہیں۔ بھارتی معیشت میں پچھلے چار پانچ برسوں سے جو جمود آیا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ اس سے باہر نکلیں۔ دوسرا یہ کہ ان کا پس منظر ایک انتہا پسند ہندو کا ہے۔ اب ان کا کون سا رخ اس نئے منصب پر حاوی ہوتا ہے ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا۔

اگر وہ انتہا پسندی کی ڈگر پر چلتے ہیں تو انھیں لازماً دوسرے ایجنڈے پر علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ اگر وہ بڑے لبرل ہو جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ میں جو پہلے کرتا آیا ہوں وہ اب نہیں کروں گا تو یہ بھی ان کے لیے بہت بڑا چیلنج ہوگا کیونکہ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ آپ ساری زندگی ایک قسم کی سیاست کرتے رہے اور پھر اچانک مخالف سمت میں چل پڑیں۔ لہٰذا اس معاملے میں ہمیں جذباتی ہونے کے بجائے حالات کا حقیقت پسندانہ نظر سے جائزہ لینا ہوگا۔

جہاں تک سیکیورٹی مسائل کا تعلق ہے اس میں فوجی منصوبہ بندی زمینی حقائق پر انحصار کرتی ہے۔ ہم اپنے دشمن کی فوجی سرگرمیوں کا جائزہ اس پہلو سے لیتے ہیں کہ اس نے کس قدر عسکری صلاحیت حاصل کر لی ہے۔ ہم اس کے الفاظ پر نہیں جاتے۔ اگر آج وہ ایک بات کر رہا ہے تو کل دوسری بات کر دے گا۔ اس کی صلاحیت (Capacity) کیا ہے؟ اس سے حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ اگر ان کی استعدادِ کار میں اضافہ ہوتا ہے تو ہمیں اس طرف دھیان دینا ہوگا۔ مثال کے طور پر وہاں یہ بحث چل رہی ہے کہ انڈیا کے نیوکلیئر ڈاکٹرائن پر نظرِ ثانی ہونی چاہیے نیز انڈیا کی جو جاپان، آسٹریلیا اور امریکہ کے ساتھ نیٹ ورکنگ بن رہی ہے، تو ان تمام عوامل کا ایک سوچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے تجزیہ کرنا اور جدید خطوط پر منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔

س: جنرل صاحب! دس سال پہلے انڈیا ہماری طرف دیکھ رہا تھا مگر جس تیزی سے اس نے اپنا انفرااسٹرکچر کھڑا کیا ہے اب ہم اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ کیا ہم دیکھتے ہی رہیں گے یا آگے بڑھ کر ترقی بھی کریں گے؟

ج: ہمیں سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہے کہ ہم کسی کے خلاف جارحانہ عزائم نہیں رکھتے۔ جب آپ کی نیت حملہ کرنے کے بجائے دفاع کرنے کی ہو تو پھر آپ کے اندر کم از کم اتنی طاقت (minimum deterrence) ضرور ہونی چاہیے کہ آپ حملہ کرنے والے کو لرزہ براندام کر سکیں۔ اگر آپ کی صلاحیت ایک بمقابلہ تین کی بھی ہے تو آپ اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔ ہماری روایتی افواج کی تیاری اور ایٹمی صلاحیت اس درجے کی ہونی چاہیے کہ دشمن کو جارحیت کی جرأت نہ ہو سکے۔ الحمدللہ ایٹمی طاقت میں ہمارا پلہ مضبوط ہے۔ طاقت کا توازن قائم رکھنے کے لیے اس میں وقت کے ساتھ ساتھ ترقی جاری رکھنا نہایت ضروری ہے۔ تب ہم اس پوزیشن میں ضرور ہوں گے کہ اگر دشمن حملہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ پہلی اسٹرائک کے بعد اسے اتنا زیادہ نقصان ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔ تب وہ حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

آج کل کی جدید جنگ میں آپ دشمن کی مکمل قومی طاقت کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اس میں اولین بات یہ ہے کہ آپ کی قوم کے اندر دفاع کا جذبہ کارفرما ہے یا نہیں؟ قومی طاقت میں ایک آپ کی معاشی قوت اہمیت رکھتی ہے اور دوسرا قومی عزم۔ آپ کی پاکستانیت اس قدر مضبوط ہو کہ دشمن حملہ کرنے سے پہلے دس مرتبہ سوچے کہ سرحد تو ہم عبور کر جائیں گے مگر پاکستانیوں کے جذبہ دفاع کو ہرگز شکست نہیں دے سکیں گے۔ قومی طاقت میں مسلح افواج اور آپ کے اتحادی بھی شامل ہیں۔ یہ تمام چیزیں مل کر "قومی طاقت کی صلاحیت" (National Power Potential) بنتی ہے جو دشمن کو منہ توڑ جواب دے سکتی ہے۔

داخلی استحکام، سیاسی مضبوطی اور اندرونی تحفظاتی صورت حال بھی ٹیکٹیکل پاور پوٹینشل میں آتی ہے۔ اگر آپ نے فوج کو سڑکوں اور چوکوں پر کھڑا کر دیا تو پھر دفاع کمزور ہو جائے گا۔ میری ایک بات یاد رکھیں جب تک آپ کو اپنی سرحدوں پر مکمل کنٹرول حاصل نہیں ہوگا آپ کے اندرونی حالات کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ تب دشمن آزادی سے اپنے جاسوس بھیج سکے گا۔ ہم نے اپنی اندرونی سیکیورٹی کے اہم ترین مسئلے کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں اور آسان حل یہ نکالا ہے کہ امن عامہ کا ذرا سا بھی مسئلہ پیدا ہوا تو فوج کو بلا لیا۔ ہمارا یہ طرزِ عمل انتہائی نامناسب اور خطرناک ہے۔

پولیس میں پوری اہلیت ہونی چاہیے کہ وہ امن عامہ قائم رکھ سکے۔ انڈیا میں پولیس کے کئی درجات ہیں۔ مثلاً ریزرو پولیس اور سنٹرل ریزرو پولیس ہے۔ فوج تو وہاں بہت دور کی بات ہے۔ اس نے سول انتظامیہ سے کہہ رکھا ہے کہ ہمیں نہ بلایا جائے۔ جب کہ یہاں تو ہر چھوٹے موٹے مسئلے پر فوج کو طلب کیا جاتا ہے۔ وہ آ جائے گی، تختے دو تختے اور مہینے تک کام کرے گی۔ معاملات ٹھیک ہو جائیں گے لیکن اس سے ہوتا یہ ہے کہ ہمارا اندرونی تحفظاتی نظام تو وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے بلکہ ادارے مزید کمزور پڑ جاتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

افغانستان کا شروع ہی سے پاکستان کے ساتھ معاندانہ طرزِ عمل رہا ہے۔

س: جنرل صاحب! آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ سرد جنگ کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، خاص طور پر روس اور یوکرائن کے درمیان تنازع اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ پھر ملائیشین طیارے کا حادثہ اور دوسری طرف انڈیا، چین کا دوسرے ممالک کے ساتھ مل کر برکس بنانا تو کیا عالمی سطح پر کوئی نیا نقشہ بن رہا ہے؟

ج: جی بالکل! بین الاقوامی سطح پر ایک نیا منظر نامہ ابھر رہا ہے۔ سرد جنگ ختم ہونے کے بعد پچھلے بیس پچیس برسوں کے دوران عراق اور افغانستان میں دو جنگیں لڑی جا چکی ہیں جن کے نتیجے میں یورپ اور امریکہ میں معاشی بحران پیدا ہوا۔ جب یورپ اور امریکہ کی معیشت نیچے جا رہی تھی تب چین کی معیشت اوپر ابھر رہی تھی۔ اس وقت چین ناسا ترین سسٹم پر سات سو آٹھ سو ملین ڈالر خرچ کر رہا تھا۔ دنیا نے محسوس کیا کہ ایک نئی سپر پاور دنیا کے نقشے پر ابھر آئی ہے اور اب چین مرکزی کھلاڑی کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس وقت عالمی سطح پر جتنی بھی گلوبل پالیسیاں ترتیب دی جاتی ہیں، وہ چین کے مشورے سے طے پا رہی ہیں۔

اس اثنا میں روس نے بھی یہ محسوس کیا کہ اس کی قومی پہچان اور عالمی سطح پر اس کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے تو اس نے اپنی طاقت کو اکٹھا کر کے عالمی سطح پر ابھرنا شروع کیا۔ اس طرح روس اور امریکہ میں ملٹی پالیسی (Multi Polarity) کی طرف جانا شروع ہو گئے۔ اس کے علاوہ کچھ ابھرتی ہوئی معاشی طاقتیں بھی نمودار ہوئی ہیں۔ پہلے چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہوتی تھیں جن کو ایشین ٹائیگرز کہتے تھے۔ مثلاً ہانگ کانگ، سنگاپور، کوریا، تائیوان لیکن اب وہ ممالک آگے آ رہے ہیں جن کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ ان میں چین، انڈیا، برازیل، جنوبی افریقہ اور روس شامل ہیں۔ پاکستان بھی افق پر موجود ہے۔ جہاں پچھلے سات آٹھ برسوں میں گڑبڑ پیدا ہوئی۔ ۲۰۰۷ء سے عدلیہ کا جو مسئلہ پیدا ہوا، اس کے نتیجے میں مشرف صاحب چلے گئے۔ پھر پیپلز پارٹی کی حکومت آ گئی جس نے معیشت کی طرف دھیان ہی نہیں دیا اور ہماری معاشی افزائش رک گئی۔

اب ایشین ٹائیگرز والا رجحان نہیں رہا بلکہ زیادہ آبادی والے ملک آگے آ رہے ہیں۔ ہم بھی طاقتور ملک بن سکتے ہیں لیکن ہمارا داخلی عدم تحفظ، سیاسی اور معاشی عدم استحکام جیسے مسائل جن پر ہمیں غیر معمولی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

س: جنرل صاحب! ہم چین کے ساتھ مل کر گوادر اور دوسرے منصوبے بنا رہے ہیں۔ آپ کو لگتا ہے کہ ہم انہیں مکمل کر پائیں گے؟

ج: پہلی بات یہ ہے کہ چین کے ساتھ اقتصادی کوریڈور کا منصوبہ ہم نے ۲۰۰۵ء میں شروع کیا تھا اور چینیوں نے اسی سال نومبر میں اس پر سے پردہ اٹھانا تھا۔ پردہ اٹھانے کا مطلب ہے کہ مشرف صاحب فروری ۲۰۰۶ء میں چین جا رہے تھے۔ مجھے انھوں نے کہا کہ آپ اس ایشو کو اٹھائیں تاکہ میں جب ان کے صدر سے بات کروں تو وہ اس کے لیے تیار ہوں۔ اس میں ساری چیزیں شامل تھیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ شیخ رشید کہتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہتے ہیں کہ ہم نے تو اس ریلوے ٹریک کا سروے بھی کر لیا تھا۔ اس وقت گوادر سے خنجراب تک اکنامک کوریڈور کی بات ہوئی تھی۔ اس منصوبے میں ایکسپریس وے، موٹروے، ریلوے لائن، انرجی پائپ لائنز، فائبر آپٹک کیبل نیٹ ورک یہ ساری چیزیں شامل تھیں۔

چین نے اس وقت ہاں کر دی تھی اور کہا تھا کہ مزید سروے کی ضرورت ہے۔ جب چینی وزیراعظم پاکستان آئے تو میاں صاحب نے ابھی حلف نہیں لیا تھا۔ انھوں نے آ کر اکنامک کوریڈور کا اعلان کیا۔ اب لوگ کہہ رہے ہیں کہ اگر یہ حکومت چلی گئی تو اکنامک کوریڈور بند ہو جائے گا۔ ایسی بات ہرگز نہیں ہو گی۔ یہ چیزیں چلتی رہتی ہیں اور قوموں کے باہمی تعلقات اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔

اس منصوبے کے علاوہ ایک سلک روڈ کوریڈور بھی ہے جو چینی خلیج فارس سے لے کر انڈونیشیا اور چین تک بنانا چاہتے ہیں۔ یہ چین کا علاقائی ترقی کے لیے اپنا ایک ویژن ہے کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ساتھ اگر پورا ریجن ترقی نہیں کرے گا تو عالمی ترقی کو نقصان پہنچے گا۔ پورا خطہ نقصان میں رہے گا اور اس سے سکیورٹی کا مسئلہ بھی پیدا ہو گا۔

س: جنرل صاحب! سعودی عرب اور شرق اوسط میں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں پاکستان کا کیا کردار ہو سکتا ہے؟

ج: پاکستان میں ایک اصطلاح 'اسٹریٹجک گہرائی' بہت استعمال ہوتی رہی ہے۔ اس کا ایک غلط تاثر پیدا ہوا اور اسے ایک گالی بنا لیا گیا ہے۔ حالانکہ ہمارے برادر مسلم ممالک کہتے رہتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے اسٹریٹجک گہرائی کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہم آپ کی اسٹریٹجک گہرائی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان اس پورے خطے میں استحکام لا کر بڑی ترقی کر سکتا ہے۔ استحکام کا مطلب یہ نہیں کہ ہم فوج تعینات کریں گے کیونکہ لوگ غلط مطلب نکال لیتے ہیں۔ تمام شرق اوسط کی ریاستوں کے ساتھ ہمارے پرانے اور تاریخی تعلقات ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ایک بہت بڑا استحکامی کردار ہو سکتا ہے اور ہمیں اپنا یہ مثبت کردار ادا کرنے میں ہچکچانا نہیں چاہیے۔ البتہ اس میں ذاتی سوچ کے بجائے قومی مفاد کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ مثلاً وزیراعظم عمرہ کرنے جاتے ہیں تو اپنے بیٹے یا اسحاق ڈار کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ یہ تو ایک خاندانی معاملہ ہو گیا۔ آپ اگر عمرے کے لیے جا رہے ہیں تو وزیر خارجہ کے علاوہ دو چار اہم لوگ بھی ساتھ لے جائیں۔ ہمارا تعلق ان کے ساتھ سیاست کے علاوہ تاریخی تہذیبی اور امن وسلامتی کا بھی ہے۔

س: جنرل صاحب! جنرل مشرف کے ساتھ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اسے آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: میری ذاتی رائے کے مطابق جہاں تک آئین اور اس کے قانونی پہلوؤں کا تعلق ہے، تو انھیں آپ چیلنج نہیں کر سکتے۔ البتہ انھیں سیاسی اور قومی نقطہ نگاہ سے بھی دیکھنا چاہیے۔ آپ اپنے مسائل اور چیلنجوں کا جائزہ لیں اور ایک واضح راستہ اختیار کریں۔ اگر آپ کیس کریں گے تو اکرم شیخ کیسے پیدا کرتے رہیں گے۔ لیکن آئین میں صرف ایک آرٹیکل تو نہیں! آپ دیکھیں ہم کتنے آرٹیکلز کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ہم تو آرٹیکلز ۶۲ اور ۶۳ پر بھی عمل نہیں کرتے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہمیں اس وقت آپریشن ضرب عضب کی کامیابی اور شمالی وزیرستان کے دس لاکھ مہاجرین کی بہبود اور بحالی کو اولین ترجیح دینا چاہیے

س: کچھ ہماری تاریخی اور کچھ جغرافیائی مجبوریاں ہیں۔ ہماری ۶۸ سالہ زندگی میں فوج نے بھی حکومت کی ہے۔ کیا کبھی ایسی کوشش کی گئی یا کی جا سکتی ہے کہ ہم تاریخ اور جغرافیائی مجبوریوں کے گرداب سے باہر نکل کر سلامتی کا راستہ اختیار کر لیں؟

ج: قریشی صاحب! میں یہ نہیں کہوں گا کہ کوشش نہیں کی گئی' کیونکہ بہت اچھے اچھے لوگ بھی سیاسی اور فوجی ادوار میں حکومت میں آئے۔ یہ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ راستہ کیوں نہیں ملا اور ہمیں ناکامی کیوں ہوئی؟ کچھ باتیں میرے ذہن میں آ رہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بد قسمتی سے ہمارا جو سیاسی کلچر بن چکا' اس میں وسط مدتی اور طویل المیعاد سوچ موجود نہیں بلکہ سیاست داں الیکشن سے الیکشن کی طرف دیکھتے ہیں۔ موجودہ حکومت اور باقی حکومتوں کا بھی یہی حال تھا۔ یہ نہیں ہے کہ صرف میاں صاحب ایسا کر رہے ہیں۔ آپ ان کی ساری پالیسیاں اور پراجیکٹس دیکھیں جو ۲۰۱۲ء یا ۲۰۱۷ء میں ختم ہونے چاہئیں تھے وہ ۲۰۲۵ء میں مکمل ہوں گے۔

۲۰۲۵ء کے ویژن کی کیا ضرورت تھی؟ احسن اقبال پہلے بھی تو ویژن ۲۰۱۰ء دے چکے ہیں' لیکن بنیادی طور پر ان کی جو بھی پالیسی ہے وہ درحقیقت دورِ حکومت تک محدود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لانگ ٹرم مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ جو فوجی حکمران آتے ہیں' ان کی کچھ اور مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ان کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی حکومت کے آئینی جواز کا حصول قرار پاتا ہے۔ وہ پھر اسی کام پر لگ جاتے ہیں کہ سیاسی قوتوں کی حمایت حاصل کی جائے' کیونکہ فوجی وردی میں تو وہ کسی محلے میں جا کر راتیں تمام مشکل نہیں دے سکتے۔ وہ آئینی جواز کے چکر میں پھنس جاتے اور انھیں سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں۔ پھر ایک سمجھوتے سے دوسرا' تیسرا اور بالآخر انھیں کچھ اہم قومی مسائل پر بھی سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔

کالا باغ ڈیم کی مثال ہی لے لیجیے۔ مشرف نے کہا تھا کہ کالا باغ ڈیم بنائیں گے' لیکن وہ نہیں بن سکا۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں سیاست آ گئی تھی کہ آپ کو سندھ میں کسی کو اپنے ساتھ ملانا ہے' کسی کو فرنٹیئر اور پنجاب سے اقتدار میں شامل کرنا ہے۔ اگر اکیلے مشرف صاحب کی مرضی ہوتی تو وہ تو آرڈر کر دیتے کہ بنا ڈالو۔ سو یہ وجہ ہے ناکامیوں کی اور اس کا تجزیہ کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ اسی میں کشمیر کا مسئلہ آ جاتا ہے۔ شدت پسندی اور دہشت گردی کا مسئلہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ آپ جتنے تجربے کرتے ہیں' وہ سب سیاست کے زمرے میں آتے ہیں۔

س: کوئی ایسا نظام بنایا جا سکتا ہے جس کے ذریعے سول ملٹری تعلقات میں یک جہتی قائم ہو سکے؟

ج: بد قسمتی سے ہماری فیصلہ سازی کی جو قوت ہے وہ بیشتر ذاتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ یہ خرابی تب تک ٹھیک نہیں ہو سکتی جب تک ہماری سیاسی پارٹیاں ٹھیک نہیں ہوں گی اور ان کے اپنے تھنک ٹینک کام نہیں کر رہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوں گے۔ ہمارے ہاں پارلیمنٹ صوبائی اسمبلی اور کابینہ باڈیز ہیں۔ نیشنل سیکیورٹی کونسل بھی بن تو گئی مگر آج تک کوئی میٹنگ نہیں ہوئی کیونکہ ہمارے فیصلے زیادہ تر شخصی اہمیت کے ہیں۔

ذاتی کا مطلب یہ ہے کہ اگر میاں صاحب کوئی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ اپنے بھائی یا اسحاق ڈار یا خواجہ آصف کو بلا لیں گے۔ اگر زرداری صاحب کوئی فیصلہ کرنے چلے ہیں تو وہ اپنی بہن یا بیٹے سے مشاورت کر لیں گے۔ لہٰذا جب تک ہم ذاتی سوچ سے نکل کر قومی سطح پر نہیں سوچیں گے تب تک سسٹم نہیں بن سکے گا اور سول فوجی تعلقات میں توازن قائم نہیں ہو سکے گا۔ اگر فیصلے اداروں کی سطح پر ہونے لگیں اور باقاعدہ عمل کے ذریعے کیے جائیں تو اچھی حکمرانی کا ایک نظام ضرور وجود میں آ سکتا ہے۔ میں یہ مبارک منظر اپنی زندگی میں دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ رب کے حضور دعا گو ہوں کہ میرا عزیز وطن آزمائشوں سے نکل کر امن و سلامتی کا گہوارہ اور عالمی سطح پر انسانی اقدار کا محافظ بن جائے!

س: مسئلہ کشمیر کا حل کیسے ہوگا؟

ج: میں نے پرویز مشرف سے کہا تھا کہ لوگ آپ سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ آپ کشمیر کا مسئلہ حل کریں۔ دیگر مسائل موجود ہیں آپ انھیں حل کریں۔

س: کچھ دن پہلے جب میں کشمیر گیا تو میرا واسطہ کا بھی یہ خیال تھا کہ کشمیر کا مسئلہ آہستہ آہستہ حل ہوگا؟

ج: آپ کو یہ ان لوگوں نے بتایا ہے جو "را" سے بھی ملے ہوئے ہیں۔ میر واعظ "را" سے ملے ہیں اور ہم سے بھی۔ آپ گیلانی صاحب سے رابطہ کیجیے کشمیری جدوجہد کے اصل نمائندے تو وہ ہیں۔

س: آپ کی نظر میں کشمیر کا مسئلہ کب تک حل ہو جائے گا؟

ج: کشمیر کا مسئلہ پاکستان کی قوت کا مسئلہ ہے۔ ہم مضبوط ہوں گے تو یہ خودبخود حل ہو جائے گا۔ یاد رکھیے اگر ہم نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا تو نقصان اٹھا سکتے ہیں۔ ۶۸ سال تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوا چار دن پندرہ دن اور نہیں ہوتا پچاس سال تک حل نہیں ہوتا لیکن نہیں چاہیے کہ کم از کم اپنے اصول پر تو کھڑے ہوں۔

لوگ کہتے ہیں انڈیا کے ساتھ تعلقات اچھے ہونے چاہئیں۔ آپ انڈیا کے ساتھ ضرور اچھے روابط رکھیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کشمیر پہ اپنے اصولی موقف سے دستبردار ہو جائیں۔ ٹریک ون ٹریک ٹو ایسی ہی باتیں ہیں۔ ٹریک ٹو بیک چینل کی کامیابی تب ہوتی ہے کہ وہاں جو آپ فیصلے کریں وہ عوام کے سامنے لائیں اور وہ انھیں قبول کریں۔ یہ قصوری صاحب ذرا اپنا مسئلہ سامنے لے آئیں نا یہ ایسے ہی باتیں کرتے رہتے ہیں کہ جی بس ہم تو کرنے والے تھے کہ پھر وہ چودھری افتخار والا مسئلہ ہو گیا۔ یہ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اگر آپ انڈیا کی بات مان لیتے تو مسئلہ پہلے ہی حل ہو جاتا۔

س: جنرل صاحب آج کل کون سی کتاب زیرِمطالعہ ہے؟

ج: میں "احیائے طالبان" (The Taliban Revival) کتاب پڑھ رہا ہوں۔ فارغ اوقات میں قومی اور بین الاقوامی مصنفین کی کتابیں پڑھتا ہوں۔ موسیقی سے بھی لگاؤ ہے۔ کلاسیکل موسیقی شوق سے سنتا ہوں جس میں انڈین گانے بھی ہوتے ہیں۔ مجھے موجودہ دور کی پاپ یا راک موسیقی سے قطعی دلچسپی نہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

۱۴ اگست

یوم آزادی پاکستان

پاکستان ایئر فورس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ممتاز کشمیری راہنما سے سلگتے ہوئے سوالات

بھارتی حکومت مسئلہ کشمیر حل کرنے کی جرأت نہیں رکھتی

حریت کانفرنس کے بانیوں میں شامل، میر واعظ عمر فاروق سے سرینگر میں لیا گیا تازہ ترین چشم کشا انٹرویو، جو مقبوضہ کشمیر کی پیچیدہ و گمبھیر صورت حال بڑے واضح انداز میں اجاگر کرتا ہے

- بھارتی حکومت مقبوضہ کشمیر کے الیکشن کو بطور ریفرنڈم لیتی ہے
- بھارتی فوج کو مقبوضہ کشمیر سے بھاری آمدن ہو رہی ہے
- جہادِ کشمیر کی وجہ سے ہی مسئلہ کشمیر عالمی سطح پر زندہ ہوا

طیب اعجاز قریشی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھائی بھی لاہور سے مقبوضہ کشمیر تک کے اس سفر میں ہمراہ تھیں۔ اس نہایت دلچسپ سفر کی جھلکیاں اور روداد میں اپنے سفرنامہ میں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ تو آئیے روانہ ہوتے ہیں۔

ہمارے میزبان کو جب یہ معلوم ہوا کہ میرا تعلق خشک پھلوں و میوہ جات کی برآمد کے ساتھ ساتھ اردو ڈائجسٹ سے بھی ہے تو انھوں نے معروف کشمیری حریت راہنما میر واعظ عمر فاروق سے ملاقات کرانے کی ذمہ داری بھی اٹھالی۔

بھارت اور پاکستان کشمیر پر تین جنگیں لڑ چکے۔ پاکستان میں آج بھی یہ تاثر عام ہے کہ مقبوضہ کشمیر صرف بذریعہ جہاد ہی آزاد ہوگا۔ مقبوضہ کشمیر میں سید علی گیلانی، شیخ عبدالعزیز، شبیر احمد شاہ وغیرہ اس امر کے قائل رہے ہیں۔ تاہم بااثر کشمیری راہنماؤں کا ایک گروپ بھارتی حکومت سے گفت و شنید کر کے مقبوضہ کشمیر کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔ ان راہنماؤں میں میر واعظ عمر فاروق کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

میر واعظ عمر فاروق سے انٹرویو کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمارے پاکستانی بھائی ان کشمیری راہنماؤں کا موقف بھی جان سکیں جو مذاکرات کے بل پر کشمیر کی آزادی چاہتے ہیں۔

کشمیر میں ہمارے میزبان چلغوزہ کاروباری بھائی وکرم ملہوترا اور وشال ملہوترا تھے جو ارب پتی ہونے کے باوجود عجز و انکسار کا پیکر نکلے۔ ان کے والد ونود ملہوترا ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان تین نسلوں سے سری نگر کے علاقے مہاراج گنج میں ٹیکسٹائل کے کاروبار سے وابستہ ہے۔ ونود صاحب کے پردادا لال کنول نے ۱۸۵۰ء میں ملتان سے سری نگر آ کر ایس آر گنج کے تاریخی علاقے میں کاروبار کا آغاز کیا۔ ونود کے دادا گردھاری رام بڑے متمول اور امیر تاجر تھے جو اپنی سخاوت اور دریا دلی کی وجہ سے سری نگر میں بہت مقبول تھے۔ ایس آر گنج کی مارکیٹ ڈوگرہ دور حکومت ہی سے کاروبار کے لیے مشہور تھی۔ اس زمانے میں لالہ کنہیا لال یہاں پر واحد غیر مسلم دکاندار تھے۔ یہ مارکیٹ مہاراجا ہری رنبیر سنگھ نے ۱۸۷۱ء میں تعمیر کرائی تھی۔ دریائے جہلم کے کنارے اس طرح کی کئی اور مارکیٹیں بھی بنائی گئیں جن میں مہاراجا اور اس کے خاندان کے لوگ خریداری کرتے تھے۔ پارک کے چاروں طرف لکڑی کے خوبصورت کام سے بنائی گئی اس مارکیٹ تک پہنچنے کے لیے مہاراجا کا خاندان اور دربار کے وزرا کشتیوں کا استعمال کرتے۔ یہاں پہلا چکل صرف مہاراجا کے قریبی دوست

ایس آر گنج، سری نگر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

احباب ہی کو کاروبار کی اجازت تھی۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ دوسرے کاروباری حضرات بھی یہاں اپنا ٹھکانا بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ آگ لگنے کے بعد اس مارکیٹ کو کپڑے کی ہول سیل مارکیٹ میں تبدیل کر دیا گیا اور اس علاقے کا نام مہاراج گنج مشہور ہو گیا۔

جنوری ۱۹۹۰ء میں گاؤکدل سانحے کے بعد مہاراج گنج کے حالات بدل گئے۔ ڈوڈا مہوترا ان گنت مرتبہ فوج کے کریک ڈاؤن میں گرفتار ہوئے اور ہر مرتبہ انھوں نے انڈین افسران سے کہا کہ میں اپنے مذہب کا فائدہ اٹھا کر کشمیر کے کاز کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ایک مرتبہ تفتیش کے دوران ایک ہندو پولیس آفیسر کلیا نے ان کا نام اور مذہب جاننے کے بعد پوچھا کہ دوسرے سے تمھیں ڈر لگتا ہے اور وہ یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟؟ تو ڈوڈا مہوترا نے جواب دیا کہ یہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سن کر پولیس افسر کلیا کہنے لگا کہ تمہارا اللہ تمھیں جلد موت کی نیند سلا دے گا۔

خدا کی کرنی دیکھیے کہ اگلے دن کلیا ایک بم دھماکے میں ہلاک ہو گیا اور ڈوڈا مہوترا اپنے آبائی کاروبار کے ساتھ بخیر و عافیت رہے۔ اسی طرح ایک دفعہ مجاہدین انھیں اٹھا کر لے گئے۔ ڈوڈا مہوترا نے انھیں کہا کہ مجھے بھی تمہاری طرح اپنے کشمیری ہونے پر فخر ہے۔ یہ سن کر مجاہدین نے انھیں چھوڑ دیا۔

آنجہانی ڈوڈا مہوترا کا احترام آج بھی پورے سری نگر میں پایا جاتا ہے۔ وہ دوستی کی مثال بنے تھے۔ ڈوڈا مہوترا کا دفتر اور شوروم علاقہ مہاراج گنج میں واقع تھا جہاں آئے روز فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ ہڑتال اور کرفیو معمول کی بات ہے۔

فجر کی اذان کے ساتھ اٹھنے والے ڈوڈا مہوترا ہر اسلامی تہوار مثلاً عید الفطر، شب برات، ربیع الاول وغیرہ پر کھیر بانٹنا نہ بھولتے۔ ان کے مسلمان دوستوں نے بتایا کہ ایک دن ہم نے ان سے کہا کہ آپ زندگی تو مسلمانوں کی طرح گزارتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں نہ

میر واعظ ڈاکٹر محمد عمر فاروق ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کو اہل کشمیر کی سیاسی اور مذہبی قیادت ورثے میں ملی۔ آپ آل پارٹیز حریت کانفرنس کے دو میں سے ایک دھڑے، عوامی ایکشن کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ میر واعظ بننے کے کچھ عرصے بعد آپ نے آزادیٔ کشمیر کی حامی ۲۳ تنظیموں کو اکٹھا کر کے آل پارٹیز حریت کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ٹائم میگزین نے انھیں ایشیائی ہیروز کی صف میں شمار کیا۔

آپ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر پر مذاکرات میں کشمیریوں کی نمائندگی کے حامی ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں جب ان کے والد قتل ہوئے تو اس وقت وہ کشمیر کے مشہور تعلیمی ادارے برن ہال اسکول میں کمپیوٹر سائنس کے طالب علم تھے اور سافٹ ویئر انجینئر بننا چاہتے تھے۔ لیکن قسمت نے انھیں صرف سترہ سال کی عمر میں حریت کانفرنس کا بانی چیئرمین بنا دیا۔ آپ نے کشمیر یونیورسٹی سے اسلامی صوفی ازم پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

جھٹکے والا گوشت کھاتے ہیں تو کلمہ کیوں نہیں پڑھ لیتے؟ ملہوترا صاحب کہنے لگے: "اگر تمھاری تسلی اس طرح ہوتی ہے تو یہ لو تمھارے سامنے کلمہ پڑھ لیتا ہوں۔" انھوں نے پھر کئی بار کلمہ طیبہ پڑھ کر سنایا۔ ان کے دوست یہ دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور پھر دوبارہ ان سے یہ مطالبہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

جس دن ونود ملہوترا کا انتقال ہوا سوگ میں پورا سری نگر بند ہو گیا اور مسلمانوں کی کثیر تعداد ان کے گھر کے باہر جمع ہو گئی۔ حتیٰ کہ لوگوں کی نمازیں قضا ہو گئیں۔ کچھ نے انھوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ونود ملہوترا کو مسلمانوں کی طرح دفن کیا جائے نہ کہ ہندوؤں کی طرح ان کی آخری رسومات ادا کی جائیں۔

ونود ملہوترا نہ صرف سری نگر کی ہر دلعزیز شخصیت بلکہ بہادر، نڈر اور ہر ایک کے کام آنے والے تھے۔ ایک کشمیری مجاہد نے بتایا: "سری نگر کے بازار میں بھارتی فوج کے آپریشن کے دوران مجھے گولیاں لگ گئیں۔ میں خون میں نہایا ہوا تھا مگر کوئی مجھے اسپتال لے جانے کو تیار نہیں تھا۔ ملہوترا صاحب کسی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر مجھے اپنی گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئے اور میرا علاج کروایا۔"

مہاراج گنج کے علاقے میں رہنے کی وجہ سے ملہوترا خاندان کے میرواعظ کے خاندان سے قدیم دوستانہ مراسم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سری نگر میں حالات سے تنگ آ کر بے شمار ہندو شہر چھوڑ کر جموں یا کہیں اور جا بسے، اس وقت بھی ملہوترا صاحب اپنا گھربار اور کاروبار چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ البتہ انھوں نے اپنے بڑے بیٹے وشال کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے امریکہ بھجوا دیا۔ لیکن ان کی اہلیہ اور ایک بیٹا چھوٹا وکرم ساتھ ہی رہے۔ ایک اچھا فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ "دوردرشن" ٹی وی پر ایک مشہور پروگرام بھی کیا کرتے تھے۔

ملہوترا خاندان کے میرواعظ خاندان سے گہرے تعلق کی وجہ سے ہماری میرواعظ عمر فاروق سے ملاقات کا بندوبست ہو گیا۔ ملاقات والے دن شہر میں امرناتھ یاترا کے معاملے کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے اور چند علاقوں میں کرفیو نافذ ہو گیا۔ علی گیلانی اور حریت کے دوسرے راہنماؤں کو نظر بند کر دیا گیا۔ بہرحال وہ پھر بھی ہمارے میزبان میرواعظ کے نمائندے کے ساتھ رابطے میں

وشال ملہوترا، طیب اعجاز قریشی، میرواعظ عمر فاروق، شفیق عباسی، وکرم ملہوترا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہے۔ وہ دل برداشتہ سے ان تک پہنچنے کے لیے محفوظ راستوں کی نشاندہی کرتے رہے۔

آخر طے پایا کہ ہم حضرت بل کے مقام تک پہنچیں۔ پھر وہاں سے ان کا خاص آدمی ہمیں محفوظ راستے سے میرواعظ کی رہائش گاہ پہنچا دے گا۔ حالات کشیدہ ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی اور تقریباً کاروبارِ زندگی معطل تھا۔ جگہ جگہ فوج کی گاڑیاں موجود تھیں اور انڈین فوجی پتھراؤ سے بچنے کے لیے ہاتھوں میں حفاظتی شیلڈیں لیے سڑکوں پر تیار کھڑے تھے۔

میرواعظ کا قدیم آبائی گھر جامع مسجد سری نگر کے قریب مہاراج گنج میں واقع ہے جو بہت چھوٹا اور خستہ حال ہو چکا ہے۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں میرواعظ کا خاندان نگین کے علاقے میں نئے گھر میں منتقل ہوا۔ اونچی چاردیواری والی اس چھوٹی سی عمارت کے باہر پولیس کی خاصی نفری موجود تھی۔ جو حالات کی کشیدگی کا واضح اشارہ تھی۔ میرواعظ کے خاص آدمی اور میزبان کی وجہ سے سکیورٹی پر مامور عملے نے ہم سے کوئی پوچھ تاچھ نہیں کی اور ہم سہولت سے اندر چلے گئے۔

کچھ دیر ہمیں ایک دفتر نما کمرے میں بیٹھنے کو کہا گیا۔ میرا دل ماحول کی پراسراریت کے باعث تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وطن سے دور اور وہ بھی ایک اہم کشمیری راہنما سے مقبوضہ کشمیر میں انٹرویو.... گھمبیر فضا کے باعث وہ سوالات بھی لوحِ دماغ سے مٹ گئے جو پہلے میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا گیا۔ اندر داخل ہوئے تو اپنے سامنے خاکی کھدر کے کرتے اور دھوتی کی [illegible] میں ملبوس گورے چٹے خوبصورت کشمیری نوجوان راہنما کو چہرے پر مسکراہٹ سجائے اپنا استقبال کرتے پایا۔ چہرے کے

بجے ہم صوفوں پر بیٹھے تو میرواعظ سے تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔

میں نے انھیں اردو ڈائجسٹ کی تاریخ کے بارے میں بتایا اور محترم الطاف حسن قریشی کی جنرل مشرف کے ہمراہ دہلی میں ان سے ملاقات کا حوالہ دیا۔ تھوڑی سی دیر بعد جوس اور کشمیری بسکٹوں وغیرہ سے ہماری تواضع کی گئی۔ وہ پوچھنے لگے کہ کیا آپ لوگ مظفرآباد کی طرف سے آئے ہیں؟ میں نے انھیں بتایا کہ ہم واہگہ سے امرتسر اور وہاں سے سری نگر پہنچے۔ ہمارے پہنچنے پر انھیں خاصی خوشگوار حیرت ہوئی۔ میرواعظ میرے کاروباری پس منظر کی بنا پر پوچھنے لگے کہ بھارت سے پاکستان کی تجارت کیسی چل رہی ہے خصوصاً واہگہ کے راستے سے؟ میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا اور ماحول کا جائزہ لینے کے بعد بتایا کہ کچھ کاروبار تو ہو رہا ہے جیسے آلو پیاز وغیرہ بھارت سے آ رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک مکمل کاروباری ماحول نہیں بنا۔ دونوں ممالک کے کاروباری افراد ایک دوسرے کے ملک کا دورہ کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی بہت رکاوٹیں باقی ہیں جن کے باعث دونوں اطراف دوستانہ ماحول جنم نہیں لے سکا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ابھی تک ٹھوس بنیادوں پر کاروباری تعلقات قائم نہیں ہو سکے۔ بہرحال علاقائی تجارت کے بغیر کوئی خطہ ترقی نہیں کر سکتا اور یہ عمل رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہا ہے۔

ہم نے انھیں بتایا کہ جب سے بی جے پی حکومت آئی ہے بھارتی ویزہ لینے میں کچھ تاخیر ہونے لگی ہے۔ اگرچہ ادھر پاکستان میں ہماری ساری قیادت کشمیری ہی ہے۔ سیاست دانوں مثلاً نواز شریف، شہباز شریف، خواجہ آصف، خواجہ سعد رفیق، اسحاق ڈار وغیرہ کے علاوہ بہت سے بیوروکریٹس بھی کشمیری ہیں۔ بلکہ یہ تو طعنہ بن چکا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

حکومت میں سب کشمیری ہی چھائے ہوئے ہیں۔

یہ بتانے کے بعد میں نے میر واعظ کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا کہ آپ حکومت پاکستان سے کیا توقعات رکھتے ہیں؟

اس سوال پر میر واعظ کے چہرے سے مسکراہٹ جاتی رہی اور سنجیدگی غالب آ گئی۔ کہنے لگے کہ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان میں جو بھی حکومت آئے وہ مثبت انداز میں مسئلہ کشمیر کو لے کر چلتی ہے۔ مشرف صاحب نے بھی اس مسئلے کو زندہ رکھا۔ اگرچہ انہیں اس حوالے سے کافی تحفظات تھے۔ ہمیں لگتا تھا کہ شاید وہ اپنے دائرہ کار سے باہر چلے گئے ہیں لیکن وہ اس مسئلے کے حل کی جانب قدم بڑھانا چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے ان پر برا وقت آ گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی نے کچھ اچھا کام کیا ہے تو اسے آگے بڑھانا چاہیے۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ ہم بہت سی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ ہر نئی آنے والی حکومت پچھلی کو الزام دیتی ہے کہ اس نے معاملے کا بیڑا غرق کر دیا اور ہم نئے سرے سے اسے دیکھیں گے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ کو نئے سرے سے بھی شروع کرنا ہے تو کہیں نہ کہیں سے اس کی بنیاد بنانا ہو گی۔

خلیق عباسی بڑے باخبر اور معلومات کا سمندر اپنے ذہن میں سنبھالے رکھنے والی شخصیت ہیں اور کم ہی کسی کو اس سمندر سے موتی نکالنے دیتے ہیں۔ انھوں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "۱۹۹۹ء میں جو عمل شروع ہوا وہ بہت آگے تک نکل گیا تھا۔"

میر واعظ اتفاق کرتے ہوئے بولے: "جی ہاں مشرف دور میں ہم کئی مرتبہ پاکستان گئے۔ بیرونی ممالک بھی ان سے ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ مشرف دور میں جو حالات آگے بڑھے وہاں سے آگے چلا جائے۔ مسئلہ کشمیر کا حل ایک ہی نشست میں ناممکن نہیں یہ مرحلہ وار حل ہو گا۔ دونوں حکومتوں کے اپنے اپنے تحفظات ہیں۔ ابھی تک دونوں طرف اعتماد کی کمی ہے۔ بھارتی اور پاکستانی حکومتیں مسئلہ کشمیر کے حوالے سے بہت حساس ہیں اور اٹھائے جانے والے ہر قدم کو شک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں تو عام لوگ بھی اس مسئلے کی باریکیوں سے واقف ہو چکے۔ مثال کے طور پر کشمیری مسلمان نہیں چاہتے کہ بھارت بھر سے ہندو امرناتھ یاترا کرنے آئیں۔ ان کے ذہن میں یہ خطرہ جنم لے چکا ہے کہ اب یاتریوں کے بھیس میں انتہا پسند ہندو بھی وادی میں آ پہنچیں گے۔

بدقسمتی سے بھارتی حکومت بھی مسئلہ کشمیر کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ حکومت کے پاس وسائل ہیں اور وہ یہاں کا سارا انتظام چلا رہی ہے۔ پھر یہاں بھارتی فوج بھی بیٹھی ہے۔ اس کے اپنے مفادات ہیں اور وہ بھی یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔ اسے کشمیر سے بھاری بھرکم آمدن ہوتی ہے۔ انڈین آرمی کا بجٹ بھی بہت بڑھ رہا ہے۔ یہ سب باتیں مسئلہ کشمیر کے حل میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔

امید تھی کہ اگر بھارت میں کوئی مضبوط حکومت آئے جیسے بی جے پی کی حکومت آئی ہے تو وہ کوئی ٹھوس اقدامات کرے گی۔ واجپائی صاحب نے ایسے ہی اقدامات کیے تھے۔ دوسری سمت پاکستان کے اپنے اندرونی حالات بھی کشیدہ ہیں۔ اس وجہ سے پاکستان کی مسئلہ کشمیر پر توجہ کم ہو گئی۔ امید ہے جب حالات آگے بڑھیں گے تو بہتری آئے گی۔ وادی میں اب بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ مسئلہ کشمیر سیاسی طور پر حل کیا جائے۔ چنانچہ بھارتی اور پاکستانی دونوں حکومتوں کو چاہیے کہ وہ اسے مشترکہ انداز سے حل کرنے کی سعی نہ کریں۔ اب

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہاں ریاستی انتخابات ہو رہے ہیں شاید ان کے ذریعے بی جے پی کوئی ٹھوس اقدام کر سکے۔

اس دوران میں نے اپنی اہلیہ شازیہ کو تصاویر بنانے کا اشارہ کیا اور میر واعظ سے آنے والے دنوں میں رونما ہونے والے واقعات کا اندازہ لگانے کے لیے پوچھا کہ الیکشن کب ہو رہے ہیں اور کیا آپ ان میں حصہ لیں گے؟

دھیمے سروں میں وہ کہنے لگے: نومبر دسمبر میں الیکشن ہوں گے۔ ہم انتخابات میں بالکل حصہ نہیں لیتے بلکہ حریت کے پلیٹ فارم سے کوئی بھی جماعت انتخابات میں حصہ نہیں لیتی۔ وجہ یہ ہے کہ بھارتی حکومت کشمیر کے انتخابات کو ریفرنڈم کے طور پر لیتی ہے۔ بھارتی حکمران طبقے کا کہنا ہے کہ انتخابات ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ کشمیری بھارتی حکومت پر اعتماد کرتے ہیں۔ چناں چہ اب کوئی مسئلہ باقی نہیں رہا۔ لیکن ہم انتخابات کو ایک انتظامی معاملہ سمجھتے ہیں۔ اس سے لوگوں کے مقامی مسائل جیسے بجلی پانی اور سڑکیں وغیرہ تو حل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان انتخابات کا آزادیٔ کشمیر کے اصل مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہی ہمارا موقف ہے۔

ابھی تک انڈین گورنمنٹ کی طرف سے یہ سوچ سامنے نہیں آئی کہ مسئلے کو سیاسی طور پر حل کیا جائے۔ وہ آزادی پسند کشمیریوں کو طاقت اور تشدد سے کنٹرول کرتی ہے۔ یوں پانچ چھے ماہ تو نکل جاتے ہیں لیکن پھر کوئی چھوٹا سا واقعہ حالات خراب کر دیتا ہے۔ لوگ سڑکوں پر نکل آتے ہیں پتھراؤ جلاؤ ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کی جانیں چلی جاتی ہیں۔

میر واعظ کے جوان سال ذہن کے اندر جھانکنے کے لیے میں نے اچانک سوال کیا۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ اگر حریت کے پلیٹ فارم سے مقبول کشمیری قیادت انتخابات میں حصہ لیتی ہے تو بھارتی سرکار ان کے مطالبات کو سنجیدگی سے لے گی؟

میرے سوال کے مضمرات کا اندازہ لگاتے ہوئے میر واعظ کہنے لگے: اصل مسئلہ بھارتی حکومت کا رویہ ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب (شیخ عبداللہ کی) نیشنل کانفرنس نے الیکشن جیتا تو اس نے بعد ازاں خود مختاری کی قرارداد پاس کر لی۔ مگر بھارت نے قرارداد کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ ہاں اگر یہ بات طے کر لی جائے کہ انتخابات کے ذریعے جو لوگ منتخب ہو کر آئیں گے ان کی نمائندہ حیثیت ہوگی اور انڈین گورنمنٹ ان سے مسئلہ کشمیر حل کرنے کی خاطر مذاکرات کرے گی تو پھر انتخابات میں حصہ لینے کی بات سمجھ آتی ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں تو پھر یہ ایک لاحاصل مشق ہے۔

چناں چہ موجودہ حالات میں حریت کانفرنس نے انتخابات میں حصہ لیا تو اس کا مطلب ہے کہ مسئلہ کشمیر ختم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے ہم انتخابات میں حصہ نہیں لیتے۔ جو لوگ انتخابات میں حصہ لیتے ہیں وہ مقامی مسائل کے حل ہی کو مسئلہ کشمیر کا حل سمجھتے ہیں۔ مگر ان انتخابات سے کیا نتیجہ نکلے گا جب تک اصل معاملات کی طرف توجہ نہیں دی جاتی؟ بھارتی حکومت میں ابھی وہ سیاسی جرأت مفقود ہے جو ہم تھوڑی سی پاکستانی حکومت میں دیکھتے ہیں۔

ہم پاکستان جائیں تو وہاں کے عوام میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے وہ اب ماضی کے یرغمال نہیں رہنا چاہتے۔ وہ مثبت انداز میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ بھارت میں یہ بات ابھی نظر نہیں آئی۔ دراصل بھارتی سیاست دانوں نے مسئلہ کشمیر کو جس طرح بھارتی عوام کے سامنے پیش کیا اس کی وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ کشمیر میں ساری خرابی پاکستان کروا رہا ہے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اب اس سوچ کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بدلنا ہوگا مگر اس میں وقت لگے گا۔

میرواعظ کے خیالات نے مجھ میں توانائی بھر دی تھی اور گفتگو کا رخ متعین کر دیا۔ میں نے استفسار کیا کہ کیا آپ کو لگتا ہے کہ بھارتی عوام کے رویے میں کچھ تبدیلی آ رہی ہے؟

وہ کہنے لگے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ تھوڑی بہت تبدیلی آئی ہے۔ جیسے اروندھتی رائے، عام آدمی پارٹی (AAP) والے کیجری وال تیز تھے اور بائیں بازو کے لوگ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے ہماری تائید کرتے ہیں۔ اصل میں بھارتی عوام ابھی تک مسئلے کے بنیادی پہلوؤں سے لاعلم ہیں۔ اب بی جے پی والے آ گئے ہیں۔ لوگوں کو ان کے ماضی کے حوالے سے کافی پریشانی ہے کہ نجانے یہ کس قسم کے انتہاپسندانہ اقدامات کریں گے؟ کشمیری کنفیوژن کا شکار ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ بی جے پی والے ہی مسئلہ کشمیر حل کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے پاس مینڈیٹ ہے۔ بہرحال زمینی حقائق سے نہیں لگتا کہ مسئلہ کشمیر کا کوئی فوری حل نکل آئے۔ ابھی طویل وقت درکار ہے شاید دس سال یا کچھ اور۔

یہ سن کر میں نے اگلا سوال کیا: دس سال کے دوران کیا ہو سکتا ہے؟

میرواعظ سوچتے ہوئے گویا ہوئے: مشرف صاحب نے بعض تجاویز دی تھیں مثلاً لائن آف کنٹرول کھول دی جائے، دو طرفہ تجارت بڑھائی جائے، کشمیر میں مشترکہ کنٹرول قائم کیا جائے وغیرہ۔ ممکن ہے کہ اگلے برسوں میں ان تجاویز پر عمل ہو جائے۔ پھر دس پندرہ سال بعد اصل مسئلے کی طرف توجہ دی جائے۔

نواز شریف مودی حکومت سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی کوشش میں تھے۔ اسی تناظر میں، میں نے سوال کیا: خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر مذاکرات ہونے والے ہیں۔ کیا اس میں مسئلہ کشمیر زیربحث آئے گا؟

ہمارے ممدوح کہنے لگے، میرا نہیں خیال کہ اس میں مسئلہ کشمیر زیربحث آئے۔ اس مسئلے کو جب تک سیاسی سطح پر نہیں اٹھایا جاتا، اس کا کوئی حل نہیں نکلے گا۔ بیوروکریٹک سطح پر اس پر کوئی پیش رفت نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ بات چیت کا شروع ہونا اچھی بات ہے۔ ہم اس بات کے حق میں ہیں کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان بات چیت کے دروازے کھلیں۔ بدقسمتی سے یہ جو گفتگو ہو رہی ہے، اس کے ایجنڈے پر کشمیر نہیں بلکہ تجارت، ویزا اور دہشت گردی وغیرہ کے مسائل ہیں۔

بھارت اور پاکستان کے مابین اختلافات کی جڑ مسئلہ کشمیر ہے۔ چناںچہ جب تک وہ حل نہیں ہوتا، دونوں ممالک میں کشیدگی برقرار رہے گی۔ بہرحال اگر دونوں ممالک کے خارجہ سیکرٹری سال میں دو تین مرتبہ آپس میں ملیں تو کچھ مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہر بار جب بھی بات چیت شروع ہوتی ہے، یہ صفر سے آغاز کرتے ہیں۔ تاہم کچھ باتیں اچھی بھی ہو رہی ہیں۔ جیسے لوگ آپس میں ملنے لگے ہیں۔ مظفرآباد سے بس سروس شروع ہوئی ہے۔ پاکستان سے کچھ چیزیں ادھر آ رہی ہیں جیسے کپڑے وغیرہ۔ لوگ انھیں بڑی چاہت سے خریدتے ہیں۔ ذرائع آمدورفت بہتر ہو جائیں تو مزید قربت جنم لے گی۔

اب میں نے ہمت کر کے ایک تیکھا سوال کرنے کی جسارت کی کہ پاکستان میں کچھ لوگوں کا خیال ہے، مسلح جدوجہد نے مسئلہ کشمیر حل کرنے کے سلسلے میں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا؟

میرواعظ میرے اندازے کے برعکس بولے کہ مسلح جدوجہد سے یہ فائدہ ہوا کہ مسئلہ کشمیر جو عرصہ دراز

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے سرد خانے میں پڑا ہوا تھا اقوام عالم کی نظروں میں آ گیا۔ لیکن اب مسئلہ کشمیر حل کرنے کے لیے معاشی اور سیاسی محاذ پر لڑنے کی ضرورت ہے۔ معاشی مضبوطی کے بغیر سیاسی خودمختاری کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں اگر راستے کھل جائیں تو تجارت ہوتی ہے اس کا اصل فائدہ کشمیری عوام کو ہوگا۔

میں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا: کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ اپنے بنیادی کاز پر ڈٹے رہیں اور تجارت و دیگر معاملات پر بھی بات کریں؟

وہ کہنے لگے: سابق وزیر اعظم آزاد کشمیر سردار عتیق نے جب لائن آف کنٹرول کو لائن آف کامرس میں تبدیل کرنے کی بات کی تو میں نے یہ تجویز سراہی تھی۔ لوگوں کی مشکلات کم ہونی چاہئیں۔ لیکن کشمیر کے اندر بھارت کی بے تحاشا فوج موجود ہے جو لوگوں کو خوفزدہ کیے رکھتی ہے۔ لہٰذا فوج کو کم ہونا چاہیے۔ آج کل یہاں ایک اور مسئلہ لوگوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ بھارتی فوج کا ایک جگہ بہت بڑا اسلحہ ڈپو تھا۔ لوگوں نے احتجاج کیا تو انھوں نے وہ جگہ خالی کر دی لیکن اب وہ دوسری جگہ منتقل ہو رہا ہے۔ وہ ۲۰۰ کنال پر محیط ہوگا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ سیاسی طریقے ہی سے ہم مسئلہ کشمیر بہتر انداز میں حل کر سکتے ہیں۔ کرنے کو تو بہت کچھ ہے مگر اس کے لیے سیاسی جرأت درکار ہے جو مجھے ابھی تک بھارت میں نظر نہیں آتی۔

میں اگلے سوال کے لیے تیار تھا۔ کشمیر میں بھی لوگ آزادی کے حوالے سے مختلف آرا رکھتے ہیں۔ کوئی پاکستان کے ساتھ الحاق کی بات کرتا تو کوئی بھارت کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ کچھ مکمل خودمختاری چاہتے ہیں۔

یہ کشمیری عوام میں انتشار کی نشانی نہیں؟ میں نے اپنے اندیشوں کو سوال کی شکل میں ڈھالتے ہوئے پوچھا۔

وہ تحمل سے گویا ہوئے: کسی بھی تحریک میں مختلف ادوار آتے ہیں۔ ہم نے ۱۹۴۷ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ء اور پھر کارگل کی جنگ بھی دیکھی۔ یہاں پر قوم پرستی کی باتیں بھی ہوئیں۔ یہ سب ہوتا رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک دفعہ صحیح بنیاد پر مسئلہ حل کرنے کے لیے بات چیت ہوئی تو لوگوں میں اس حوالے سے اتفاق رائے پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ سب کو آخرکار مذاکرات کی میز ہی پر بیٹھنا ہے۔ فی الوقت کشمیریوں کو بھارت پر اعتماد نہیں۔ وہ اس کے ہر حکومتی اقدام کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا بھارتی حکومت کو کشمیری عوام میں اپنی ساکھ بہتر بنانا ہوگی۔

اب میں نے مقبوضہ کشمیری معاشرتی زندگی کے ایک اہم پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے پوچھا: مقبوضہ کشمیر میں ہندو، مسلم، شیعہ سنی سب ملتے ہیں۔ کشمیری پنڈت بھی یہاں جا کے آباد ہیں۔ ہم نے ان کے درمیان اختلافات کی خبر نہیں پڑھی۔ اس یگانگت کی کیا وجہ ہے؟

میرواعظ مسکراتے ہوئے بولے: کشمیر میں کبھی فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوئے۔ یہ معاملہ صرف کشمیر کے اصل مسئلے سے توجہ ہٹانے کے لیے میڈیا میں اچھالا جاتا ہے۔ یہ دیکھیے کہ امرناتھ یاترا سیکڑوں برسوں سے ہو رہی ہے۔ کشمیری کبھی اس کی وجہ سے پریشان نہیں ہوئے۔ ہم سب یہاں پرامن طریقے سے رہ رہے ہیں۔ اصل میں کچھ جماعتیں لوگوں سے ووٹ حاصل کرنے کی خاطر ایسے مسائل اٹھاتی ہیں۔ بی جے پی والوں نے بھی بہت کوشش کی کہ فرقہ وارانہ معاملات پر لوگوں کو تقسیم کیا جائے تاکہ ہندو ووٹ اسے مل سکے۔

اس موقع پر عباسی صاحب جو خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہے تھے کہنے لگے کہ جموں و کشمیر میں ہندو مسلم ووٹوں کا کیا تناسب ہے؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جواب ملا: جموں کے بیشتر اضلاع میں ہندو اور بعض اضلاع میں مسلمان اکثریت رکھتے ہیں۔ جبکہ وادی کشمیر کے تمام اضلاع میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔

میں میر واعظ کے خاندان کا پس منظر جاننے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس لیے پوچھا کہ آپ اپنے خاندان کے متعلق بھی بتائیے۔

میر واعظ نے تفصیل سے بتایا: ہمارے آباؤ اجداد شاہ ہمدان کے ساتھ کشمیر آئے۔ پہلے ہم جنوبی کشمیر میں مقیم تھے۔ پھر یہاں سری نگر چلے آئے۔ اسی شہر میں میر واعظ کا ادارہ وجود میں آیا۔ اس کا مرکز جامع مسجد سری نگر میں واقع ہے۔ یہ بڑی خوبصورت مسجد ہے۔ عام طور پر مساجد کی تعمیر میں گنبد وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ لیکن اس مسجد کی طرز تعمیر میں آپ کو بدھ مت کی عمارتوں کی جھلک بھی نظر آئے گی۔ وجہ یہ کہ اسلام سے پہلے یہاں بدھ مت کا کافی اثر تھا۔ وادی کے لوگوں کا ثقافتی اور روحانی رابطہ سمرقند، بخارا اور وسطی ایشیا سے زیادہ رہا ہے۔ اس کی جھلک آپ کو کشمیری زبان، کھانوں، لباس، دستکاریوں اور طرز تعمیر میں ملے گی۔ یہ سب چیزیں یہاں پر شاہ ہمدان نے متعارف کروایا۔

میر واعظ مولوی محمد فاروق

میر واعظ: کشمیریوں کے روحانی راہنما

وادی کشمیر میں ایک کروڑ مسلمانوں کے روحانی اور مذہبی قائد میر واعظ کہلاتے ہیں۔ وادی کشمیر میں میر واعظ کے دو سلسلے ہیں۔ ان میں جامع مسجد سری نگر والا زیادہ معروف ہے۔ جبکہ دوسرے میر واعظ کا تعلق جنوبی کشمیر کے مسلمانوں سے ہے۔ ان دونوں سلسلوں کا تعلق ہمدان (ایران) کے امیر کبیر شاہ ہمدان سے ہے جو سولھویں صدی میں کشمیر میں وارد ہوئے۔ کسی خاندان کے ایک یا دو افراد ہی کو اسلامی جامع سے فارغ التحصیل اور قرآن و سنت کے علم سے بہرہ ور ہونے کے بعد میر واعظ کا لقب عطا ہوتا ہے۔

حافظ غلام رسول شاہ جنھیں لاسا بابا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، پہلے شخص تھے جنھیں میر واعظ کشمیر کا خطاب ملا۔ ان کے بیٹے حاجی محمد یحییٰ نے اپنے والد کے کام کو آگے بڑھایا۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے قرآن پاک کے تیسویں پارے کا کشمیری زبان میں ترجمہ کیا۔ ان کے چار بیٹوں میں سے ایک مولانا رسول شاہ کو کشمیر کا سر سید کہا جاتا ہے۔ کشمیر میں جدید تعلیم کو روشناس کروانے کے لیے انھوں نے انجمن نصرت الاسلام کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد مولانا احمد اللہ شاہ اور مولانا عتیق اللہ شاہ یکے بعد دیگرے میر واعظ بنے۔

جب مولانا عتیق اللہ شاہ بڑھاپے اور خرابی صحت کی بنا پر میر واعظ کے فرائض ادا کرنے سے قاصر ہو گئے تو مولانا محمد یوسف شاہ کو جو مولانا رسول شاہ کے بیٹے اور مشہور دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھے، میر واعظ بنا دیا گیا۔

۱۹۲۲ء میں عتیق اللہ شاہ کی وفات کے بعد ان کے پوتے مولوی محمد فاروق نائب میر واعظ مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں محمد یوسف شاہ کی رحلت کے بعد میر واعظ کشمیر بنائے گئے۔ میر واعظ مولوی محمد فاروق کو ۱۹۹۰ء میں نامعلوم لوگوں نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد ان کے سترہ سالہ بیٹے محمد عمر فاروق کو میر واعظ کشمیر مقرر کیا گیا۔ وہ ابھی تک یہ ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے کہا کہ شاہ ہمدان تو ایران سے آئے تھے؟

وہ کہنے لگے کہ اصل میں اس وقت ایران اور وسطی ایشیا کے علاقے ایک ہی خطے پر مشتمل تھے۔ شاہ ہمدان کے ساتھ آنے والوں میں ہمارے اجداد بھی شامل تھے۔ انھوں نے یہاں تعلیمی ادارے قائم کیے۔ آج بھی پوری وادی میں پندرہ سے بیس اسکول ہمارے زیرانتظام چل رہے ہیں۔ ان میں مذہبی تعلیم دینے والے ادارے بھی شامل ہیں۔ یہ تمام ادارے ہماری انجمن نصرت الاسلام کے زیرانتظام چل رہے ہیں۔ ۱۸۹۹ء میں اسلامیہ ہائی اسکول وادی کا پہلا جدید تعلیمی ادارہ تھا جو میر واعظ رسول شاہ نے قائم کیا۔ اسی لیے انھیں کشمیر کا سرسید احمد خان بھی کہا جاتا ہے۔

اصل میں لوگ انگریزی تعلیم پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے کہ اگر انگریزی پڑھی تو انگریز بن جائیں گے۔ ان حالات میں میر واعظ نے جدید تعلیم عام کرنے کی تحریک چلائی اور لوگوں میں اسے متعارف کرایا۔ ۱۹۳۰ء میں ڈوگرہ راج کے خلاف جو تحریک چلی اس میں بھی تب کے میر واعظ نے بھرپور حصہ لیا جو میرے والد کے چچا تھے۔ وہ پھر آزاد کشمیر چلے گئے اور وہاں کے صدر بھی رہے۔

۱۹۶۸ء میں میرے والد مولوی فاروق میر واعظ بنائے گئے جنھیں مئی ۱۹۹۰ء میں شہید کر دیا گیا۔ ان کے قاتلوں کا آج تک پتا نہیں چل سکا۔ بھارتی گورنمنٹ کہتی ہے کہ کوئی دہشت گرد گروپ قتل کا ذمہ دار ہے۔ کچھ لوگ اس کا ذمہ دار بھارتی حکومت کو ٹھہراتے ہیں۔ بہرحال قاتلوں کا پتا نہیں چل سکا اور نہ ہی کسی گروپ نے اس کی ذمہ داری قبول کی۔ ان کے بعد ۱۷ سال کی عمر میں مجھے تیسواں میر واعظ بنایا گیا۔ یہ ایک مذہبی ذمہ داری ہے اور آج تک اس حوالے سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔

جامع مسجد سری نگر میں سب سے بڑا جمعہ کا اجتماع ہوتا ہے۔ میں اس میں خطبہ دیتا ہوں۔ البتہ نماز نہیں پڑھاتا۔ اس کے لیے ہمارے ایک امام صاحب مقرر ہیں۔ رمضان المبارک میں اجتماعات ہوتے ہیں۔ جب حریت کانفرنس وجود میں آئی تو اس کی تشکیل میں بھی ہمارا کلیدی کردار رہا۔ اللہ کا فضل ہے کہ معاشرے میں ہمارے خاندان کی عزت ہے۔ باقی معاشرے کے مسائل وہی ہیں جو دیگر معاشروں میں ملتے ہیں۔

میری تعلیم سری نگر میں ہوئی۔ میٹرک برن ہال اسکول سے کیا۔ اس کے بعد کشمیر کے حالات ایسے نہ تھے کہ فرد اعلیٰ تعلیم باہر جاسکتا۔ چنانچہ تعلیم نجی طور پر جاری رکھی۔ کشمیر یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ میرا مقالہ اسلامی صوفی ازم پر شاہ ہمدان کے حوالے سے تھا۔

شاہ ہمدان نے کشمیر میں جو آرٹ اور کرافٹ (صنعت و حرفت) متعارف کروائی اسی کی وجہ سے یہاں کے بھی لوگ برسرروزگار ہوئے۔ بدقسمتی سے کشمیری ہنر آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں۔ اب ہم ایک ادارہ بنا رہے ہیں جو کشمیری نوجوانوں کو مختلف ہنروں کی طرف راغب کرے گا تاکہ وہ اپنی تہذیب و ثقافت کی طرف واپس پلٹ سکیں۔ شاہ ہمدان کی تبلیغی مساعی میں کامیابی کی کلید لوگوں کو روزگار کی طرف لانا ہی تھا۔ آج کل مسلم دنیا کی تبلیغی جماعتیں اس طرح سے کام نہیں کر رہیں۔ انقلاب کے لیے صرف نعرے کام نہیں کرتے بلکہ لوگوں کی معاشی حالت کو بہتر بنانا بھی بہت اہم ہے۔ جب لوگوں کے پاس گھر میں کھانا نہیں ہوگا تو وہ تحریک کیسے چلا سکیں گے۔

اس موقع پر دل چاہا کہ عمر فاروق کے خاندان کے بارے میں بھی معلومات لی جائیں اور میں نے پوچھ لیا کہ آپ کا خاندان اسی گھر میں مقیم ہے؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جی ہاں وہ کہنے لگے میں ادھر ہی رہتا ہے۔ میری دو بیٹیاں ہیں: مریم اور زینب۔

میں نے پھر اگلا سوال کیا: نریندر مودی حکومت کی زیادہ توجہ وادی کے بجائے جموں اور لداخ پر مرکوز ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

وہ بولے اس کی اصل وجہ ہندو ووٹر ہیں۔ مودی چونکہ ہندوتوا کا نعرہ لگا کر اقتدار میں آیا اس لیے ہندو اکثریت کے علاقوں پر توجہ دے رہا ہے۔ لیکن جیسے جیسے معاملات آگے بڑھتے بھارتی سیکولر امیج کو بچانے کے لیے وہ دیگر علاقوں پر بھی توجہ دیں گے۔ یہاں کے لوگ جموں و کشمیر کے حصے بخرے کرنے پر خوش نہیں ہوں گے۔ وہ نہیں چاہتے کہ لداخ کو علیحدہ کر دیا جائے، جموں کو علیحدہ اور وادی کو علیحدہ۔ کشمیر میں ہندو، مسلمان، بدھ اور سکھ اکٹھے بڑی رواداری سے رہ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے کچھ ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے بعض کشمیری پنڈتوں کو یہاں سے جانا پڑا۔ لیکن اس معاملے میں سیاست زیادہ ہوئی۔ لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ بلکہ حکومت کچھ پنڈت خاندانوں کو واپس بھی لائی ہے۔

اب میں نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا: آپ کا کہنا ہے کہ کشمیریوں کو بھارت پر اعتماد نہیں۔ تو کیا کشمیریوں کو دیگر علاقوں میں مقیم مسلمانوں پر بھی اعتماد نہیں ہے؟

وہ گویا ہوئے: اصل میں بھارت اور پاکستان کی تقسیم ہوئی تو اس دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات نے جنم لیا۔ لیکن کشمیر کو ہم بطور سیاسی مسئلہ لیتے ہیں۔ میرواعظ کی حیثیت سے میں نے کبھی جمعے کے خطبے میں یہ نہیں کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی لڑائی ہو جائے۔ میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے اور اسے سیاسی طور پر ہی حل کرنا ہے۔ بدقسمتی سے ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر کے حوالے سے بھارتی حکومتوں نے جو پالیسیاں بنائیں وہ ہمارے حق میں نہ تھیں۔ مثلاً ہمارا اپنا ایک آئین تھا ہم خودمختار حکومت رکھتے تھے ہمارا اپنا صدر ریاست اور وزیراعظم تھا...... بھارتی حکمران طبقے نے آہستہ آہستہ سب کچھ ختم کیا اور کشمیر کو جبراً بھارت میں ضم کر دیا۔

بھارت اور کشمیر کے درمیان جو نام نہاد الحاق بھی ہوا تو وہ صرف تین چار چیزوں پر تھا۔ جیسے دفاع، خارجہ امور وغیرہ۔ لیکن انھوں نے آہستہ آہستہ یہ سب کچھ ختم کر دیا۔ اب لوگوں کے اندر یہ خوف ہے کہ آر ایس ایس کی حکومت بھارتی آئین میں دیے گئے کشمیر کے خصوصی اسٹیٹس کو ختم نہ کر دے۔ اگرچہ ان کے لیے ایسا کرنا بہت مشکل ہے لیکن وہ اس پر سیاست تو کر رہے ہیں۔ اس لیے کشمیریوں میں تحفظات پائے جاتے ہیں۔ یوں معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔ اگر مودی سرکار کوئی مثبت قدم اٹھائے تو لوگوں کے اندر اعتماد بحال کرنا ممکن ہے۔

اب ہماری ملاقات اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چناں چہ آخری سوال کیا: پاکستانیوں کے لیے آپ کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

میرواعظ غمگین لہجے میں بولے: اس وقت پاکستان کے حالات پر ہمیں بہت زیادہ تشویش ہے۔ پاکستان میں جو دہشت گردی ہو رہی ہے بہت افسوس ناک ہے۔ پاکستان اسلام کا ایک مضبوط قلعہ ہے۔ اب جو عراق اور شام میں ہو رہا ہے ایسے واقعات سے کئی منفی اثرات سامنے آ رہے ہیں۔ اگرچہ پاکستان کے حالات اب پہلے سے بہتر ہیں۔ پاکستان میں حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں مگر پاکستانی عوام ہمیشہ بے لوث اور خلوص دل سے ہماری حمایت کرتے رہے، یہ بڑی بات ہے۔ مسئلہ کشمیر کا کوئی بھی حل نکلے پاکستانی بھائی ہمارے ساتھ ہیں۔ بہرحال

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھارت اور پاکستان کے حالات اور تعلقات اچھے ہونے چاہئیں۔ ان کا مشترکہ ماضی اور تاریخ ہے، وہ ختم نہیں ہونی چاہیے۔ لوگوں کو آپس میں ملنا چاہیے۔ ویزہ کے معاملات آسان ہونے چاہئیں۔ تجارت کو مزید بڑھایا جائے۔ دس چیدہ اشیا کے بجائے مزید چیزوں کو بھی تجارتی فہرست میں شامل کیا جائے تو اس سے بہتر اثرات مرتب ہوں گے۔

وقت اس تیزی سے گزرا کہ اندازہ ہی نہیں ہوا۔ قریباً دو گھنٹے گزر چکے۔ گفتگو اتنی دلچسپ اور معلوماتی تھی کہ بیگم اور بھائی جان بہت خوش رہیں اور انھیں تنہائی یا اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ آخر میں ہم نے پاکستانی لٹھے کا کپڑا بطور خاص انھیں تحفتاً پیش کیا اور تاکید کی کہ وہ اسے سلوا کر ضرور پہنیں یہ انھیں پاکستانیوں کی ان سے محبت کی یاد دلاتا رہے گا۔

مقبوضہ کشمیر کے اہم شہر اور مقامات کی سیر مثلاً پہلگام، گلمرگ، اننت ناگ، اسلام آباد اور سری نگر کے دورے، کاروباری و ادبی کشمیری شخصیات سے ملاقاتوں اور شادی کی ایک بڑی تقریب میں شرکت کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آنے والے دنوں یا برسوں میں مسئلہ کشمیر بہت اہمیت اختیار کر جائے گا۔ نریندر مودی کے حالیہ دنوں میں کشمیر کے کئی دورے، خارجہ سیکرٹری کی سطح پر مذاکرات کا تعطل، متنازع بیانات، اربوں روپے کی لاگت کے کئی منصوبوں کا آغاز اور افواج کے مابین سرحدی جھڑپیں اس بات کا ثبوت ہیں۔

از دفتر [illegible]

[illegible] 2014-15

[illegible] 2014-15 [illegible] 16-9-14 [illegible]

[illegible] 16-9-14 [illegible]

[illegible] 15 [illegible] 2002 [illegible] 5% [illegible]

[illegible]

[illegible] 150 [illegible]

[illegible]

1 [illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	3667/-	35-05-15-01-03-14	73,333/-	
2	[illegible]	100049/-	0	2000355/-	

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

PROVINCIAL HIGHWAY DIVISION MIANWALI

AUCTION NOTICE OF TOLL TAX

Sealed tenders / bids for award of contract rights of toll collection at the following road for the period from 16.09.2014 to 30.06.2015 for (288 days) will be received on date/time mentioned below, by the Auction Committee in the office of the Commissioner Sargodha Division Sargodha and will be opened immediately thereafter in the presence of the auctioneers who may care to be present.

Last date of issue of Auction Bid : 16 08.09.2014

Date of received/Opening of Auction BID = 17 09.09.2014 (01:00 PM)

Sr. No.	Name of Toll Plaza	Reserve Price / Earnest Money	Tender Fee in shape of C.D.R from any Scheduled Bank of Pakistan in favour of the Executive Engineer, Provincial Highway Division Mianwali.
1	Collection of Toll Tax at Mianwali Muzaffargarh Road (Section Mianwali to Asif Bridge) District Mianwali & Bhakkar for the period from 16-09-2014 to 30-06-2015 for 288 days	Rs 96.398 (M) / Rs 4.820 (M)	Rs 78200/-

1. Bid documents will be issued to only those firms who will attend the office of the undersigned, read the terms and conditions of the agreement including additional conditions, furnish their duly authenticate signatures along with power of attorney in case of the firm and 5% earnest money shape of call deposit by any of the Scheduled Bank of Pakistan in favor of the Executive Engineer Provincial Highway Division Mianwali respectively at the time of collection of tender documents and on production of authenticated signatures, NIC, NTN (National Tax Number) and power of Attorney in case of firm.

2. Tender / Bid documents can be obtained from the Divisional Head Clerk of the office of the undersigned during office hours upto 08.09.2014. 16-9

3. The bid amount will be the net amount payable by the Lessee to the Government in 09 equal installments alongwith 10% income tax in advance with each installment.

4. All expenses on the provision, operation and maintenance of all facilities mentioned in the bid documents will be borne by the Lessee and no deduction from the bid amount will be admissible.

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

5. The bidder shall sign each and every page of the tender documents and initial all the corrections therein and shall be bound in all respects to the conditions laid down therein.

6. Conditional tenders shall not be entertained.

7. Acceptance of the highest bid shall rest with the Chief Engineer (North), Punjab Highway Department Lahore who reserves the right to reject the same without assigning any reason thereof.

8. Documents and other terms and conditions pertaining to the bid can be seen in the office of the undersigned on any working day during office hours

9. Auction of Toll Plaza bid will be received & opened in the Commissioner office Sargodha on **09.09.2014 at 01:00 PM.** 11-9

VEHICLE WHICH ARE EXEMPTED FOR PAYMENT OF TOLL.

a) Vehicles bearing the plates of Presidency, Prime Minister's Secretariats Governor's House and Chief Minister's Secretariats.

b) Vehicles belonging to Senators, Members of National Assembly and Members of Punjab Assembly

c) Flag Cars.

d) Vehicles belonging to Defense Forces or Vehicles requisitioned for Defense duty/PAEC.

e) Police Petrol Vehicles

f) Vehicles belonging to Officers of Communications and Works Department

g) Ambulances of the Health Department, Social Security/Red Crescent Society.

Note: In case non issued/receipt of Bid the same will be issued on 10.09.2014 and received on 14.09.2014.

12-9 15-9

Executive Engineer
Provincial Highway Division
Mianwali

Superintending Engineer
Provincial Highway Circle
Sargodha

IPL-10778

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

زیادہ جوان جنگ میں شہید نہیں ہوئے تھے جتنے اس کے۔ شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پورے پاکستان میں کسی گاؤں کے اتنے لوگ فوج میں بھرتی نہیں تھے جس قدر اس کے۔ انگریزوں کے وقت سے لے کر اب تک نور پور کے جیالوں نے عسکری خدمات کے عوض بے شمار تمغے اور انعام حاصل کیے تھے۔ فوجی جوانوں سے لے کر بڑے افسروں تک میں گاؤں کے سپاہیوں کی شجاعت اور جاں نثاری کا چرچا تھا۔

جنگ کے دنوں میں جب یکے بعد دیگرے چھتیس جوانوں اور پانچ کمیشنڈ افسروں کی لاشیں فوجی اعزاز کے ساتھ نور پور پہنچیں تو امام مسجد مولوی عبداللہ نے میجر نواز شہید کو دفن کرتے ہوئے کہا ”آج سے ہم اس گاؤں کو شہید آباد کہیں گے۔“ اور اس دن سے نور پور کا نام شہید آباد پڑ گیا۔ یہ سارے شہید گاؤں کے باہر اسی بوڑھے برگد کے نیچے جہاں جنگ کے دنوں میں بہت سی خندقیں کھودی گئی تھیں، انہی خندقوں میں دفن کر دیے گئے۔ گاؤں کے سبھی لوگ ہر سال چھ ستمبر کو ان شہیدوں کی قبروں پر آتے، پھول چڑھاتے اور فاتحہ پڑھتے۔ یہ باتیں کرتے اور ان شہیدوں کی بہادری و جوانمردی کے واقعات دہراتے جاتے۔

آج چھ ستمبر کی صبح تھی۔ لوگ شہید آباد کے باہر برگد تلے واقع شہیدوں کے اس چھوٹے سے قبرستان میں جمع ہو رہے تھے۔ ہر گھر اور خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد ۱۵ء کی جنگ میں ضرور شہید ہوا تھا۔ قبروں کی لمبی قطار تھی۔ کتبوں پر بہت سے نام کندہ تھے اور ان کے پیچھے بہت سی شجاعت کی اور ان کی کہانیاں تھیں۔ گرجتے ہوئے ٹینک، پھٹتے ہوئے گولے، دندناتی ہوئی رائفلیں، دھواں اور دھماکے۔ چیخیں اور کراہیں، کئی باتیں اور پیٹ سے باہر نکلی ہوئی آنتیں! یہ سب لوگ کیسے اور کن حالات میں شہید ہوئے۔ آخری ساعتوں میں انھوں نے کیا سوچا اور ان کی آنکھوں میں کس کس کی صورتیں گھومیں... گاؤں کے لوگ ان سے بے خبر تھے۔ انھیں ان کی شہادت کے لمحوں کی کچھ ادھوری یادیں، مبہم اور نامکمل واقعات کا علم تھا۔

یہ میجر نواز شہید کی قبر تھی جو ٹیلہ چھینتے ہوئے شہید ہوا۔ یہ کرنل عابد تھا جس کی جیپ بارودی سرنگ کے اوپر سے گزرتے ہوئے دھماکے کے باعث تباہ ہو گئی۔ اس کے سر کا پچھلا حصہ اڑ گیا اور وہ زخموں کی تاب نہ لا کر اسپتال میں شہید ہوا۔ میجر کیپٹن مشتاق شہید، لانس نائیک امام علی اور غلام رسول اور بہت سی قبریں۔ آخر میں حوالدار افضل شہید کے قریب لانس نائیک برکت مسیح کی قبر تھی، عنایت کے بھائی کی!

جوں جوں دھوپ پھیلی قبروں کے گرد لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ گاؤں کے اسکول کا خاکروب عنایت بھائی کی قبر کے پاس سر جھکائے خاموش کھڑا ماضی کی وہ گھڑیاں یاد کر رہا تھا جب لوگ برکت کو قبر میں اتار رہے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ نمبردار اور حمید چوہدری نے برکت کو مسلمان شہیدوں کے ساتھ دفن کرنے کی مخالفت کی تھی۔ مگر مولوی عبداللہ نے انھیں سختی سے ڈانٹا اور کہا ”یہ ہمارا ہی بھائی تھا، ہم میں سے ایک۔ اس نے اپنی کسی غرض نہیں ہمارے لیے اپنی جان کی قربانی دی۔ یہ دشمن کے ساتھ شانہ بشانہ لڑتا ہوا شہید ہوا۔ انہی کے ساتھ اس کی قبر بنے گی۔“ چنانچہ برکت کو افضل شہید کے پہلو والی خندق میں دفن کر دیا گیا۔

کچھ دیر بعد اسکول سے لاؤڈ اسپیکر پر تلاوت کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

آواز بلند ہوئی۔ لوگ اسکول کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسکول میں شہدا کی یاد میں جلسے کا آغاز ہو چکا تھا۔ صبح سویرے برگد تلے شہیدوں کے قبرستان جانا اور پھر دن چڑھے اسکول والے جلسے میں شرکت آج کے دن کی روایت بن چکی تھی۔

عنایت اسکول پہنچا تو وہاں مولوی عبداللہ کی تقریر جاری تھی۔ صحن میں دریوں اور ٹاٹوں پر لوگ براجمان تھے۔ اسٹیج پر ہیڈ ماسٹر کے پاس سبکدوش کرنل احمد علی دوسرے استاد اور کچھ طالب علم بیٹھے تھے۔ اسٹیج کے اوپر "شہیدو تم کو میرا سلام، شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے" اور کئی رزمیہ شعروں کے بینر لگائے گئے تھے۔ مولوی عبداللہ کی آواز گونج رہی تھی:

"ہم ان شہیدوں کو سلام کرتے ہیں جنھوں نے ہمارے کل کے لیے اپنا آج قربان کر دیا۔ جنھوں نے ملک و قوم کی عزت و حرمت کے لیے اپنی جان کا نذرانہ دے کر ایثار و قربانی کی یادگار مثالیں قائم کیں۔ ہمیں بھی ان شہیدوں کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔ دلوں میں ان کی تمنائیں روشن اور ذہنوں میں یادیں تازہ رکھنا چاہئیں...... ولولہ و عزم کی وہ شمعیں اپنے سینوں کے اندر منور رکھنی چاہئیں جو شہیدوں نے اپنے خون سے روشن کی تھیں۔ ولولہ جوان رہنا چاہیے اور عزم زندہ..."

مولوی عبداللہ امام مسجد کے ساتھ ساتھ اسکول میں اسلامیات کا استاد بھی تھا۔ عنایت نے اس کی کئی تقریریں سنی تھیں۔ ۱۴ اگست کا جلسہ ہو یا ۲۱ اپریل کا...... ۲۳ مارچ ہو یا ۶ ستمبر...... مولوی عبداللہ ہر قومی دن پر عمدہ تقریر کرتا۔ خاص طور پر ہر تقریر میں بار بار "ولولہ جوان رہنا چاہیے اور عزم زندہ" ایسے ہی فقرے دہراتا۔ ستمبر ۶۵ء کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے اور گاؤں کے کچھ جیالے شہیدوں کے روح پرور واقعات سنانے کے بعد انھوں نے موجودہ بے حسی اور بے عملی کا ماتم کیا۔ لوگوں کو اپنا محاسبہ کرنے کا کہا اور عزم اور حوصلہ بیدار رکھنے کی اہمیت پر زور دیا۔ بچی کھچی قدروں کا یہ پرستار موقع بے موقع گاؤں کے لوگوں سے اسی طرح کی باتیں کرتا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ گاؤں کے بچوں اور جوانوں

مقصد سے دلچسپی

قائداعظم کی ظاہری سرد مہری اور سخت گیری بے وجہ نہیں تھی۔ انسان ایک وقت میں ایک ہی چیز سے محبت کر سکتا ہے۔ عام لوگ اپنی اور دوسروں کی ذات میں دلچسپی رکھتے اور ان سے جذباتی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن کچھ غیر معمولی عظیم لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی عظیم نصب العین یا بلند مقصد سے اپنی تمام دلچسپی اور جذباتی و ذہنی زندگی مربوط کر دیتے ہیں۔ ان کی محبت، نفرت جینا مرنا اسی مقصد کے حوالے سے ہوتا ہے۔ ان کی توجہ کا مکمل ارتکاز ایک نقطے پر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے سطحی نظر کو وہ غیر جذباتی نظر آتے ہیں۔ قائداعظم کی تمام جذباتی ذہنی قوتیں قومی مشن میں اس طرح جذب ہو گئی تھیں کہ ان کے ذاتی احساسات اور جذبات نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی۔ اصولوں سے انحراف تو وہ نہ بیوی کی چاہت کے لیے کر سکتے تھے نہ بیٹی کی محبت کے لیے دوسرے تو دور کی بات تھے۔ (محمد احسن کمال یوسفی، واہ کینٹ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں وہ جذبہ منتقل نہیں ہو رہا جو بچوں میں تھا۔

عنایت اسکول کے صحن کی کچی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا مولوی عبداللہ کی تقریر سن رہا تھا۔ "یہ ملک ہمارا اپنا ہے، ہم سب کا گھر۔ اسے ہم نے سنوارنا ہے۔ اس کی حفاظت ہمیں نے مل جل کر کرنی ہے۔ یہ بچے تو ہم بھی ہیں..... اور ولولہ جواں رہنا چاہیے اور عزم زندہ....."

عنایت کے کان مولوی عبداللہ کی آواز پر لگے تھے۔ آنکھیں سامنے والی سڑک کی دوسری طرف شہتوت کے درخت تلے گندگی کے ایک ڈھیر پر تھیں جہاں دوران جنگ بڑی سی خندق کھودی گئی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے کچھ سال بعد تک وہ خندق یونہی رہی۔ پھر محلوں کی عورتیں گھروں کا کوڑا کرکٹ اس میں پھینکنے لگیں۔ یوں خندق کوڑے کرکٹ سے اٹی پڑی ہے کہ گویا کبھی تھی ہی نہیں! عنایت بھی سستی دکھانے لگا۔ اسکول کی صفائی کے بعد کچرا سے باہر پڑے کونڈوں کے پاس کوڑا کرکٹ پھینکنے کے بجائے اسی خندق پر اپنا کوڑا ڈالا جاتا۔ آٹھویں دن بعد ٹاؤن کمیٹی والوں کی گاڑی آتی اور گندگی کا ڈھیر اٹھا لے جاتی۔

عنایت کو اس لمحے یوں لگا جیسے یہ خندق وہ خود ہے۔ کوڑا کرکٹ اور گندگی سے پٹی ہوئی جس میں اب تازہ ہوا اور روشنی کا گزر نہیں اور جو سر تک غلاظت کے ڈھیر میں دفن ہے۔ اسے اپنے آپ سے کراہت آتی محسوس ہوئی۔ "تم لوگوں نے کبھی اپنا محاسبہ کیا؟" اسے مولوی عبداللہ کی آواز سنائی دی۔ "وطن کے لیے تم کیا کرتے ہو؟ یہ زمین جس کا اناج تم کھاتے ہو اور جس کی ہوا میں تم سانس لیتے ہو تم نے اس کے لیے کیا کیا؟"

عنایت کو یوں لگا جیسے اس کے کانوں پر کوڑے برس رہے ہوں۔ "میں نے اب تک اس ملک کے لیے کیا کیا ہے؟" احتساب کے اس ایک لمحے اس نے کئی باتیں سوچیں۔ "میرا کام صفائی کرنا ہے، جھاڑو دینا، ٹاٹ بچھانا اور لپیٹنا..... اور تو یہ کام خوش اسلوبی سے کر رہا ہے۔" اندر سے آواز آئی۔ "واقعی یہ کام تو میں بچپن سے کر رہا ہوں اور میں نے اس کام کو کبھی بوجھ نہیں سمجھا۔ اس کام میں خوشی محسوس کی ہے۔ اس کے علاوہ تو میں کر بھی کیا سکتا ہوں؟" وہ دیر تک اپنے آپ کو تسلی دیتا رہا اور مطمئن سا ہو گیا۔

وہ بارہ سال کا تھا جب اسکول میں آیا۔ اب اسکول کے برآمدوں اور کمروں کی صفائی کرتے اسے تیس برس بیت گئے۔ وہ جب یہاں آیا تو اسکول کے صرف تین کمرے تھے اب وہ بارہ ہو چکے تھے۔ پرائمری اسکول سے یہ اسکول مڈل اور پھر ہائی ہو گیا۔ طالب علم سو سوا سو سے چار سو ہو گئے مگر عنایت کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ آیا۔ وہ اکیلا صبح سے شام تک اسکول میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کام میں بغیر تھکے والی مشین کی طرح مصروف رہتا۔ کمرے اور برآمدے صاف کرتا، ٹاٹ بچھاتا اور لپیٹتا، صحن سے پھٹے کاغذوں کے ٹکڑے چن چن اکٹھے کرتا۔ ان کاموں کے علاوہ وہ چپڑاسی اور مالی کا ہاتھ بٹاتا۔

وہ اسکول کی ڈاک بچوں کے ڈاک خانے سے لاتا، گملوں میں پانی ڈالتا اور کبھی کام کی زیادتی کا شکوہ نہ کرتا۔ ٹاٹ کی رسیوں سے بندھے ٹاٹ لپیٹے کھولتے اور کمروں میں اٹھاتے ہوئے شروع شروع میں اسے تکلیف ہوتی تھی۔ ہاتھ اور گردن پر ٹاٹ کے کھردرے ریشے چبھتے تو وہ بلبلا اٹھتا مگر اب وہ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تکلیف کا عادی ہو گیا تھا۔

مولوی عبداللہ کی تقریر کے بعد دو طالب علموں نے ایک ترانہ سنایا۔ پھر کرنل احمد علی نے گاؤں کے شہیدوں کے کچھ واقعات بیان کیے۔ ہیڈ ماسٹر کی مختصر سی تقریر کے بعد دو بجے جلسہ ختم ہوا۔ لوگ چلے گئے تو عنایت نے ایک ایک کر کے دریاں اکٹھی کیں اور انھیں کمروں میں لے جا بچھایا۔ پھر ایک ایک کر کے ٹاٹ لپیٹے اور انھیں برآمدے میں رکھا۔ ٹاٹ لپیٹتے ہوئے اُسے عجیب سکون محسوس ہوتا جیسے کسی کام کی تکمیل پر قرار اور اطمینان کا احساس ہو۔ یوں لگتا جیسے وہ اپنے بکھرے وجود کو سمیٹ رہا ہو۔

ٹاٹ لپیٹتے ہوئے اسے اپنا آپ محفوظ لگتا۔ صبح اسکول کے برآمدے اور صحن میں ٹاٹ بچھاتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ خود کو منتشر کر رہا ہو۔ اپنا اندر کھول کر باہر دنیا کے سامنے پھیلا رہا ہو۔ دوپہر تک جب تک اسکول میں چھٹی کی گھنٹی نہیں بج جاتی اور لڑکے اپنے گھروں کو نہ چل دیتے اسے عجیب بے چینی سی رہتی۔ ایک خدشہ سا جیسے وہ اپنی عمر بھر کی پونجی کسی کھلی سڑک پر رکھ آیا ہو۔ اسے یہ خطرہ رہتا جیسے اس کے کھلے وجود کو روندا جا رہا ہے۔ کسی لمحے بھی اس کا کوئی حصہ کاٹا جا سکتا ہے......

ٹاٹ لپیٹ کر برآمدے میں رکھنے کے بعد عنایت اپنے گھر کی طرف چلا تو تین بج رہے تھے۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ صبح منہ اندھیرے اٹھتے ہی وہ جلسے کا انتظام کرنے چلا گیا تھا۔ وہیں سے وہ بوڑھے برگد کے نیچے بھائی کی قبر پر جا پہنچا۔ دو چھوٹے کمروں پر مشتمل گھر میں آتے ہی اس نے رات کے بچے سالن کو چولھے پر رکھا۔ آٹا گوندھا۔ دو تین روٹیاں پکائیں اور کھانا کھا چارپائی پر لیٹ گیا۔ اسے طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ ''ولولہ جوان رہنا چاہیے اور عزم زندہ''..... مولوی عبداللہ کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

مگر کیسا ولولہ کیسا عزم؟ اسے اپنے سینے پر بوجھ محسوس ہوا۔ اس نے کئی دفعہ یہ لفظ مولوی صاحب کے منہ سے سنے تھے مگر اسے سمجھ نہیں آئی کہ ان لفظوں کا مطلب کیا ہے۔ البتہ وہ یہ ضرور سمجھتا تھا کہ آدمی کو کچھ نہ کرنا ضرور چاہیے۔ ایسی باتیں سن کر اس کے اندر جوش پیدا ہوتا۔ مگر وہ کچھ نہ کر سکنے کی بے چارگی دیکھ کر سرد پڑ جاتا۔ اسے سمجھ نہ آتی کہ وہ کیا کرے۔

''میں صفائی کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہوں؟'' اس نے سوچنا شروع کیا۔ ''میں ایک معمولی آدمی ہوں۔ نہ میرے پاس دولت نہ تعلیم۔ میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں؟ لیکن اگر مجھے یہی کچھ کرنا ہے جو کچھ میں کر رہا ہوں تو بے چینی سی کیوں ہے؟ میرے سینے پر یہ پہاڑ سا کیا ہے؟'' وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنا آپ ایک غلیظ خندق سا لگا...... یہ غلاظت جو جسم میں بھری ہے یہ زنگ جو دل پر لگا ہے دور ہونا چاہیے۔ خندق کو صاف ہونا چاہیے۔ اس کے کانوں میں مولوی عبداللہ کی آواز آئی ''شہیدوں کی نشانیاں روشن رہنی چاہئیں۔'' اور پھر اسے اسکول کے سامنے والی سڑک پر شہتوت کے درخت تلے گندگی سے بھری خندق یاد آئی.. یہ خندقیں بھی تو شہیدوں کی نشانیاں ہیں۔

بھائی برکت کی شکل اس کی آنکھوں میں گھوم گئی جسے دشمنوں نے مورچے کے اندر چند گرنیڈ پھینک کر شہید کر دیا تھا اور وہ خندق .. بابا گاؤں میں اس کی قبر بن گئی تھی۔ وہاں سے اس کی شہید لاش آئی تو بوڑھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

برگد کے نیچے اسے ایک خندق ہی میں دفن کر دیا گیا۔ عنایت کو اپنے سینے پر گرم پتھر بندھے محسوس ہوئے۔ یوں لگا جیسے اس نے اپنے بھائی کی قبر خود کوڑا کرکٹ سے بھردی ہو۔

مولوی عبداللہ کی آواز پھر کانوں میں آئی ”جو اپنے فرائض خوش اسلوبی اور دیانتداری سے ادا کریں ان کی قبریں کشادہ ہوتی ہیں اور ان سے مہک آتی ہے۔“ اس نے سوچا اپنا کام تو میں دیانتداری سے کرتا ہوں مگر ساری عمر کوڑا کرکٹ اٹھانے والے کے جسم سے مہک کیسے آسکتی ہے؟ اس لئے اسے بھائی برکت پھر یاد آیا۔ اسے دفن کرتے وقت اس کے بدن سے عجیب مہک آرہی تھی..... مگر وہ تو فوج میں تھا وطن کے کام آیا۔ ٹاٹ بچھانے اور لپیٹنے والے کی قبر کیا کشادہ ہوگی؟

اسے جنگ کے دن یاد آئے جب گاؤں میں جگہ جگہ خندقیں کھودی جا رہی تھیں۔ بوڑھے برگد کے نیچے بہت سے لوگ خندق کھود رہے تھے۔ سبھی لوگوں میں جوش اور ولولہ بھرا ہوا تھا۔ خود اس نے اسکول کے سامنے والی خندق تنہا کھودی تھی۔ دوران جنگ جب خطرے کا سائرن بجتا تو وہ اسکول کے کئی لڑکوں کے ساتھ خندق میں بیٹھ جاتا۔ ان ساعتوں میں ولولہ انگیز خدشہ سا بھی ہوتا..... ایک عجیب جذبہ جس نے گاؤں کے سب لوگوں کو یک جان کر دیا تھا۔ مگر اب اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل دھڑکنا چھوڑ چکا۔ جذبوں کو سے مہری کھا گئی اور ولولوں کے چشمے وہ جگہ گاہیں گندگی کا ڈھیر بن چکیں۔

وہ بے کل ہو کر چارپائی سے اٹھا۔ اپنی کدال اور ٹوکرا اٹھایا اور گھر کا دروازہ بند کیے بغیر بھاگ کر گلی میں آ گیا۔ اس وقت اذان عصر کی آواز گونج رہی تھی۔ ”آؤ فلاح کی طرف“..... وہ سیدھا اسکول کی جانب چل پڑا۔ چھ سات گھروں کے بعد دائیں طرف اور پھر قریباً اتنے ہی گھروں کے پاس سے ہو کر گاؤں کے بیچ سے سیدھی جاتی سڑک پر آ گیا۔ پھر تیزی سے شہتوت کے نیچے پڑے گندگی کے ڈھیر کی طرف لپکا اور کدال بھر بھر کر وہ کوڑا کرکٹ ٹوکرے میں ڈالنے لگا۔ چشم زدن میں ٹوکرا بھرتا اسے سر پر اٹھا گاؤں کے باہر جاکے کنوئیں پہ پھینک آتا۔

اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ گندگی کے نیچے پڑی بھائی کی لاش کے سینے سے بوجھ ہلکا کر رہا ہو! جیسے اپنے آپ کو گندگی کی قید سے رہا کر رہا ہو! ہر کدال کے ساتھ لمحہ لمحہ اسے اپنا اندر کشادہ ہوتا محسوس ہوا۔ تھوڑی دیر بعد کوڑے کا ڈھیر زمین کے برابر آگیا تو اسے اپنی چھاتی سے اذیت کا پہاڑ سرکتا محسوس ہوا۔

اب وہ خندق کے اندر اتر رہا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد خندق اپنی پہلی حالت میں آ گئی۔ وہ اس کے اندر بیٹھی ہوئی باریک مٹی ہاتھ بھر بھر کر ٹوکرے میں ڈال رہا تھا۔ پسینے سے اس کا جسم تر تھا مگر اسے یوں لگا جیسے اس کے اندر بہت سوں کے بند غنچے کھل گئے ہیں۔ اسے اپنا آپ تازہ ہوا اور نئی دھوپ میں نہایا ہوا محسوس ہوا۔ اسے اپنے پسینے سے ویسی ہی مہک آرہی تھی جیسی برکت کے جسد خاکی سے آتی تھی۔

اسی لئے اس نے اپنے رگ و پے میں جوش کی وہ لہر سرایت محسوس کی جو جنگ کے دنوں میں خندق کھودتے، خطرے کا سائرن سنتے اور خندقوں میں بیٹھے محسوس ہوتی تھی۔ ضبط اور جوش کی ایک عجیب ملی جلی سی کیفیت! ”مولوی عبداللہ ایسی ہی کسی کیفیت کو عزم یا ولولہ کا نام دیتا ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”بہرحال یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیفیت ہے اطمینان بخش!“ اس نے اقرار کیا۔ ”میں اس خندق کو...... بھائی کی قبر کو بھی کبھی ختم نہیں ہونے دوں گا۔ میں اس کیفیت کو اپنے اندر زندہ رکھوں گا۔ اس جذبے کو مرنے نہیں دوں گا۔“

اس نے خندق سے آخری ٹوکرا نکالتے ہوئے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ جب مسجد سے اذانِ عشا بلند ہو رہی تھی اگرچہ دوہری رات کے اندھیرے میں مٹی کا ٹوکرا اٹھائے کنوئیں کی طرف جاتے ہوئے اس نے اپنے اندر عجیب روشنی تحلیل دیکھی...... اب وہ اپنے وجود کے اندر دور دور تک اطمینان محسوس کر رہا تھا۔

بوڑھے برگد کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے برکت کی قبر کی طرف دیکھا اسے قبر واضح طور پر دکھائی تو دی۔ البتہ کتبہ ایک مدہوم سفید دھبے کی صورت پل بھر کے لیے نظر آیا۔ اسے اپنے بھائی کی قربت مزید کشیدہ ہوتی اور بھنچی محسوس ہوئی۔ ”شہیدوں کی نشانیاں روشن ہیں“ ”ولولہ جوان ہے اور عزم زندہ...“ ان کی جاتی ہوئی شمعیں منور ہیں“ اسے اپنے اندر پراسرار آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ زندگی کے اس انتہائی اطمینان بخش لمحے میں اس نے سوچا کہ اب وہ کسی بھی وقت آرام کے ساتھ مر سکتا ہے!

◆●●

خود پروردہ ادیب

مارکیز نے گھر چھوڑا اور ایک ہوٹل کا کرایہ ادا کرنے پر رہنے لگا۔ وہ یار بیلا کے حلقہ ”ادب اور آرٹ“ سے وابستہ ہو گیا۔ اس کے گروپ میں ادب اور آرٹ کے دلدادہ نوجوان شامل تھے۔ اسی حلقہ یاراں نے اسے دنیائے ادب کے عظیم ادبا جیمز جوائس، ولیم فاکنر اور ورجینا وولف کی کہانیاں پڑھنے کو دیں۔

کولمبیا کے مشہور ناول نگار گیبریل گارسیا مارکیز نے پہلا ناول ”پتوں کا طوفان“ کے عنوان لکھا جسے خاص پذیرائی نہ ملی۔ البتہ بطور ادیب اس کو پہچان مل گئی۔ پھر اس نے صحافت میں قدم رکھا۔ تحریر بے باک انداز صحافت کی وجہ سے وہ معاشی طور پر مفلوج ہو گیا۔

مارکیز کے ساتھ یہ ماجرا بھی پیش آیا کہ اس کے پاس ہوٹل کا کرایہ ادا کرنے کو پیسے نہیں تھے۔ چناں چہ اس نے اپنے ایک ناول کا مسودہ ہوٹل منیجر کے پاس گروی رکھ دیا۔ ہوٹل کا منیجر بھی ان کاغذوں کی اہمیت سے آگاہ تھا۔

ان معاشی مسائل کے دوران مارکیز نے اپنی محبوبہ مرسیڈیز سے شادی کر لی۔ مگر گردشِ روزگار نے اس کے مصائب کو کم نہ کیا۔ معاشی مسائل کا اثر مارکیز کے دوسرے ناول ”کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا“ میں ملتا ہے۔

اس کا تیسرا ناول ”منحوس وقت“ بھی ان ایام کی سرگزشت ہے جب مارکیز ہر چیز سے مایوس ہو چکا تھا۔ تنہائی اور ویران دنیا اس کے بنیادی موضوعات ہیں۔ پھر یوں ہوا کہ مارکیز نے خود کو کمرے میں بند کر لیا اور ایک ناول لکھنے لگا۔ وہ چودہ ماہ مسلسل لکھتا رہا۔ اس کی بیوی مرسیڈیز لوگوں سے ادھار مانگ کر گھر کا خرچ چلاتی رہی۔ یہی زمانہ اس کے شاہکار ناول ”تنہائی کے سو سال“ کی تکمیل کا سبب بنا۔ اس ناول کا مرکزی کردار کرنل اورلیانو جب مرا تو مارکیز صدمے سے بستر پر گر پڑا اور مسلسل دو گھنٹے تک روتا رہا۔ اس کی کرداروں سے وابستگی جنون کی حد تک بڑھ گئی تھی۔

مارکیز کا یہی ناول اسے شہرت کی بلندیوں تک لے گیا جہاں تک پہنچنے کے لیے بڑے بڑے ادیب خواب دیکھتے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں ناول ”تنہائی کے سو سال“ کو نوبل انعام ملا۔ اب تک ناول کی تین کروڑ کاپیاں فروخت ہو چکیں جو اس کی مقبولیت کا واضح ثبوت ہے۔

(محمد ساجد)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاکستان کا پلوٹونیم بم

پاکستانی ماہرین کے عزم و عمل کی یادگار داستان جنھوں نے غیر ملکی پابندیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایٹمی منصوبے کامیابی سے مکمل کیے

سید عاصم محمود

۱۹۸۲ء کی بات ہے، جنرل ضیاالحق نے منیر احمد خان کو کام تیز کرنے کا اشارہ دے دیا۔ پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے سربراہ منیر احمد خان طویل عرصے سے صدر کو یہ قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ پاکستان کو پلوٹونیم سے بھی ایٹم بم بنانا چاہیے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ پاکستان اوائل میں پلوٹونیم کے ذریعے ہی ایٹم بم بنانا چاہتا تھا۔ جبکہ پنجاب اور سندھ میں یورینیم کی کانیں دریافت ہو چکی تھیں۔ اسی لیے پاکستان اپنے ایٹمی ری ایکٹر لگانے کی کوشش کرنے لگا جہاں خام یورینیم کو پلوٹونیم میں بدلا جا سکے۔

اس سلسلے میں پاکستانی حکومت نے کینیڈا، جرمنی اور فرانس سے معاہدے کیے۔ تاہم ۱۹۷۶ء تک ڈاکٹر عبدالقدیر خان یورینیم کے ذریعے ایٹم بم بنانے کا منصوبہ شروع کر چکے تھے۔ لہٰذا بڑی طاقتوں کو اس خفیہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاکستانی منصوبے کی بھنک پڑی تو انھوں نے ایٹمی ری ایکٹر دینے کے معاہدے منسوخ کر دیے۔

جنرل ضیاالحق برسر اقتدار آئے تو انھوں نے بیشتر وسائل کا رخ یورینیم ایٹم بم بنانے کی سمت موڑ دیا۔ تاہم پلوٹونیم بم بنانے کا منصوبہ بھی جاری رہا۔

بعض ذرائع کا دعویٰ ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان پلوٹونیم بم کا منصوبہ ختم کرنا چاہتے تھے۔ تاہم منیر احمد خان کی کوششوں سے وہ زندہ رہا۔ دیگر ذرائع کا کہنا ہے کہ منیر احمد خان افزودہ یورینیم سے ایٹم بم بنانے کو مہنگا اور طویل المعیاد منصوبہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے اپنا منصوبہ ایٹمی توانائی کمیشن سے علیحدہ کر دیا۔

پاکستانی پلوٹونیم کے ضمن میں ۱۹۸۰ء میں اہم پیش رفت ہوئی جب بلجیم کے تعاون سے ہمارے ماہرین نے ملتان میں بھاری پانی (Heavy water) تیار کرنے والا ایک پلانٹ لگا لیا۔ اس بھاری پانی پلانٹ کی تفصیل خفیہ (کلاسیفائیڈ) ہے۔ بہرحال اس پلانٹ میں سالانہ ۱۳ ٹن بھاری پانی تیار ہو سکتا ہے۔

منیر احمد خان نے ۱۹۸۰ء ہی میں نیلور (اسلام آباد) میں ایسے پلانٹ کی تعمیر شروع کرا دی جہاں ایٹمی ری ایکٹروں میں استعمال شدہ یورینیم کو پلوٹونیم میں بدلا جا سکے۔ اس پلانٹ کی تعمیر کے پروجیکٹ لیڈر مشہور ایٹمی کیمیادان چودھری عبدالمجید مقرر ہوئے۔

یہ ری پروسیسنگ پلانٹ ۱۹۸۱ء میں مکمل ہوا۔ یہ اب "نیو لیبارٹریز" کے نام سے مشہور ہے۔ قابل فخر بات یہ ہے کہ اسے پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے سائنس دانوں، انجینئروں اور ہنرمندوں نے کمال مہارت سے مکمل کیا۔ یوں انھوں نے اپنی زبردست ذہانت اور محنت کا سکہ سبھی کے دلوں پر بٹھا دیا۔

چودھری عبدالمجید ۱۹۳۷ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایٹمی کیمیا میں ایم ایس سی کیا۔ بعدازاں آپ پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۶۴ء میں کمیشن سے اسکالرشپ حاصل کر کے بلجیم چلے گئے۔ وہاں آپ نے کاتھولیک یونیورسٹی سے ایٹمی کیمیا میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔

آپ ۱۹۷۴ء میں واپس آ گئے۔ جب نیلور اسلام آباد میں نیو لیبارٹریز کی تعمیر شروع ہوئی تو آپ کو اس کا پہلا ٹیکنیکل ڈائریکٹر بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ بعدازاں آپ

پلوٹونیم

یہ ایک سخت، چاندی جیسی دھات ہے جو کرہ ارض میں بہت کم ملتی ہے۔ تاہم خالص یورینیم کو ایٹمی ری ایکٹر میں بطور ایندھن استعمال کیا جائے تو اس کا فضلہ بعدازاں پلوٹونیم میں بدلا جا سکتا ہے۔

یاد رہے خالص یورینیم سائنسی اصطلاح میں یورینیم ۲۳۸ کہلاتا ہے۔ خالص یورینیم کا ۹۹.۲۸۴ فیصد حصہ اسی پر مشتمل ہوتا ہے۔ بقیہ حصہ یورینیم ۲۳۵ کہلاتا ہے۔ یہی حصہ ایٹم بم بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر خام یورینیم سے اسے الگ کرنے کے لیے بہت محنت، پیچیدہ مشینیں اور رقم درکار ہوتی ہے۔ ایران بھی اسی راستے ایٹم بم بنا رہا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے خوشاب اور چشمہ میں اٹمی ری ایکٹر کی تیاری میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ اکیسویں صدی کے اوائل میں وفات پائی۔

کراچی میں کینوپ اٹمی ری ایکٹر ۱۹۷۲ء سے کام کر رہا تھا، مگر بین الاقوامی اٹمی توانائی کمیشن کے انسپکٹر اس کے معائنے پر مامور تھے۔ یعنی کینوپ سے استعمال شدہ یورینیم نیو لیبارٹری تک لانا ناممکن تھا۔ اس صورت میں پاکستان عالمی معاہدے توڑ ڈالتا جو یقیناً قابل قبول بات نہ تھی۔

لہٰذا فیصلہ ہوا کہ جوہر آباد (ضلع خوشاب) کے نزدیک ایسے ری ایکٹر تعمیر کیے جائیں جو بین الاقوامی توانائی کمیشن کی دسترس سے باہر ہوں۔ یوں ۱۹۸۹ء میں ''خوشاب نیوکلیئر کمپلیکس'' کی بنیاد پڑی۔ اس منصوبے کے پروجیکٹ ڈائریکٹر اٹمی انجینئر سلطان بشیر الدین بنائے گئے۔

یوں جوہر آباد میں پہلا اٹمی ری ایکٹر تعمیر ہونے لگا۔

اب دوبارہ پاکستان اٹمی توانائی کمیشن کے سائنس دانوں نے زبردست کارکردگی دکھائی اور شبانہ روز محنت کر کے ۱۹۹۶ء تک اٹمی ری ایکٹر تعمیر کر دیا۔ ۲۰۰۰ء تک اس ری ایکٹر میں استعمال شدہ اتنا یورینیم اکٹھا ہو گیا کہ نیو لیبارٹریز میں اسے ری پروسیس کر کے پلوٹونیم میں ڈھالا جا سکے۔

''خوشاب نیوکلیئر کمپلیکس'' میں اب تک تین اٹمی ری ایکٹر تعمیر ہو چکے جبکہ مزید دو پر کام جاری ہے۔ یاد رہے ۲۰۰۰ء سے ''چشمہ نیوکلیئر پاور کمپلیکس'' پر بھی کام شروع ہو گیا۔ یہ کمپلیکس بھی پانچ اٹمی ری ایکٹروں پر مشتمل ہو گا۔ تاہم پاکستانی حکومت یہاں استعمال شدہ یورینیم سے پلوٹونیم تیار نہیں کر سکتی۔ کیونکہ یہ ری ایکٹر بھی بین الاقوامی اٹمی توانائی کمیشن کے زیر معائنہ ہیں۔

ہیوی واٹر کو سمجھیے

بھاری پانی دیکھنے میں عام پانی کی طرح ہوتا ہے مگر اس میں ہائیڈروجن کے ایٹم زیادہ بھاری آئسوٹوپ ''ڈیوٹریم (Deuteruim) سے بنے ہوتے ہیں۔ نیز ان میں پروٹان کے علاوہ ایک نیوٹرون بھی موجود ہوتا ہے۔

اٹمی ریکٹر میں یہ بھاری پانی یورینیم سے تعامل (Reaction) کر کے اس سے بجلی بناتا ہے۔ لہٰذا یہ ایسے اٹمی ری ایکٹر کا لازمی جزو ہے جہاں یورینیم ۔ ۲۳۸ بطور ایندھن مستعمل ہے۔ اسی لیے پاکستان نے ''خوشاب نیوکلیئر کمپلیکس'' میں بھاری پانی بنانے والا ایک پلانٹ بھی لگایا ہے۔

تازہ رپورٹوں کے مطابق ''خوشاب نیوکلیئر کمپلیکس'' میں چوتھا اٹمی ری ایکٹر پایہ تکمیل کو پہنچ چکا۔ چنانچہ وہاں عنقریب خام یورینیم کے ذریعے بجلی بنانے کا آغاز ہو جائے گا۔ یاد رہے پہلے تین ری ایکٹر پچاس پچاس میگاواٹ بجلی پیدا کرتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر تینوں ری ایکٹر پچاس فیصد صلاحیت سے بھی کام کریں تو وہ سالانہ اتنا استعمال شدہ یورینیم دے سکتے ہیں کہ اس سے ۱۸ تا ۲۱ کلو پلوٹونیم مل جائے۔ چونکہ ۵ سے ۲ کلو پلوٹونیم ایک ایٹم بم بنانے کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا بین الاقوامی ماہرین کا تخمینہ ہے ۲۰۰۰ء سے اب تک پاکستان پلوٹونیم کے کم از کم پچاس ایٹم بم تیار کر چکا.....

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاکستانی پلوٹونیم بم کے خالق

یہ حقیقت ہے، کسی فردِ واحد نے وطنِ عزیز کو ایٹمی قوت نہیں بنایا بلکہ یہ پوری ٹیم کا کارنامہ ہے۔ اس ٹیم کے سرکردہ افراد نے تو شہرت پائی مگر بیشتر گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی محنت اور قربانی رائیگاں گئی بلکہ وہ بھی ہمارے ہیرو اور محسن ہیں۔

پاکستان کے پلوٹونیم ایٹمی منصوبے کی بنیاد منیر احمد خان نے رکھی۔ آپ ۲۰ مئی ۱۹۲۶ء کو قصور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے الیکٹرک انجینئرنگ میں بی ایس سی کیا۔ پھر اسکالرشپ پر امریکا چلے گئے۔ وہاں نارتھ کیرولینا اسٹیٹ یونیورسٹی سے الیکٹریکل انجینئرنگ میں ایم ایس سی کیا۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔

آپ نے پھر نیوکلیئر یا ایٹمی انجینئرنگ میں ایم ایس سی کرنے کا سوچا۔ چناں چہ آپ الینائے انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اور آرگون نیشنل لیبارٹری سے منسلک رہے۔ آخر ۱۹۵۶ء میں نارتھ کیرولینا اسٹیٹ یونیورسٹی ہی نے آپ کو نیوکلیئر انجینئرنگ میں ایم ایس سی کی ڈگری عطا کی۔

منیر احمد خان پھر ۱۹۵۸ء تا ۱۹۷۲ء بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی سے منسلک رہے۔ آپ پہلے ایشیائی سائنس داں ہیں جنہیں ایجنسی میں سینئر عہدے پر فائز کیا گیا۔ گو آپ پی ایچ ڈی نہیں تھے لیکن ایٹمی ری ایکٹروں سے متعلق کام کرنے کے باعث آپ کو وسیع تجربہ حاصل ہوا۔

اسی لیے بھارتی ایٹمی دھماکوں کے بعد ۱۹۷۲ء میں پاکستانی ایٹم بم بنانے کا فیصلہ ہوا تو وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو منیر صاحب کو پاکستان لے آئے۔ بعدازاں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے یورینیم ۲۳۵ سے ایٹم بم بنانے کے منصوبے کا آغاز کیا۔ تاہم منیر احمد خان کی قیادت میں پلوٹونیم والے منصوبے پر بھی کام جاری رہا۔ آپ جنوری ۱۹۷۲ء میں پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے سربراہ بنائے گئے اور مارچ ۱۹۹۱ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

منیر صاحب کے دور میں پلوٹونیم ایٹمی منصوبہ تصورات و خیالات سے نکل کر عملی شکل اختیار کر گیا۔ اور جب وہ رخصت ہوئے تو پلوٹونیم ایٹم بم حقیقت بن چکا تھا۔ آپ ۲۲ اپریل ۱۹۹۹ء کو چل بسے۔ آپ نے دفاعِ وطن کی خاطر جو خدمات انجام دیں، قوم انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

نیلور اسلام آباد میں واقع نیو لیبارٹریز ہر سال ۱۰ تا ۲۰ کلو پلوٹونیم تیار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یوں پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے قابل و محبِ وطن سائنس دانوں نے پلوٹونیم کے ذریعے بھی ایٹم بم تیار کر کے قومی دفاع مضبوط سے مضبوط تر بنا دیا۔ گو اس منصوبے سے تعلق رکھنے والے پاکستانی دنیائے سائنس و ٹیکنالوجی کے کئی ستارے گمنام رہے مگر یہ انہی کی محنت، سعی اور عزمِ مصمم کا کرشمہ ہے کہ آج ہمارے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دشمنوں کو ہم پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

پلوٹو نیم کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے کم طاقت والے چھوٹے ایٹم بم برق رفتار میزائلوں میں نصب کر کے انھیں جلد از جلد دشمنوں کے سر تک پہنچانا ممکن ہے۔

دوسری طرف ۱۹۹۸ء میں پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے تو بھارتی حکومت چوکنا ہو گئی۔ چناں چہ بھارت پچھلے سولہ سال کے دوران پلوٹونیم بنانے والے پانچ ایٹمی ری ایکٹر تعمیر کر چکا ہے۔ ماہرین کی رو سے اس وقت بھارتیوں کے پاس "دو ہزار" سے زائد ایٹم بم موجود ہیں۔ نیز ان کے ایٹمی ری ایکٹر سالانہ اتنا زیادہ پلوٹونیم بناتے ہیں کہ "۱۵۰" ایٹم بم بنائے جا سکیں۔

ظاہر ہے، یہ پاکستان کے لیے تشویش ناک صورت حال ہے۔ پاکستانی حکومت چاہتی ہے کہ وہ "مزاحمت کا توازن (Deterrence)" برقرار رکھے تاکہ بھارتی حکومت اسے میلی نظر سے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔

مزید برآں ماہرین کا کہنا ہے کہ ایک ایٹمی قوت کے لیے یہ اہم بات نہیں کہ وہ کتنے ایٹم بم رکھتی ہے۔ اہمیت یہ ہے کہ اس کا ڈیلیوری سسٹم کتنا تیز رفتار ہے۔۔۔ اور اس شعبے میں پاکستان کو اپنے ممکنہ دشمن پر برتری حاصل ہے۔ ہمارے ذہین سائنس دان برق رفتار میزائل بنا چکے۔ یہ میزائل چھوٹے بڑے ایٹم بم لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

پاکستانی ماہرین آج کل بابر کروز میزائل (حتف ہفتم) کا ایسا ورژن یا صورت ایجاد کرنے میں مصروف ہیں جسے آبدوز سے چھوڑا جا سکے گا۔ یوں پاکستان کو یہ موقع ملے گا کہ وہ سمندر کے راستے سے دوسرا حملہ (Second Strike) کر سکے۔

دین اسلام میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ زیادتی نہ کریں تاہم اپنے دفاع میں جنگ لڑ سکتے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے "اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو...... مگر تب بھی زیادتی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ زیادہ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا" (سورۃ البقرہ ۱۹۰)

◆◆◆

دانائی کی تلاش

☆ اگر تم ہر حال میں خوش رہتے ہو تو یقین کرو زندگی کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا۔
☆ انسان کی سوچ کا اس کے رویوں پر ہی نہیں صحت پر بھی براہ راست اثر پڑتا ہے۔
☆ نئی بلندیوں تک وہی لوگ جا سکتے ہیں جو اس راز سے واقف ہوں کہ پرانی کیوں بجھ گئیں۔
☆ زندگی سب کو عزیز ہے مگر بہادر انسان کے لیے عزت زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔
☆ نصیحت سچی خیر خواہی ہے جسے ہم نہیں سنتے۔ خوشامد بدترین دھوکا ہے جسے ہم پوری توجہ سے سنتے ہیں۔
☆ اپنے کسی ساتھی کی خوشی یا کامیابی پر دل سے خوش ہونا ایمان کی تندرستی ہے۔
☆ ایک نیا تصور حیات سیاسی اور معاشرتی زندگی کی بنیادوں تک ہلا دیتا ہے۔
☆ آنسو اس وقت مقدس ہوتے ہیں جب دوسروں کے دکھ میں نکلیں۔

(مرسلہ: آمنہ رمضان، عارف والا)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

عزم و شجاعت کی لازوال علامت

معرکہ باٹا پور

ان نازک لمحوں کا سنسنی خیز قصہ
جب دشمن نے شاہینوں کو بے خبری میں پکڑا مگر
شاہین بھی ایسی بے جگری سے لڑے کہ دلیری و
بہادری کی نئی تاریخ رقم کر ڈالی

میجر جنرل (ر) تجمل حسین ملک

یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کو جنرل اختر حسین ملک نے اکھنور کی جلد از جلد تسخیر کے لیے چھمب جوڑیاں پر دھاوا بول دیا۔ چھمب جوڑیاں میں دشمن کا سب سے اہم سپلائی روٹ کاٹ دیا گیا۔ سیکڑوں توپوں کے فائر کے بعد بکتر بند دستوں کی قیادت میں ہماری انفنٹری نے دشمن کی پوزیشنوں پر اسی انداز اور جذبے کے ساتھ حملہ آور ہوئی جیسے دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی مراحل میں نازی فوجیں یورپ میں داخل ہوئی تھیں۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ بھارتیوں کے ہوش اڑ گئے۔ وہ مکمل سراسیمگی کے عالم میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور چھمب جوڑیاں پر ہمارا قبضہ ہو گیا۔

ٹھیک اس مرحلے پر جب ساری کارروائی پلان کے عین مطابق انجام پا رہی تھی، پاک آرمی کے کمانڈر انچیف

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنرل محمد موسیٰ خان نے جنرل اختر حسین ملک کو کمان سے سبکدوش کر کے جنرل یحییٰ خان کو کشمیر آپریشن کا انچارج بنا دیا۔ اس فیصلے سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ اوپر سے نیچے تک پوری کمان بددلی کا شکار ہو گئی۔ آپریشن کی رفتار سست پڑ گئی۔ یوں دشمن کو سنبھلنے اور اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کا موقع مل گیا اور ہم اپنا مطلوبہ مقصد (اکھنور کی فتح) حاصل نہ کر سکے۔

۵ ستمبر کو لاہور چھاؤنی میں کیا ہوا؟

یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ جس وقت چھمب جوڑیاں محاذ پر گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی، پاک فوج کی باقی یونٹیں زیادہ تر اپنی انتظامی اور تربیتی سرگرمیوں میں مصروف تھیں۔ ہر یونٹ کی ایک چھاؤنی الگ بنی ہوئی تھی۔ لاہور میں مقیم میری یونٹ (۳ بلوچ رجمنٹ) ۶ ستمبر کو ہونے والی ہفتہ وار پریڈ کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اس روز شام کو ہماری یونٹ نے جی او سی کے قریب باسکٹ بال کے سالانہ مقابلوں میں حصہ لیا۔

۵ ستمبر کی صبح ۱۱۴ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بریگیڈ کمانڈروں کی کانفرنس ہوئی۔ ہمیں حکم ملا کہ احتیاطی قدم کے طور پر ۵ اور ۶ ستمبر کی رات اپنی اپنی دفاعی پوزیشن سنبھال لیں۔ یہ بات زور دے کر کہی گئی کہ کوچ کا پروگرام رات بارہ بجے سے پہلے ہرگز شروع نہ کیا جائے۔ انفنٹری یونٹوں کے بارے میں کہا گیا کہ وہ پیدل چل کر اپنی منزل پر پہنچیں گی۔ طے پایا کہ ۱۱۴ بریگیڈ واہگہ سیکٹر اور ۱۰۳ بریگیڈ برکی سیکٹر کے دفاع کا ذمہ دار ہوگا جب کہ ۲۲ بریگیڈ ریزرو میں رہتا۔

میری یونٹ کو حکم ملا کہ وہ واہگہ کے قریب جی ٹی روڈ کے دونوں طرف دفاعی پوزیشن اختیار کرے اور اس کے اگلے مورچے بی آر بی نہر کے کنارے ہوں گے۔ گویا ہمیں حسین برج سے بی آر بی نہر تک ۱۲ میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑا جو کم و بیش ۵ گھنٹے کا فاصلہ تھا۔ چونکہ میری بٹالین کو جی ٹی روڈ کے دونوں طرف واقع انتہائی اہم سیکٹر میں صف آرا ہونا تھا، اس لیے میں نے بریگیڈ میجر شمیم احمد (جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل بنے) سے فون کر کے پوچھا، آیا میری یونٹ رات کے ۸ بجے مارچ شروع کر سکتی ہے تاکہ رات کی تاریکی میں کسی کو نقل و حرکت کا پتا نہ چلنے پائے؟

انھوں نے ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے دریافت کرنے کے بعد بتایا کہ رات بارہ بجے سے پہلے ہرگز حرکت نہ کی جائے اور یہ کہ مجھے طے کردہ شیڈول پر عمل کرنا ہوگا۔ اس وقت کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اگلی صبح بھرپور جنگ چھڑنے والی ہے۔ شاید اسی واسطے انھوں نے ہمیں قبل از وقت مارچ کی اجازت نہیں دی۔

رات کے ۱۰ بجے جوان روانگی کے مقام پر قطار در قطار کھڑے ہونا شروع ہوئے۔ موقع پر یونٹ کے امام نے جہاد پر قرآن حکیم کی چند آیات پڑھیں۔ اس کے بعد میں نے جوانوں سے خطاب کیا۔ میں ایک کمزور اور گناہگار مسلمان اور ایسے موقع پر جذباتی ہو جاتا ہوں۔ تاریخ اسلام سے چند مثالیں پیش کرنے کے بعد میں نے جوانوں کو یقین دلایا کہ اگر ہمیں جہاد کے لیے پکارا گیا تو وہ مجھے ان شاء اللہ اپنے ساتھ اگلی صف میں پائیں گے۔ ہم اکٹھے جئیں، اکٹھے مریں گے اور دشمن کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔

اعلیٰ کمان کی بے خبری

احکام کے مطابق ہم نے رات کے بارہ بجے یونٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

لاہور سے کوچ کیا۔ تقریباً ۱۰ میل چلنے کے بعد [illegible] کے نزدیک میں نے بٹالین کو تھوڑی دیر ستانے کی غرض سے روک دیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ بی آر بی تک پہنچنے کے لیے ہمیں ۴ میل کا فاصلہ مزید طے کرنا تھا۔ دوران وقفہ پلٹن کے سیکنڈ ان کمانڈ میجر شمس الدین انصاری نے مجھے بتایا کہ انھوں نے گزشتہ رات بھارتی ریڈیو پر یہ شرانگیز خبر سنی، پاکستانی فوج نے امرتسر اور بعض دوسرے سرحدی مقامات پر بمباری کی ہے۔

ہمارے نزدیک اس خبر میں کوئی صداقت نہیں تھی۔

انھوں نے خیال ظاہر کیا، شاید دشمن کوئی گڑبڑ کرنے کے لیے زمین ہموار کر رہا ہے۔ میں نے کہا "ایسا ممکن ہے، لیکن ہمیں جو احکام ملے ہیں، ان کے مطابق ہم دفاعی مورچے بھی نہیں کھود سکتے جب تک کہ جی او سی اور بریگیڈ کمانڈر دونوں جگہ کا معائنہ کر کے اس کی منظوری نہ دیں۔"

میں نے یہ جزئیات اس غرض سے بیان کی ہیں، ہماری اعلیٰ کمان دشمن کے منصوبے سے قطعی بے خبر تھی کہ وہ ۶ ستمبر کو صبح سویرے لاہور پر حملہ کرنے والا ہے۔ معاملے کا بدترین پہلو یہ ہے کہ دشمن کو اس چیز کا پوری طرح علم تھا کہ ہم نے حملے کی روک تھام کے لیے کوئی تیاری نہیں کی۔ بھارت کے کمانڈر انچیف جنرل چودھری (فاتح حیدرآباد دکن و گوا) نے جب یہ فرمان امروز جاری

کیا کہ اس نے بعض افسروں کو جو شام ۵ بجے جم خانہ کلب لاہور میں منعقد ہونے والی محفل رقص و سرود میں شرکت کی دعوت دی ہے، تو وہ قطعاً غلطی پر نہیں تھا۔

اسے معلوم تھا کہ لاہور میں واہگہ اور راوی کے پل کے درمیان کوئی دفاعی لائن موجود نہیں جو اس کی بڑھتی فوج کا راستہ روک سکے۔ اس علاقے میں سرحدی فوج کے جو چند چھوٹے موٹے دستے تعینات تھے، انھیں حملہ آور فوج کی قیادت کرنے والے ٹینک ذرا سی دیر میں نیست و نابود کر سکتے تھے۔

بھارتی فوج کی یلغار

جنرل چودھری بی آر بی نہر کے کنارے میجر جنرل نرنجن پرشاد سے محو گفتگو

میری الفا کمپنی نے (جس کی کمان میجر انور حسین شاہ کر رہے تھے) ۵ ستمبر کی شام ڈوگرائی کے علاقے میں دفاعی پوزیشن سنبھال لی۔ انھیں بھی ہدایت کی گئی کہ تا حکم ثانی مورچے نہ کھودیں تاہم پوری طرح چوکس رہیں۔ ۶ ستمبر کو صبح ساڑھے ۵ بجے باقی بٹالین بھی اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ میں نے کمپنیوں کو ان کی طے کردہ دفاعی پوزیشن کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ میں نماز فجر پڑھ کر فارغ ہی ہوا تھا کہ بٹالین کے انٹیلی جنس افسر لیفٹیننٹ خالد (بعد میجر جنرل) آئے اور کہنے لگے "سر بریگیڈ میجر نے ابھی ابھی فون پر اطلاع دی ہے کہ بھارتی فوج نے حملہ کر دیا ہے۔ پیش قدمی کرتے ہوئے وہ واہگہ بارڈر کی سرحدی [illegible] پر قبضہ کر چکی۔ اب وہ لاہور کی طرف بڑھ رہی ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ سنتے ہی میں نے جسم میں جھرجھری سی محسوس کی۔

میرا سپاہیانہ جذبہ ایک دم بیدار ہو گیا۔ ایسے موقع پر مسلمان سپاہی محاذ جنگ پر جانے کی سوچتا ہے۔ جہاد کا اعلان سن کر اس کی کیفیت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے اور وہاں تو حق و باطل کے درمیان سچ مچ کی لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے انٹیلی جنس افسر کو حکم دیا کہ میری جیپ تیار کراؤ، میں اگلے مورچوں کا معائنہ کرنے جاؤں گا۔

دریں اثنا میں نے دوگانہ کے نفل ادا کیے۔ جہاد پر روانہ ہونے سے پہلے مسلمان سپاہی کے لیے دوگانہ نفلوں کی ادائی موجب اطمینان و تقویت ہوتی ہے۔ میں فرنٹ کی طرف روانہ ہونے والا تھا کہ فضا میں دشمن کے چھ طیارے نظر آئے جو ہماری پوزیشنوں پر سے ہوتے ہوئے لاہور کی طرف چلے گئے۔ شاید یہ وہی بمبار طیارے تھے جنھوں نے ۶ ستمبر کی صبح سویرے گوجرانوالہ کے قریب ہماری ایک ریل گاڑی پر بمباری کی تھی۔

دشمن کی پیش قدمی

دشمن کے ۱۵ ڈویژن نے جو چار بریگیڈ پر مشتمل تھا، واہگہ سیکٹر اور ۷ ڈویژن نے جس میں مقررہ تعداد سے ایک بریگیڈ کم تھا، برکی سیکٹر میں پیش قدمی شروع کی۔ ان کے نزدیک واہگہ سیکٹر کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ کیونکہ جی ٹی روڈ جیسی بڑی شاہراہ اس کے درمیان سے گزرتی ہے۔ پھر شالامار باغ پہنچنے کے بعد وہ محمود بوٹی بند تک پیش قدمی کرتے ہوئے شہر کے گنجان آباد علاقہ میں داخل ہوئے بغیر راوی پل پر قبضہ کر سکتے تھے۔ یوں لاہور چھاؤنی میں مقیم ہماری فوج گھیرے میں آ جاتی۔

اگر ہم لڑائی کے لیے تیار نہ ہوتے تو لاہور گیریژن کے مخصوص دستوں کو باہر سے کوئی کمک بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ڈویژنل آرٹلری کی زیادہ تر یونٹیں اور ۲۲ بریگیڈ (جو ریزرو میں تھا) ۶ ستمبر کو معمول کی پی ٹی اور پریڈ کرنے میں مصروف ہوتا۔ ادھر بی آر بی نہر کے کنارے ہماری اگلی پوزیشنوں پر حملہ ہو چکا تھا۔ لاہور گیریژن کے زیادہ تر افسروں نے بھارتی حملے کی خبر ناشتہ کرتے ہوئے سنی۔ ۱۵ بلوچ رجمنٹ کی دو کمپنیاں معمول کی فائر پریکٹس کرنے رینج پر گئی ہوئی تھی۔ انھیں فوراً واپسی کے احکام ملے۔

میں نے بی کمپنی کے کمانڈر میجر محمد نواز کو جلو پل کے نزدیک لائن اور منہالہ برج کے درمیانی علاقہ کا دفاع کرنے کی ذمہ داری سونپی جو تقریباً ۲۰۰۰ گز لمبا محاذ تھا۔ یہ کمپنی صبح ۷ بجے کے قریب اپنی پوزیشن پر پہنچی تو انھیں ۱۰۰۰ گز کے فاصلے پر دشمن کے دستے صف بندی کرتے نظر آئے۔ وہ حیران و ششدر رہ گئے۔ کیونکہ دفاعی پوزیشنیں دشمن کے متوقع حملہ سے بہت پہلے بارودی سرنگیں بچھا اور مختلف قسم کی دوسری رکاوٹیں کھڑی کر کے تیار کی جاتی ہیں۔ ہماری حالت یہ تھی کہ نہ تو ہم مورچے کھود سکے تھے نہ ہی ہمارے پاس لڑائی کے لیے مطلوبہ اسلحہ تھا۔ جوانوں کے پاس بس تھیلی (Pouch) میں موجود اسلحے سے زیادہ دیر تک لڑنا ممکن نہ تھا۔

کمپنی کمانڈر دلیر آدمی تھا۔ اس نے صورت حال کی سنگینی فوراً بھانپ لی۔ فائرنگ شروع کرنے کی خاطر اعلیٰ کمان سے اجازت لینے کے عام تکلفات پورے کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اس نے توپ خانے کے او پی (آبزرویشن افسر) کو صورت حال سے مطلع کیا۔ او پی نے جلد ہدف کو جا لیا اور کمپنی کے دور تک مار کرنے والے ہتھیاروں سے دشمن پر فائرنگ شروع کرا دی۔ دشمن اس غیر متوقع شدید فائرنگ سے سٹ پٹا کے رہ گیا۔ انھیں تو یہ بتایا گیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا کہ بی آر بی نہر کے علاقے میں پاکستان کا ایک بھی فوجی موجود نہیں۔ اس ناگہانی فائر سے دشمن کے ہوش اڑ گئے۔

جس وقت میں بی کمپنی میں پہنچا دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہمارے جوانوں کے پاس وہی تھوڑا سا اسلحہ تھا جو وہ اپنی تھیلیوں میں لائے تھے۔ یونٹ کی گاڑیاں مزید اسلحہ لے کر روانہ ہو چکی تھیں لیکن ان کے پہنچنے میں دیر تھی۔ اگر دشمن دباؤ ڈالتا تو ہمارا اسلحہ جلد ختم ہو جاتا۔ تب جوانوں کو رائفلوں پر سنگینیں چڑھا کر لڑنا پڑتا جو جنگ کا آخری حربہ ہے۔ ۶ ستمبر کی صبح کو جنگ کا آغاز ہوا تو ہمارے جوانوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ ان میں کسی قسم کا خوف و ہراس تھا نہ مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے کی فرصت۔ وہ مضبوطی سے اپنی اپنی پوزیشن پر ڈٹ گئے اور دشمن کے پہلے اچانک حملے کو ناکام بنا دیا۔

بی کمپنی کی پوزیشن قدرے مستحکم ہو گئی تو میں نے بٹالین کے محاذ کا معائنہ کیا جو بی آر بی نہر کے ساتھ ساتھ قریباً ۵ میل تک پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے علاقے میں نہر پر تین پل تھے۔ اگلی کمپنیوں نے نہر کے دونوں کناروں پر پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ جلو پل پر منہ کی کھانے کے بعد دشمن نے جی ٹی روڈ کے ساتھ ساتھ بڑھنا شروع کیا۔ آگے آگے ٹینک اور ان کے پیچھے پیدل دستے۔ واہگہ پوسٹ اور باٹا پور پل کے درمیان قریباً سات میل کا فاصلہ ہے۔ واہگہ پر وہ پہلے ہی قبضہ کر چکے تھے۔ سرحدی پٹی میں رہنے والے لوگ دشمن کے اچانک حملے سے خبردار نہیں تھے۔ وہ حسب معمول اٹھے اور معمول کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔

ناگہاں دشمن کے ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سنی اور خود کو چاروں طرف سے دشمن کے نرغے میں پایا تو سب کچھ چھوڑ کر لاہور کی طرف سرپٹ بھاگ اٹھے۔ نہر کے تمام پلوں

حمد باری تعالیٰ

اس ایک ذات سے اپنا عجیب ناتا ہے
میں جب بھٹکتا ہوں وہ راستہ دکھاتا ہے
سواد شب میں بھی روشن ہے راستہ میرا
وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ جاتا ہے
یہ سوز و ساز، یہ تابندگی، یہ بانگ جاں
کوئی چراغ کی صورت مجھے جلاتا ہے
میں کھو بھی جاؤں اگر زندگی کے میلے میں
وہ مہرباں مجھے پھر سے ڈھونڈ لاتا ہے
عجب نہیں کہ کسی روز ہم پہ کھل جائے
وہ راستہ جو زماں سے گزر کے جاتا ہے

(مقبول عامر)

پر مردوں، عورتوں اور بچوں کا اس قدر ہجوم جمع ہو گیا کہ ٹریفک کے گزرنے میں رکاوٹ پڑ گئی۔ ان میں سے بعض اپنے مویشی بھی ساتھ لائے۔ یہ درد انگیز منظر تھا۔ یہ لوگ بی آر بی پار کر کے دوسری طرف پہنچے اور اپنے سرحدی محافظوں کو دشمن سے مقابلے کے لیے لیکن پوری حالت میں تیار دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھے "اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔" ۸ بجے کے قریب دشمن کا ہراول دستہ ہمارے چھوٹے ہتھیاروں کی زد میں آ گیا۔ ۹ بجے کے لگ بھگ ان کا پہلا ٹینک باٹا پور پل سے ۸۰۰ گز کے فاصلے پر پہنچا۔ پیادہ دستے اس کے پیچھے پیچھے بڑھ رہے تھے۔

غیبی مدد

اب تک ہمارے تمام پل صحیح سالم تھے کیونکہ جی او سی کی اجازت کے بغیر پل تباہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میری

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دو انگلی کمپنیوں نے نہر کے دونوں کناروں پر پوزیشن لے رکھی تھی۔ ابھی تک انھیں مورچے کھودنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ اس لیے وہ قدرتی آڑیا اوٹ سے مدد لے رہے تھے۔ اگلی دفاعی لائن مستحکم کرنے کے لیے میں نے پیچھے کی دو کمپنیوں کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر خالی جگہوں پر قبضہ کر لیں۔ میری بٹالین پورے پانچ میل کے محاذ پر صف آرا تھی۔ پلوں کی حفاظت کے لیے دو ٹینک شکن تو پیں لگا دی گئیں۔ ہمیں اس نازک لمحے پر جب ہم گنوں کے لیے آڑ ڈھونڈ رہے تھے، ایک بوڑھا آدمی چارے سے بھری بیل گاڑی پل کے پار لے آیا۔ میں نے اس سے کہا "بابا گاڑی یہیں رہنے دو اور اپنے بیل کھول کر لے جاؤ۔"

اس نے میری بات مان لی۔ یہ ایک غیبی مدد تھی۔ ہم نے ایک گن بیل گاڑی کی اوٹ میں چھپا دی اور دوسری ایک زیرِ تعمیر مسجد کے پچھلے حصے میں۔ ہم اس بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔ اتنے میں بریگیڈ کمانڈر، بریگیڈیئر آفتاب (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل)، انجینئرز کمانڈر کرنل سلیمان اور آرٹلری کمانڈر کرنل امداد حسین موقع پر پہنچ گئے۔

دشمن کے ٹینکوں کی تباہی

دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا اور ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ مہاجرین دشمن ٹینک کے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔ اس طرح ہماری گولہ باری میں رکاوٹ پڑی۔ ہم ممکنہ حد تک لوگوں کو فائر سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے جب کہ دشمن اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ دشمن کا پہلا ٹینک جونہی پل کے نزدیک پہنچا، بیل گاڑی کی اوٹ میں چھپی گن نے ایک گولہ فائر کیا جو نشانے پر لگا۔ چند ثانیے بعد دشمن کے ٹینک سے شعلے اٹھتے نظر آئے۔

ان کے دوسرے ٹینک نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ہماری گن پوزیشن پر فائر کیا۔ گولہ لگنے سے جہاں بیل گاڑی مکمل طور پر تباہ ہوئی وہاں معجزانہ طور پر گن صاف بچ گئی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہماری گن سے دوسرا گولہ داغا گیا جس نے دوسرا ٹینک بھی تباہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی پیش قدمی کرتے دشمن پر خودکار ہتھیار سے فائر کھول دیا گیا۔ توپ خانہ بھی آگ اگلنے لگا۔ دشمن کے بڑھتے قدم عارضی طور پر رک گئے۔

بریگیڈ کمانڈر نے صورت حال کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے کہا "جی او سی کی طرف سے تمھیں پل تباہ کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔"

ابھی تک دونوں طرف سے وقفے وقفے سے فائرنگ جاری تھی۔ انجینئرز پارٹی نے پل اڑانے کی کوشش کی، لیکن اسے جزوی کامیابی حاصل ہوئی۔ بڑا حصہ دونوں کناروں سمیت محفوظ رہا۔ تاہم اس پر سے گاڑیاں نہیں، صرف پیدل دستے گزر سکتے تھے۔ صورت حال بڑی نازک ہو گئی۔ میں نے اپنی درمیانی دو کمپنیوں کی نہر کے ساتھ صف بندی کرا دی تاکہ پلوں کی حفاظت کر سکیں۔ اب میرے پاس ریزرو میں کوئی دستہ نہیں تھا۔ دشمن نہر پار کرنے کے لیے کسی جگہ پر قبضہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔

اس مرحلے پر میں نے اپنے بریگیڈ کمانڈر سے کہا "مناسب ہو گا کہ آپ یہاں سے پیچھے جا کر دوسری دفاعی لائن بنا لیں۔ ممکن ہے دشمن ہماری پوزیشن روندتا ہوا آگے بڑھ جائے۔ وہ ہماری دفاعی پوزیشن کی کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ ہے۔"

بریگیڈیئر صاحب سیدھے لاہور سے آئے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ بات ان کے علم میں تھی کہ پیچھے کا سارا علاقہ یعنی بی آر بی نہر اور راوی کے پل تک کا درمیانی علاقہ مکمل طور پر خالی ہے۔ خدانخواستہ دشمن ہماری پوزیشنوں کو روند کر نکل جاتا تو لاہور تک کوئی اسے روکنے والا نہیں تھا۔ وہ ٹینکوں پر سوار ہو کر جی ٹی روڈ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے باآسانی شالامار باغ پہنچ جاتے۔ وہاں سے محمود بوٹی بند کی راہ اختیار کر کے گیارہ بجے سے پہلے راوی برج تک کے علاقے پر قبضہ کرتے تو چھاؤنی میں موجود دستوں کو ان کے سامنے ہتھیار ڈالے بغیر چارہ نہ رہتا۔ یقیناً یہ ایک قرین قیاس راہ عمل تھی جسے اختیار میں وہ پوری طرح آزاد تھے۔

۶ ستمبر کی نشانی

بریگیڈ کمانڈر رخصت ہونے لگے تو میں نے ایک خالی کارتوس ۶ ستمبر کی نشانی کے طور پر انھیں پیش کیا۔ میں نے ایسے دو کارتوس اس وقت اٹھائے جب صبح ہم دشمن کے فضائی حملے کی زد میں آئے تھے۔ دوسرا کارتوس میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ وطن کے جاں نثار سپاہیوں کے لیے ایسی نشانیاں کسی تعمیر شدہ پل کی رسم افتتاح ادا کرنے یا چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اربوں روپے کے صنعتی منصوبے کا "سنگ بنیاد" رکھنے کی یادگاری تختی سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔

باٹاپور برج کے جزوی انہدام اور دو بھارتی ٹینکوں کی تباہی کے بعد دشمن کی پیش قدمی مدہم پڑ گئی۔ تاہم ان کے پیدل فوجی موضع ڈوگرائی کے آباد علاقے کی اوٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے اور ان کی خاصی تعداد پل کے قریب جمع ہو گئی۔ یوں میرے ان جوانوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئیں جو پل کی حفاظت پر مامور تھے۔ نیز پل دشمن کے قبضہ میں چلے جانے کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔ میں نے فوراً توپ خانے کو حکم دیا کہ پل کے اوپر "ایس او ایس" فائر کرایا جائے۔

پاکستانی شاہینوں نے بم باری کر کے بھارتیوں کا ویسے ہی کچومر بنا دیا جیسے ابابیلوں نے ابرہہ کے ہاتھیوں کا قیمہ بنایا تھا

جنگی طیاروں کی آمد

یہ ایک مشکل فیصلہ تھا تاہم کمانڈر کو ضرورت پڑنے پر کسی سے مشورہ کیے بغیر ایسا کرنا پڑتا ہے۔ ہم ابھی تک کھلے میدان میں تھے۔ دشمن کے ناگہانی حملے نے ہمیں

میجر جنرل تجمل حسین ملک ۱۳ جون ۱۹۲۴ء کو ضلع چکوال میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں برطانوی ہند کی فوج کا حصہ بنے۔ آزادی کے بعد پاک فوج میں شامل ہوئے۔ بھارت کے ساتھ تمام جنگوں میں حصہ لیا اور محاذ جنگ پہ جوش و جذبے سے لڑے۔ جنگ ۱۹۷۱ء میں آپ اس واحد (۱۶) ڈویژن کے کمانڈر تھے جس نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ بعدازاں جنرل ضیاالحق سے اختلاف کے باعث نظر بند رہے۔ ۱۹۸۸ء میں رہا ہوئے۔ ستمبر ۲۰۰۲ء میں وفات پائی۔ زیر نظر مضمون آپ کی آپ بیتی "میری جدوجہد کی داستان" سے بشکریہ لیا گیا۔ یہ کتاب جنگ پبلشرز، لاہور کی شائع کردہ ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مورچے کھودنے کی مہلت بھی نہ دی۔ میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اپنے کچھ جوانوں کی جانوں کے ضیاع کا خطرہ قبول کرتے ہوئے توپ خانے سے بمباری کراؤں۔ دشمن ہم پر بھرپور وار کرنے کے لیے قریب ہی جمع ہو رہا تھا۔ ہمیں ہر قیمت پر انھیں روکنا تھا۔ فائر کا حکم دینے کے بعد انٹیلی جنس افسر خالد نواز اور وائرلیس آپریٹر کے ساتھ میں بھی ایک گڑھے میں چھپ گیا۔

چند ثانیے بعد ہماری توپیں آگ اگلنے لگیں۔ زیادہ تر گولے ٹیلے پر گرے اور بالکل صحیح نشانے پر لگے۔ بھارتی سپاہی کسی اوٹ کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگے۔ عین اس وقت جب ہم موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے، ہمارے دو لڑاکا طیارے فضا میں نمودار ہوئے۔ انھوں نے دشمن پر گھمسان کا رن پڑتے دیکھا تو فوراً واپس پلٹے۔ دشمن کا ہراول دستہ جس میں ٹینک، توپیں اور جنگی سامان سے لدی ہوئی گاڑیاں شامل تھیں، اپنی سرحدوں کی جانب بڑھتے دیکھ کر انھوں نے غوطہ لگایا اور زبردست فائرنگ کر کے بھارتیوں کا اس طرح کچومر نکال دیا جیسے ابابیلوں نے ابرہہ کے ہاتھیوں کا بھرتہ بنا دیا تھا۔ دشمن کو پیش قدمی بھول گئی بلکہ الٹا اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ ہمارے شاہینوں نے اتنی پھرتی سے بمباری کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ میں نے کھڑے ہو کر وہ یادگار اور دلچسپ منظر دیکھا۔ حالانکہ اس لمحے میری اپنی پوزیشن فائر کی زد میں تھی۔

ان طیاروں کی اچانک آمد ہمارے لیے غیبی مدد ثابت ہوئی۔ جنگوں میں اکثر نازک لمحات آتے ہیں۔ میرے خیال میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کا سب سے نازک لمحہ وہی تھا جب دو طیارے فضا میں نمودار ہوئے۔ جنگ بندی کے چند ماہ بعد ان دو لڑاکا طیاروں میں سے ایک طیارہ کا پائلٹ، جس نے ۹ ستمبر کی صبح کو لڑائی میں حصہ لیا اور دشمن کا کچومر نکال دیا، بانا پور میں واقع ہماری پوزیشن کے دورے پر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا "آیا اس روز انھیں خاص طور پر کسی جنگی مشن پر بھیجا گیا تھا یا وہ اتفاقاً ادھر آ نکلے تھے؟"

اس نے بتایا "ہم معمول کے جاسوسی مشن پر تھے۔ جونہی ہم نے ٹینکوں اور گاڑیوں پر سوار دشمن سپاہیوں کو اپنی سرحدوں کی طرف بڑھتے دیکھا، تو اسے ایک اچھا ہدف سمجھا اور آناً فاناً سارا اسلحہ فائر کر دیا۔"

ایوب خان کا قوم سے خطاب

دشمن نے لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے اپنے منصوبے کی بنیاد "حیرت" اور "برق رفتاری" پر رکھی تھی۔ جنرل چودھری نے حیدرآباد دکن اور گوا پر حملہ کرتے وقت بھی اسی تدبیر پر عمل کیا تھا۔ بھارتیوں کو اپنی فتح کا اس قدر پختہ یقین تھا کہ انھوں نے ۹ ستمبر کو صبح سویرے لاہور پر قبضے کی خبر ریڈیو پر نشر کر کے دنیا بھر میں پھیلا دی۔ یہاں تک کہ بی بی سی نے بھی اس کی تصدیق کر ڈالی۔ اس خبر سے جہاں پاکستان کے دوستوں کو دلی دکھ ہوا وہاں دشمنوں نے زبردست خوشی کا اظہار کیا۔ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں نے اپنے عزیز و اقارب کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ٹیلی فون کیے۔ دن کے بارہ بجے صدر ایوب خان نے قوم سے خطاب کیا۔ قوم کے نام ان کا تاریخی پیغام ریڈیو پاکستان سے بار بار نشر کیا جا رہا تھا جس میں انھوں نے کہا:

"پاکستان کے دس کروڑ عوام کے لیے بھارتی چیلنج قبول کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ آج صبح سویرے بھارتی فوج نے واہگہ کی طرف سے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

انھوں نے لاہور کے دلیر شہریوں کو اپنے اولین ہدف کے طور پر چنا ہے۔ تاریخ میں لاہور کے شہریوں کو ہمیشہ یہ منفرد اعزاز حاصل رہا ہے کہ انھوں نے حملہ آور فوج کو نیست و نابود کر دیا۔ ہندوستانی حکمرانوں کو ابھی تک اس بات کا احساس نہیں ہے کہ انھوں نے کس قوم کو للکارا ہے۔

اس ملک کے دس کروڑ باشندے جن کے دل "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی صدا کے ساتھ دھڑکتے ہیں، اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ دشمن کی توپوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش نہ کر دیں۔ یہ وہ قوم ہے جو خدا کی وحدانیت پر پختہ یقین رکھتی ہے جس نے اپنے بندوں سے فتح کا وعدہ کر رکھا ہے۔ میں نے مسلح افواج پاکستان کو حکم دے دیا ہے کہ ان شرپسندوں پر جنھوں نے ہماری سرحد پار کرنے کی جرأت کی ہے ٹوٹ پڑو اور کاری ضرب لگا کر انھیں نیست و نابود کر دو۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

اہل لاہور کی عظمت کو سلام

اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے دن قوم سے ایوب خان کا خطاب بڑا متاثر کن تھا اور اس کے اثرات دیکھنے میں آئے۔ مقامی آبادی کا حوصلہ بلند ہونا شروع ہوا جو ابتدائی صدمے سے قدرے سنبھل گئی تھی۔ بزدل لوگوں میں سے بعض خصوصاً صاحب ثروت اور تجارت پیشہ لوگ جو حملے کی خبر سن کر پریشان ہو گئے تھے، کاروں میں سوار ہو کر محفوظ مقامات کی طرف بھاگنے لگے تو لوگوں نے ان پر آوازے کسے اور شرم دلائی۔ اس طرح راہ فرار اختیار کرنے والوں کا یہ کارواں گوجرانوالہ سے آگے نہیں جا سکا۔

جب انھیں بتایا گیا کہ دشمن کا حملہ پسپا کر دیا گیا، تو ان میں سے اکثر اپنے گھر لوٹ آئے۔ دوسری طرف لاہوریوں کی بھاری اکثریت نے روایتی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ہزاروں رضاکاروں نے دشمن سے لڑنے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے طلبا ہاتھوں میں لاٹھیاں لے کر جی ٹی روڈ پر جمع اور جلوس کی صورت میں واہگہ کی طرف چل پڑے۔ فوجی حکام نے ان جوشیلے نوجوانوں کو شالامار باغ کے پاس روکا اور سمجھا بجھا کر اس وعدے کے ساتھ واپس بھیجا کہ اگر ان کی خدمات کی ضرورت پڑی تو انھیں ضرور موقع دیا جائے گا۔

عجیب بات ہے کہ بحران کے موقع پر عام آدمی تو اپنا سب کچھ وطن پر نچھاور کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن امیر کبیر اور مراعات یافتہ لوگ محفوظ فاصلے پر رہنا پسند کرتے اور صرف اس وقت تالیاں بجاتے ہیں جب جرأت مندی کا کوئی کارنامہ انجام پا جائے۔

> بحران آئے، تو عام آدمی وطن پر سب کچھ نچھاور کر دیتا ہے، مگر مراعات یافتہ طبقہ دور رہتا ہے۔

دشمن نے بی آر بی عبور کرنے میں ناکام ہو کر محتاط رویہ اپنا لیا۔ دونوں طرف وقفے وقفے سے فائرنگ جاری تھی۔ جب دو متحارب فوجیں آمنے سامنے ہوں تو ایسی فائرنگ معمول کی کارروائی ہوتی ہے۔ تھوڑا سا وقفہ ملنے پر ہم نے اپنی دفاعی پوزیشن بہتر بنائی اور بعض انتظامی مسائل کے حل پر توجہ دی۔ ساڑھے دس بجے لاہور سے توپ خانے کی ایک کمپنی اور چند ٹینک کمک کے طور پر پہنچ گئے۔

وہ جی ٹی روڈ کے ساتھ ساتھ بڑھ رہے تھے۔ ان کا اگلا ٹینک بی آر بی سے ۱۰۰۰ گز کے فاصلے پر مناواں کے علاقے میں پہنچا، تو بھارتیوں نے گولہ باری کر کے اسے تباہ کر دیا۔ اس کے پیچھے آنے والے ٹینک کو بھی نقصان پہنچا۔ باقی فوجی وہیں رک گئے اور آس پاس کی عمارتوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں پوزیشن لے لی۔ بعد میں انھیں بڑی دفاعی پوزیشنوں میں خالی جگہیں پُر کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔

موقع ملنے پر میں نے اپنا ہیڈکوارٹر اگلی پوزیشنوں کے بالکل پیچھے ایک مرکزی جگہ پر قائم کر لیا اور شام تک ہم منتقل ہو گئے۔ شام ہوتے ہی دشمن کے جاسوس اور گشت کرنے والے دستے نہر کے دوسرے کنارے پر آنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ ایسی جگہ تلاش کرنا چاہتے تھے جہاں سے نہر عبور ہو سکے۔ رات کو ۸ بجے کے قریب بریگیڈ کمانڈر نے فون پر مطلع کیا۔ "جی او سی چاہتے ہیں کہ باٹا پور برج کو جتنی جلد ہو سکے، مکمل طور پر اڑا دیا جائے۔" دشمن اس پل پر مسلسل دباؤ رکھے ہوئے تھا اور اسے آٹومیٹک فائر کی مدد حاصل تھی۔

ہماری انجینئر کمپنی پل تباہ کرنے کی کئی کوششیں کر چکی تھی، لیکن مسلسل فائر کے باعث اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ میں نے اپنے نائب، میجر تمیز الدین انصاری کو روانہ کیا کہ وہ اپنی نگرانی میں اس کام کو مکمل کرائیں۔ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت تک انتظار کرنے پر بھی کسی پیش رفت کی خبر نہیں ملی تو میں خود موقع پر پہنچا۔ آس پاس کی چھپر والی چھتوں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ اردگرد کا سارا علاقہ منور تھا۔ روشنی میں کسی قسم کی نقل و حرکت خطرے سے خالی نہیں تھی۔

بہرحال ہم ضرورت کے مطابق اپنی کارروائی کر رہے تھے۔ میں موقع پر پہنچا تو میجر انصاری، میجر انور حسین شاہ اور میجر آفتاب پل کے بہت قریب بیٹھے مناسب لمحے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے تاکید کی کہ پل کو جلد سے جلد تباہ کرنا ناگزیر ہے۔ اس کام میں غیر ضروری تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ کی مدد کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایسا لگتا ہے کہ خداوند تعالیٰ ہم پر خاص طور پر مہربان تھا۔ شاید اس لیے کہ ہم جائز مقصد کے لیے لڑ رہے تھے۔ دشمن نے مکارانہ حملہ کرنے سے پہلے ہی اپنی فتح کے دعوے کرنے اور ڈینگیں مارنا شروع کر دی تھیں۔ اس روز بڑے نازک مرحلے پر اتفاقاً ایک کسان بیل گاڑی لے کر آ گیا۔ اس نے ہماری ٹینک شکن گن کو اوٹ فراہم کی اور دشمن کے ٹینک کو نشانہ بنایا۔

اسی طرح وہ لڑاکا طیاروں کی اچانک آمد سے ہمیں بڑی مدد ملی اور دشمن کے بڑھتے قدم رک گئے۔ رات کو ساڑھے گیارہ بجے کے قریب چھ گاڑیوں پر مشتمل دشمن کے ایک کنوائے نے پل کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ ہماری توپوں نے ان پر فائر کیا تو ڈرائیور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے اور ساری گاڑیاں چالو حالت میں ہمارے ہاتھ لگیں۔ ان گاڑیوں پر خوراک، اسلحہ اور دوسرا سامان لدا ہوا تھا۔ وہ اندھیرے میں بھٹک کر ہمارے توپ خانہ کی رینج میں آ گئے تھے۔ انجینئر پارٹی نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان گاڑیوں کی اوٹ لی اور پل اڑانے کے لیے بارودی سرنگ کو آگ لگا دی۔

رات ایک بجے کا عمل ہو گا جب بڑے زور کا دھماکہ ہوا جسے میلوں دور تک سنا گیا۔ میں نے پل کے انہدام کی خبر سے اپنے کمانڈر کو مطلع کیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اطلاع ملنے پر جی او سی نے بھی خوشی محسوس کی ہو گی۔

◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تحریکِ آزادی کا ناقابلِ فراموش ورق

پانچ نمبر پلٹن کی بغاوت

جنگِ عظیم اوّل کے دوران برطانوی شاہی فوج میں شامل مسلمان فوجیوں کی بغاوت کا سنسنی خیز ماجرا

محمد یٰسین خان قائم خانی

۱۴/ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی عالمی جنگ (World War-I) کا آغاز ہوا۔ اس جنگ میں برطانیہ، فرانس اور روس کی متحدہ قوت کے مدمقابل تنہا جرمن فوج تھی۔ تاہم اسی سال ۴/ نومبر کو ترکی جرمنی کی حمایت میں جنگ میں کود پڑا۔ ترکی کی شمولیت نے برطانیہ کے لیے مشکلات پیدا کر دیں۔

ترکی مسلمان ملک تھا اور اس کے خلیفہ کو خادم حرمین شریفین ہونے کے باعث مسلمانانِ عالم خلیفۃ المسلمین قرار دیتے اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس لیے برطانوی غلام ہندوستانی بالخصوص مسلمان فوجی ترکی کے خلاف لڑنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرنے لگے۔ چناں چہ مسلمانوں کے اطمینان کی خاطر حکومتِ برطانیہ نے اعلان کر دیا ''دورانِ جنگ عرب اور عراق میں واقع تمام مقاماتِ مقدسہ کا احترام ملحوظ رکھا جائے گا اور یہ علاقے اتحادی افواج کی دست برد سے محفوظ رہیں گے۔''

اس یقین دہانی کے باوجود سابق تجربات کی روشنی میں مسلمانانِ عالم حکومتِ برطانیہ کے وعدوں پر اعتبار نہ کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز استعمار کے خلاف دوران

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنگِ آزادی کے چند واقعات ہوئے لیکن ان پر جلد قابو پا لیا گیا۔ اس حوالے سے پہلی بغاوت جنوری ۱۹۱۵ء میں رنگون میں ہوئی جو ۱۳۰ بلوچ رجمنٹ نے کی تھی۔ تاہم فوجی بغاوت کا سب سے اہم اور مشہور واقعہ ۱۵ فروری ۱۹۱۵ء کو سنگاپور میں پیش آیا۔

پہلی عالمی جنگ کے دوران پانچ نمبر پلٹن (5th Light infantry) سنگاپور میں تعینات تھی۔ اس یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کرنل مارٹن سمیت تمام افسر انگریز جبکہ تمام فوجی ہندوستانی مسلمان تھے۔ ان میں اکثریت مشرقی پنجاب خصوصاً ہریانہ (اضلاع رہتک، حصار، کرنال، گڑگاؤں وغیرہ) کے مسلمان راجپوتوں کی تھی۔ ۵ فروری ۱۹۱۵ء کو جمعہ نماز کی ادائیگی کے دوران سپاہی منور علی نے مسجد میں آواز بلند کیا "اسلامی لشکر (ترکی) کی فتح کے واسطے دعا مانگو"۔ یہ خبر انگریز آفیسر تک پہنچ گئی۔ اس نے غصے میں جوتوں سمیت مسجد میں داخل ہو کر نمازیوں سے بیہودہ گوئی کی جس پر مسلم جوان مشتعل ہو گئے۔

اس واقعے کے بعد انگریزوں نے ہیجانی کیفیت کے خاتمے یا ممکنہ باغیوں کو سمندر میں غرق کرنے کی خاطر پانچ نمبر پلٹن کو غیر مسلح کر کے بذریعہ بحری جہاز ہانگ کانگ بھیجنے کا منصوبہ بنایا۔ حالانکہ یہ یونٹ چار ماہ قبل ہی ہندوستان سے سنگاپور پہنچی تھی۔ حکم دیا گیا کہ یونٹ کا اسلحہ سنگاپور کے ڈپو ہی میں جمع کیا جائے۔ اگلے اسٹیشن پر نیا اسلحہ مہیا ہو گا۔

یہ فروری کی ۱۵ تاریخ اور سوموار کا دن تھا جب پریڈ کے دوران ایک بریگیڈیئر جنرل نے یونٹ سے الوداعی خطاب کے دوران نئی جگہ جانے کے احکامات صادر کیے۔ لیکن مقام تعیناتی کو جوانوں سے خفیہ رکھا گیا۔ اس وجہ سے جوانوں کو شک ہوا کہ کہیں انہیں سمندر میں غرق کرنے یا محاذ ترکی پر اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خلاف لڑنے تو نہیں بھیجا جا رہا؟ اس اندیشے کے سبب جوانوں میں مزید بے چینی اور اضطراب نے جنم لیا۔

۸۵۰ فوجیوں پر مشتمل پانچ نمبر پلٹن کو لے جانے کی خاطر بحری جہاز سنگاپور کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہو گیا۔ یونٹ میگزین سے اسلحہ ٹرک میں منتقل کرنے کے لیے بعد دوپہر فوجی ٹرکوں میں لوڈ ہونا شروع ہوا۔ اسی دوران منصوبے کے مطابق سہ پہر تین بجے کوارٹر گارڈ ڈیوٹی پر تعینات سپاہی محمد اسماعیل نے پہلی گولی چلا کر اعلانِ بغاوت کر دیا۔ جلد ہی تقریباً چار سو مجاہدین نے انگریز افسروں کو قتل کر کے بیرکیں نذر آتش کر دیں۔ اب انگریز فوج اس علاقے میں تعینات دیگر فوجی دستے اور سنگاپوری سپاہی حریت پسندوں کے تعاقب میں آئے۔ نیز ریڈیو اور وائرلیس کے ذریعے بغاوت کی اطلاع ہر جگہ پہنچا دی گئی۔ نیز اتحادی سمندری جنگی جہازوں سے اپیل کی گئی کہ وہ سنگاپور بندرگاہ پہنچ جائیں۔

سنگاپور میں جرمنی کے تین سو جنگی قیدی بھی قید تھے۔ مجاہدین آزادی انہیں آزاد کرانے پہنچ گئے۔ ابتدا

مجاہدین کے سینوں میں گولیاں مار کر انہیں شہید کیا جا رہا ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں انھوں نے پہرے پر متعین گارڈز کو ٹھکانے لگایا۔ پھر کیمپ کے تالے توڑ کر ان جنگی قیدیوں کو آزاد کرایا اور پھر انھیں اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اتنے سہمے ہوئے تھے کہ صرف سترہ جرمن اور تین ولندیزی جنگی قیدی ہی ساتھ رہنے پر آمادہ ہوئے۔ باقی راہِ فرار اختیار کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکے۔

کچھ جوانوں نے ساحلِ سمندر کیپل ہاربر اور پاسر جنجنگ کا رخ کیا جہاں تاج گوروں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ وہاں ایک جج اور کئی انگریز نشانہ بنے جبکہ دو تین خواتین بھی گولیوں کی لپیٹ میں آگئیں۔ کیونکہ اندھیرا چھا چکا تھا اس لیے باقی انگریزوں کو کشتیوں میں بیٹھ کر راہِ فرار اختیار کرنے کا موقع مل گیا۔ مجاہدین کے ایک گروہ نے کرنل مارٹن اور دیگر انگریز افسروں کے بنگلوں کا محاصرہ کر لیا لیکن وہاں سخت حفاظتی انتظامات تھے۔ ساری رات طرفین میں گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔

اسی اثنا میں محصور انگریزوں نے مزید کمک منگائی جہاں پہنچ ہونے پر جوانوں کو محاصرہ اٹھانا پڑا۔ اب حریت پسندوں نے چھاپہ مار حملوں کا آغاز کیا۔ تین دن تک فریقین میں سخت مقابلہ ہوا۔ ۱۷ فروری بروز بدھ انگریزوں کی مدد کے لیے فرانسیسی روسی اور جاپانی جنگی بحری جہاز سنگاپور پہنچ گئے۔ اب ہزاروں تازہ دم مسلح فوجی پانچ نمبر پلٹن کی مختصر اور محدود جمعیت کو کچلنے کے لیے سنگاپور شہر اور اطراف میں پھیل گئے اور انھوں نے مجاہدین پر بہت ظلم ڈھائے۔ (جاپان کو اس ظلم کا خمیازہ دوسری جنگِ عظیم میں بھگتنا پڑا۔)

واضح رہے سنگاپور تین اطراف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے جبکہ چوتھی جانب گھنا جنگل ہے۔ ایسے عالم میں حریت پسند باہر سے کمک پہنچنے کی توقع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ادھر ان کا اسلحہ بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ ناچار انھیں جنگل میں روپوش ہونا پڑا جبکہ کچھ نے جوہور (Johor) ریاست میں پناہ لینا چاہی۔ سلطان جوہور انگریزوں کا پٹھو نکلا۔ اس نے پذیرائی حاصل کرنے کی غرض سے آنے والے جوانوں کو دھوکے سے انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار کروا دیا۔

یہ فروری کی ۲۰ تاریخ تھی جب رنگون سے بھیجی مزید کمپنیاں انگریزوں کی مدد کے واسطے پہنچ گئیں۔ یوں کئی گنا افرادی قوت کے بل پر بغاوت پر قابو پا لیا گیا۔ گرفتار جوانوں کا کورٹ مارشل ہوا۔ ان کی اکثریت کو سرِعام سخت اذیتیں دے کر فائرنگ اسکواڈ کے ذریعے گولیوں کا نشانہ بنا کر شہید کیا گیا۔ یہ امر لائقِ ذکر ہے کہ سنگاپور کے ایک متمول مسلمان تاجر قاسم اسماعیل بھی حریت پسندوں کی مدد کرنے کے باعث کھلے عام فائر کر کے شہید کیے گئے۔

مجاہدین کی قیادت صوبے دار دوندے خان، جمعدار عبدالعلی خان اور جمعدار چشتی خان کر رہے تھے۔ جمعدار عبدالعلی جنگِ آزادی کے دوسرے ہی دن شہید ہو گئے۔ جبکہ صوبیدار دوندے خان اور جمعدار چشتی خان کو ۲۱ اپریل ۱۹۱۵ء کی سہ پہر فائرنگ اسکواڈ کے ذریعے سرِعام گولیاں مار کر شہید کیا گیا۔ برطانوی ریکارڈ کے مطابق اس بغاوت میں ۴۷ برطانوی (فوجی ۳۳، سویلین ۱۴) افراد مارے گئے جبکہ ایک فرانسیسی اور تین روسی زخمی ہوئے۔ ایک سو سے زائد مجاہدین مقابلے میں شہید ہوئے۔ گرفتار جوانوں کو کورٹ مارشل کے تحت درج ذیل سزائیں دی گئیں:

سزا	افراد
سزائے موت	۴۷

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تاحیات قید بامشقت	۴۳
بیس سال قید بامشقت	۸
پندرہ سال قید بامشقت	۲۶
دس سال قید بامشقت	۳۰
سات سال قید بامشقت	۹
پانچ سال قید بامشقت	۳
تین سال سے کم قید بامشقت	۱۴
میزان	۲۰۱

ان کے علاوہ مالے اسٹیٹ گائیڈز میل بیٹری (آرٹلری) کے گیارہ مسلمانوں کو بھی نو ماہ تا دو سال قید کی سزا دی گئی۔ پانچ نمبر پلٹن کے صوبیدار میجر خان محمد خان (وفات ۱۹۳۶ء)، صوبیدار محمد یونس خان، جمعدار ہوشیار علی خان، جمعدار ایڈجوٹنٹ رحمت خان اور جمعدار فتح محمد المعروف فتو کو نوکری سے جبری برخاست کر دیا گیا۔

بغاوت کچلنے میں اہم کردار ادا کرنے والے صوبیدار واحد علی خان کو صوبیدار میجر بنایا گیا۔ بعدازاں واحد علی خان کو تمغہ انڈین آرڈر آف میرٹ (IOM) ملا اور وہ آنریری لفٹیننٹ بھی رہا۔

انگریزوں نے زندہ بچ رہنے والے زیرِحراست جوانوں کو ہر ممکن اذیت دے کر نیز ترغیب و تحریص کے ذریعے ترکی کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر قائل کرنا چاہا لیکن وہ کسی قیمت پر آمادہ نہیں ہوئے۔ آخر انھیں سخت حفاظتی انتظامات کے تحت افریقا کے محاذ پر جرمنوں کے خلاف لڑنے بھیج دیا گیا۔

پانچ نمبر پلٹن کے بقیۃ السیف جوانوں کی جرمن افواج سے معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ پیش بندی کے طور پر برطانوی فوج ان کے عقب میں متعین کی گئی تاکہ کسی مرحلہ پر وہ جرمنوں سے نہ مل جائیں۔ نیز ہر گورے فوجی کو اختیار دیا گیا کہ اگر کوئی ہندوستانی فرار ہو تو اسے بلادریغ گولی مار دی جائے۔

پانچ نمبر پلٹن کے جوانوں نے باہمی مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ دونوں طرف موت کا منہ کھلا ہے اور اس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ اس لیے جب مرنا ہی ٹھہرا تو مدمقابل فوج کا مردانہ وار مقابلہ کر کے موت سے ہمکنار ہونا زیادہ بہتر ہے۔ یوں قوم کی جرأت و بسالت سے مملو تاریخ میں ایک اور تابناک باب کا اضافہ ہوگا۔

چنانچہ ۲۹ جون ۱۹۱۷ء کو ایک سو پچاس جوانوں نے ایک مشکل ترین محاذ پر حملہ کر دیا جہاں ان کے مقابل دشمن کی تین کمپنیاں تھیں۔ اس مقابلے میں تقریباً ایک سو جوان جاں بحق ہوئے۔ اس واقعہ کا تذکرہ مسٹر ایم ایس لے نے ۱۹۲۲ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب "The Punjab and The War" کے صفحہ ۱۲۹ پر کیا ہے۔

ایسے ہی ایک اور محاذ پر جہاں انگریزوں کو مسلسل چار دن گھمسان کی لڑائی کے باوجود کامیابی نہیں ہو رہی تھی، وہاں اسی پانچ نمبر پلٹن کے بقیۃ السیف جوانوں کو بھیجا گیا۔ انھوں نے ۶ نومبر ۱۹۱۷ء کو سخت مقابلے کے بعد مذکورہ علاقہ فتح کر لیا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، پانچ نمبر پلٹن کے جوانوں کی بڑی تعداد دوران جنگ آزادی انگریزی دستوں سے جھڑپوں میں شہید ہو گئی تھی۔ جبکہ سیکڑوں کو کورٹ مارشل کے تحت گولیوں سے اڑا کر سزائے موت دی گئی۔ سیکڑوں ہی افریقا میں جرمن افواج کے ساتھ مقابلے میں کام آئے۔ لہٰذا جنگ کے اختتام تک بہت کم جوان زندہ بچ رہے۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد ۱۹۲۲ء میں پانچ نمبر پلٹن توڑ دی گئی۔

◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نڈر دلیر شاہینوں کا

موت سے دوبدو مقابلہ

پاکستانی ہوابازوں کی مہارت اور چابک دستی کا یادگار سچا واقعہ

لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود

۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجا جموں و کشمیر نے ریاست کو بھارت کا حصہ بنا ڈالا۔ دوسرے ہی دن بھارتی فوج ریاست میں داخل ہو گئی تاکہ اس پر غاصبانہ قبضہ کر سکے۔ اس وقت تک مجاہدین پاکستان گلگت پونچھ اور میرپور میں اپنا کام کر چکے تھے۔ تاہم جیسے ہی بھارتی فضائیہ حرکت میں آئی، شمالی علاقہ جات بھی پاکستان سے کٹ کر رہ گئے۔

دراصل بھارتی فضائیہ "۲۸" ٹیمپسٹ (Tempest) جنگی طیارے رکھتی تھی۔ یہ برطانوی طیارہ چند سال قبل ہی وجود میں آیا تھا۔ ہندوستانی شاہی فضائیہ کا حصہ تھا۔ پاک فضائیہ کو ایسے صرف ۱۲ جنگی طیارے ہی مل سکے۔ مزید برآں بھارتی فضائیہ کے پاس وافر اسلحہ تھا۔ دوسری طرف پاک افواج کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیشتر اسلحہ بھارتی گوداموں میں پڑا سڑ رہا تھا۔ بھارتی حکومت دانستہ اسے پاکستان کو نہیں دینا چاہتی تھی۔

لہٰذا بھارتی ٹیمپسٹ طیاروں نے شمالی علاقہ جات میں پروازیں شروع کیں تو پاک فوج کو مجبوراً وہاں اپنی سرگرمیاں معطل کرنا پڑیں۔ ابھی وہ اس قابل نہیں تھی کہ وہاں طیارہ شکن توپیں پہنچا دیتی۔ یوں شمالی علاقہ جات میں قریباً ڈھائی لاکھ شہری محصور ہو کر رہ گئے۔ ان میں عسکری عملہ بھی شامل تھا۔

آخر فیصلہ ہوا کہ مال بردار جہاز کے ذریعے محصورین تک امدادی سامان پہنچایا جائے۔ تب تک پاک فضائیہ کو ڈکوٹا نامی دو مال بردار جہاز مل چکے تھے۔ مگر دوسری جنگ عظیم میں حصہ لینے کے باعث ان کی حالت خاصی بگڑ چکی تھی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان کی مرمت اور مرمت ہو جائے...... مگر اتنا وقت کہاں تھا؟

مزید برآں گلگت چلاس، بونجی اسکردو وغیرہ میں امدادی سامان گرانا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ راہ میں کئی دشواریاں اور مشکلات حائل تھیں۔

پہلی مشکل یہ تھی کہ مال برداری کے لیے مخصوص پاک فضائیہ کا سکواڈرن نمبر ۶ صرف دو ہوابازوں پر مشتمل تھا۔ اور کوئی ہواباز بلندی پر جا کر امدادی سامان گرانے کا تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ تاہم ہوابازوں کی حب الوطنی اور جوش و جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ موت کے خوف پر غالب آ گیا۔ انھوں نے سامان لے جانے کی ہامی بھر لی۔

چناں چہ حکومت نے ایک ڈکوٹا طیارہ مع عملہ رسالپور بھجوا دیا۔ اس وقت مستقبل کے ایئر چیف اصغر خان رسالپور فضائی مستقر کے سربراہ تھے اور انھی کی راہنمائی میں غالباً طیارے نے اپنی خدمات انجام دی تھیں۔

طیارے کا بندوبست ہو چکا تو دوسرا کٹھن مرحلہ سامنے آیا۔ ڈکوٹا دس ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر نہیں اڑ سکتا تھا۔ مزید برآں خرابی کی صورت میں اس کا کوئی متبادل بھی موجود نہ تھا۔ لہٰذا نہایت تجربے کار اور مستعد عملہ ہی فضا میں جہاز کی مطلوبہ دیکھ بھال کرنے کے قابل تھا۔

جہاز کی استعداد و حالت زار مدنظر رکھ کر فیصلہ ہوا کہ وہ دریائے سندھ کی وادی کے اوپر پرواز کرے۔ یوں وہ چلاس، بونجی، گلگت اور اسکردو پہنچ کر متاثرین کو امدادی سامان فراہم کر سکتا تھا۔ لیکن اس راستے میں بھی ۲۰ تا ۱۴ ہزار فٹ بلند پہاڑ واقع تھے۔ نیز وادی اتنی تنگ تھی کہ ڈکوٹا ایمرجنسی کی صورت نہیں اتر نہیں سکتا تھا۔

تیسرا مشکل مرحلہ یہ تھا کہ وادی میں موسم پل میں تولہ اور پل میں ماشہ جیسا مزاج رکھتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ایسے جدید ترین آلات بھی میسر نہیں تھے جو وادی میں اولتے بدلتے موسم کو نوٹ کر لیتے۔ گویا جب بھی جہاز کسی خطرے میں گرفتار ہو جاتا تو یہ کپتان کی لیاقت، جرأت اور ذہانت پر منحصر تھا کہ وہ اسے کیسے محفوظ رکھتا ہے۔

چوتھا خطرہ بھارتی جنگی طیاروں کی صورت فضا میں ہر وقت منڈلاتا رہتا۔ اب وہ گاہے گاہے پاکستانی چوکیوں پر فائرنگ بھی کرنے لگے تھے۔ پاکستانی حکومت نے ڈکوٹا کی حفاظت کے لیے کوئی ٹیمپسٹ طیارہ متعین نہیں کیا۔ دراصل وہ جنگ پھیلانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی تمام تر توجہ پاکستان کو مستحکم کرنے پر مرکوز تھی۔

اوائل دسمبر میں فلائنگ آفیسر سید محمد شاہ ڈکوٹا کی پہلی پرواز میں امدادی سامان لیے شمالی علاقہ جات پہنچے۔ جان جوکھم کی یہ مہم کامیابی سے انجام پائی۔ نتیجے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں بھی لوگوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ بعدازاں روزانہ صبح سے شام تک ڈکوٹا متاثرین تک امدادی سامان پہنچانے لگا۔

اکلوتا ڈکوٹا صبح سویرے اپنے کٹھن سفر کا آغاز کرتا۔ کبھی کبھی تیز و تند طوفان سے سامنا ہوتا تو کئی کترا کر نکل جاتا۔ خطے کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ بلند و بالا چوٹیوں سے مناسب فاصلہ رکھیں۔ جہاز کسی بھی پہاڑ سے ٹکراتا تو اس کے پرخچے اڑ جاتے اور شاید لاشوں کا نام و نشان بھی نہ ملتا۔

رفتہ رفتہ پاک فضائیہ کے ہنرمندوں نے مزید دو ڈکوٹا جہاز مرمت کر کے رسالپور بھجوا دیے۔ یوں متاثرین تک وافر سامان پہنچنے لگا۔ اسی دوران کشمیر میں مجاہدین کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی اور انھوں نے بہت سا علاقہ آزاد کرا لیا۔

اپنی بری فوج کی ناکامیوں نے بھارتی فضائیہ کو غم و غصے میں مبتلا کر دیا۔ اب بھارتی ہواباز بھوکے بھیڑیوں کی طرح گلگت و بلتستان کی فضاؤں میں منڈلانے لگے۔ انھیں کسی پاکستانی طیارے کی تلاش ہوتی تاکہ اسے تباہ کر کے اپنی کامیابی کا ڈھول بجا سکیں۔ آخر ایک دن انھیں موقع مل ہی گیا۔ مگر پاکستانی ہواباز کی زبردست دلیری اور ذہانت نے ان کے ناپاک عزائم خاک میں ملا دیے۔

یہ ۴ نومبر ۱۹۴۸ء کی بات ہے جب چلاس کے اوپر فضا میں پاکستانی ڈکوٹا اور دو بھارتی ٹمپسٹ جنگی طیاروں کے مابین ٹاکرا ہوا۔ فلائنگ آفیسر مختار احمد ڈوگر ڈکوٹا کے کپتان تھے۔ دیگر عملے میں معاون ہواباز فلائنگ آفیسر انفریڈ جگ جیون اور ہواباز آفیسر منیر شاہ تھے۔ جہاز پر پاک فوج کے سپاہی نائیک محمد دین اور ایئر کلرک سید محمد محسن بھی سوار تھے۔

یہ جہاز اسکردو کے نزدیک ایک رتیلے میدان میں سامان گرا کر واپس رسالپور جا رہا تھا کہ دو بھارتی ٹمپسٹ اس سے آن ٹکرائے۔ بعدازاں جو حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا، وہ کیپٹن مختار احمد ڈوگر کی زبانی ہے:

☆☆

ہم صبح سویرے نکلے تھے اور اپنا مشن کامیابی سے انجام دیا۔ واپسی پر میں نے جہاز کی کمان جگ جیون کو دی اور خود آنکھیں بند کیے سستانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جگ جیون نے مجھے آواز دی اور دائیں طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا، دو ٹمپسٹ اڑتے ہوئے ہماری سمت آ رہے تھے۔

میں پہلے یہی سمجھا کہ وہ پاکستانی شاہین ہیں کیونکہ اس وقت تک پاکستانی ٹمپسٹوں نے علاقے میں پرواز شروع کر دی تھی۔ لیکن نزدیک آنے پر انکشاف ہوا کہ یہ تو دشمن کے جہاز ہیں۔ تب میں نے پھرتی سے ڈکوٹا کا کنٹرول سنبھال لیا۔ بھارتیوں کو شاید پتا چل گیا تھا کہ میں آرام کر رہا ہوں۔ لہٰذا انھوں نے مجھے سکون کی چند گھڑیاں نہ گزارنے دیں۔

یاد رہے کہ ڈکوٹا کی زیادہ سے زیادہ رفتار ۲۲۴ میل فی گھنٹا تھی۔ جبکہ ٹمپسٹ ۴۳۶ میل فی گھنٹا کی رفتار سے اڑ سکتا تھا۔ لہٰذا ان دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے بھارتی لڑاکا طیارے ہم پر حملے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیے مچلنے لگے۔

ہماری خوش قسمتی کہ ہم تب وادی چلاس پر پرواز کر رہے تھے۔ یہ وادی چار پانچ میل چوڑی ہے۔ لہٰذا ہم جہاز کو دائیں بائیں حرکت دے سکتے تھے۔ میں جہاز پوری رفتار سے رسالپور کی سمت اُڑانے لگا۔ اچانک جہاز کے ریڈیو میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور پھر ایک بھارتی نیمپسٹ کے ہواباز نے انگریزی میں مجھے حکم دیا "چپ چاپ اپنا رخ قریبی بھارتی ہوائی اڈے کی طرف موڑ لو۔" مگر میں نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ یہ حکم تین بار دہرایا گیا مگر میں نے اُسے نظرانداز کر دیا۔

اب بھارتی ہوابازوں کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے فضا میں یہ دکھانے کے لیے مشین گن کا برسٹ مارا کہ وہ مسلح ہیں۔ مگر میں نے تھروٹل کو پوری قوت سے دبائے رکھا۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد وادی کے تنگ مقام تک پہنچ جاؤں۔

جب ڈکوٹا نے رفتار پکڑی، تھوڑا بہت لرزنے اور دائیں بائیں لہرانے لگا تو پاک فوج کے دونوں سپاہی کچھ چوکنا ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ میں انھیں متاثر کرنے کے لیے ہوابازی کے کرتب دکھا رہا ہوں۔ لیکن جب ان پر افشا ہوا کہ نہ صرف میری بلکہ ہم سب کی جانیں خطرے میں ہیں تو وہ اپنی نشستوں پر واپس چلے گئے۔

کچھ دیر بعد نائیک محمد دین اور جگ جیون رام جہاز کے دروازے پہ کھڑے ہو کر بھارتی طیاروں کو دیکھنے کی سعی کرنے لگے۔ انھیں علم نہ تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے۔

اس وقت ایک بھارتی نیمپسٹ نے اڑان بھری، ساتھی سے الگ ہوا اور حملے کے موڈ میں آ گیا۔ اب وہ کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ بھارتی تو پچی نے دونوں پاکستانیوں کو نشانے پہ لیا اور مشین گن کا فائر کھول دیا۔ محمد دین کے سینے اور جگ جیون رام کے بازو پہ گولیاں لگیں۔ دونوں کے بدنوں سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

تب تک وادی کا سب سے تنگ علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً نیچے غوطہ لگا دیا۔ پھر ائیر سگنلر کو پکار کر کہا "میرے پیچھے آ کر کھڑے ہو جاؤ۔ جب بھی بھارتی طیارے حملہ کرنے آئیں، تم مجھے پیر سے ٹہوکا دے دینا۔"

جہاز کے دیگر لوگ تو زخمیوں کو بچانے کی کوشش کرنے لگے، ہم بھارتیوں کو غچہ دینے میں محو ہو گئے۔ نیمپسٹوں نے تین بار ہم پر حملہ کیا..... اور تین بار مجھے پیروں سے ٹہوکے لگے۔

جب بھی بھارتی برسٹ مارتے، میں تھراٹل رڈر اور فلیپس (ڈکوٹا کے آلات) پوری مہارت، چستی اور طاقت سے استعمال کرتے ہوئے جہاز کا رخ موڑ لیتا۔ یوں ان کے برسٹ خالی جاتے۔ چند گولیاں جہاز کو لگیں مگر خوش قسمتی سے انجن محفوظ رہا۔ اس طرح ہم بھارتی پائلٹوں اور موت کو چکمہ دینے میں کامیاب رہے۔

اس دوران میں ڈکوٹا دریائے سندھ کے انتہائی قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر میں جہاز تھوڑا مزید نیچے کرتا تو شاید وہ کسی درخت سے ٹکرا جاتا۔ تبھی میں نے زیرلب کہا: "بھارتیو! اگر اب تک تم ہمیں نہیں پکڑ سکے تو پھر کبھی ہماری گرد تک نہیں پا سکتے۔"

میرا کہا درست ثابت ہوا اور دونوں نیمپسٹ ہمت ہار کر فضا کی وسعتوں میں گم ہو گئے۔ یوں شاہینوں نے فضاؤں میں دشمن سے جو پہلا حیرت انگیز

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

معرکہ لڑا۔ وہ اپنی ہمت، ذہانت اور ثابت قدمی کے بل بوتے پر جیت لیا۔

☆☆

بھارتی گدھوں اور پاکستانی شاہینوں کا یہ معرکہ تقریباً آدھ گھنٹے جاری رہا۔ بھارتی ہوابازوں کو یقین تھا کہ پاکستانی ڈکوٹا ان کے قبضے میں آ چکا۔ اسی لیے وہ شروع میں بڑے پرسکون رہے۔

لیکن مختار احمد ڈوگر کے لیے یہ محض زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ وہ ہر قیمت پر پاکستان کی آن و شان برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے وطن کا پرچم بلند رکھنے کی خاطر اپنی جان داؤ پر لگا دی۔ یادگار داستانِ شجاعت دکھانے پر ہی انھیں وطنِ عزیز کا تیسرا بڑا جنگی اعزاز ستارہ جرأت دیا گیا۔ یہ پاکستان کا پہلا ستارہ جرأت بھی تھا۔

عملۂ جہاز نے سرتوڑ کوشش کے بعد جگ جیون رام کی جان تو بچا لی مگر نائیک محمد دین زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ یہ بات خاصی حیران کن ہے کہ پاک بھارت کے درمیان جو پہلی فضائی جھڑپ ہوئی اس میں شہادت کا اعزاز بری فوج سے تعلق رکھنے والے ایک جوان کو نصیب ہوا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

یہ معرکہ نوزائیدہ پاک فضائیہ کے لیے پہلی فتح ثابت ہوا تاہم دن کے وقت ڈکوٹا کی پروازیں روک دی گئیں۔ ظاہر ہے اب وہ بھارتیوں کے لیے تر نوالہ ثابت ہوتا مگر متاثرین تک سامان پہنچانا بھی ضروری تھا۔

پاکستانی شاہینوں نے مسئلے کا حل یہ نکالا کہ چند ہفتے رات کو پشاور کے نزدیک پہاڑوں پہ ڈکوٹا اڑانے کی مشقیں کیں۔ اس کے بعد ایک رات ڈکوٹا اڑا کر شمالی علاقہ جات لے گئے۔ رات کی اس پہلی پرواز میں کمانڈر رسالپور، اصغر خاں بنفسِ نفیس سوار تھے تاکہ جوانوں کا حوصلہ بڑھا سکیں۔

یہ پرواز کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ چناں چہ دلیر پاکستانی ہواباز راتوں کو ڈکوٹا اڑانے لگے۔ وہ شام کو اندھیرا چھاتے ہی کام کا آغاز کرتے اور صبح ہونے تک مصروفِ کار رہتے۔ یوں انھوں نے جانفشانی سے اپنا ہر مشن پورا کیا۔

پاکستانی شاہینوں نے اوائل ہی میں اپنی بہادری اور فرض شناسی کا سکہ دشمن کے دلوں پہ بٹھا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں بھارتی ہواباز جوں ہی پاکستانی طیاروں کو دیکھتے، تو دم دبا کر بھاگ جاتے۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

☆۔ جن سے تم علم سیکھتے ہو اور جن کو سکھاتے ہو، ان کی عزت کرو۔ (الحدیث)

☆۔ جس نے مجھے ایک حرف کی تعلیم دی ہے اس نے مجھے غلام بنا لیا۔ (حضرت علیؓ)

☆۔ ایک حقیقی استاد کوئی پیشہ ور کتابیں پڑھانے والا آدمی نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت وہ ایک مشنری ہوتا ہے اور اگر مشنری جذبے سے کوئی شخص معلم کا کام نہیں کرتا تو وہ ملازم ہے معلم نہیں ہے۔ (ابوالاعلیٰ مودودیؒ) (اقلیب جان، اسلام آباد)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جب قوم بیدار ہوئی

عدو کے حملے نے پاکستانیوں میں وطن کی خدمت کا لازوال جذبہ پیدا کر دیا

فخر حیات

بھارتی فوج ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی شب اچانک پاکستان پر حملہ آور ہوئی۔ بھارتی جرنیلوں کا ارادہ تھا کہ وہ صبح کو ناشتا لاہور کے جم خانے میں کریں گے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں بار بار شکست کھانے کے باوجود ہندوؤں کو یہ ہوش نہیں آیا کہ جس قوم سے وہ ٹکرا رہے ہیں وہ کٹ تو سکتی ہے جھک نہیں سکتی۔

اس جنگ میں پاک افواج نے جو کردار ادا کیا، اس کی مثال عسکری عالم میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ لیکن پاکستانی قوم کا کردار بھی اپنی مثال آپ رہا۔

یہ حقیقت ہے کہ جنگ محض ہتھیاروں ہی سے نہیں جذبوں سے بھی جیتی جاتی ہے۔ اس وقت یہ جذبے پاکستانی قوم میں بیدار تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شاہینوں کے شہر سرگودھا نے بھی ایک خوبصورت مثال قائم کی۔ یہ شہر میرے قصبے لالیاں سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔

سرگودھا ائیربیس کا کمانڈر بیان کرتا ہے "جنگ کے دنوں میں اڈے کی حفاظت کے لیے اضافی فوج آئی ہوئی تھی۔ ان جوانوں کے لیے چارپائیوں کی ضرورت پڑی۔ سرگودھا کی ایک مسجد سے اعلان کیا گیا کہ فوجیوں کے لیے بستر اور چارپائیوں کی ضرورت ہے۔ میرے ذہن میں تھا کہ کچھ بستر اور چارپائیاں مل جائیں گی جو ناکافی ہوں گی لیکن میں نے دیکھا کہ ایک ہی گھنٹے میں پی اے ایف بیس انسانوں اور گاڑیوں سے بھر چکا تھا۔ ہر ایک کے پاس یا تو بستر تھے اور چارپائیاں تھیں۔ مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اجتماعی قربانی

سابقہ سالوں کی طرح ادارہ آمنہ جنت فاؤنڈیشن اس سال بھی قربانی کا اہتمام کر رہا ہے آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ قربانی کریں اپنے لیے، اپنے والدین اور مرحومین کے بلند درجات کے لیے۔
اس سال قربانی کے جانور اور حصے کی تفصیل یہ ہے

دنبہ	وزن	درمیانہ	1 عدد	8 ہزار روپے
چھترا	وزن	درمیانہ	1 عدد	10 ہزار روپے
بکرا	وزن	درمیانہ	1 عدد	15 ہزار روپے
گائے	بھاری	فی حصہ	1 عدد	9 ہزار روپے مکمل: 63 ہزار روپے
گائے	فی حصہ	فی حصہ	1 عدد	7 ہزار روپے مکمل: 49 ہزار روپے
اونٹ	بھاری	فی حصہ	1 عدد	10 ہزار روپے
اونٹ	درمیانہ	فی حصہ	1 عدد	8 ہزار روپے

اجتماعی قربانی میں شامل ہونے والے تمام احباب کو قربانی سے ایک دن پہلے تک اپنے حصے کی تمام رقم ادارہ ہذا میں جمع کرانا ہوگی۔ مقامی احباب چاہیں تو گوشت قربان گاہ سے خود وصول کر لیں یا اپنا مکمل پتا دیں، ادارے کی طرف سے بلا معاوضہ پہنچا دیا جائے گا۔ قربانی میں شامل ہونے والے تمام احباب 10 دن پہلے اپنا نام درج کرا دیں۔ شکریہ!

بیرون احباب سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں اجازت دیں کہ ہم ان کے حصے کا گوشت یہاں تقسیم کر دیں، یہ اجازت سے ہوگا۔ نیز جانوروں کی خریداری شروع کر دی گئی ہے۔ جو احباب جانور دیکھ کر شامل ہونا چاہیں تو وہ شام 5 بجے سے 7 بجے کے درمیان تشریف لا کر ملاحظہ فرمائیں۔

آپ اپنی قربانی کی رقم بذریعہ چیک یا ڈرافٹ ارسال کرنا چاہیں تو ڈرافٹ یا چیک آمنہ جنت فاؤنڈیشن اکاؤنٹ:02745 ایم سی بی، چونیاں برانچ نمبر 0240 کے نام بھجوائیں۔ رقم آن لائن بھی جمع کرا سکتے ہیں۔ اس صورت میں مطلع ضرور کریں۔ آن لائن اکاؤنٹ ایم سی بی:PK86MUCB0673440401002745
ٹائٹل اکاؤنٹ: آمنہ جنت ویلفیئر فاؤنڈیشن ایم سی بی چونیاں برانچ۔

مزید رابطے کے لیے:

رضیہ پروین، پرنسپل آمنہ جنت فاؤنڈیشن، ماڈل اسکول، چونیاں، ضلع قصور۔
فون: 0300-4735932- 0322-7614497

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کی توقع بالکل نہیں تھی۔

"ہم نے ضرورت کے مطابق بستر اور چارپائیاں لے لیں اور باقی لوگوں کو واپس لے جانے کا کہا۔ وہ غصے سے چارپائیاں اور بستر پھینک کر بولے اگر ہم سے یہ سامان نہیں لینا تو ہم بھی اسے واپس نہیں لے جائیں گے۔ ان کا یہ جذبہ اور خلوص دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے دل سے کہا کہ اس قوم کے لوگوں میں ایسا جذبہ ہے تو دنیا کی کوئی قوم اسے شکست نہیں دے سکتی۔"

اسی زمانے میں ایک بھکاری سارا دن لاہور کے گھروں میں پھرتا رہتا۔ لیکن وہ روٹی کے بجائے پیسے مانگتا۔ لوگ لعن طعن کرتے ہوئے کہتے کہ آج وطن کو رقم کی زیادہ ضرورت ہے۔ لیکن وہ ان کی جھڑکیاں سن کر بھی پیسوں کے لیے اصرار کرتا۔ ایک شام وہ جمع کردہ رقم کے ساتھ اس جگہ پہنچا جہاں فوج کے لیے امدادی کیمپ بنائے گئے تھے۔ اس نے ساری جمع پونجی ریلیف فنڈ میں جمع کرائی۔ پھر ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھا اور جھولے سے خشک روٹی نکال پانی میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگا۔ ایک صحافی یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ بھکاری نے بڑے جذبے سے جواب دیا "آج ان پیسوں کی وطن کو زیادہ ضرورت ہے۔ میرا وطن سلامت رہے گا تو مجھے بھی رزق ملتا رہے گا اور میں کبھی بھوکا نہیں مر سکتا۔"

جب فوجی جوانوں کے لیے خون کی ضرورت پڑی تو بھی پاکستانیوں نے عجیب و غریب مثال قائم کر دی۔ بلڈ بینک کے سامنے لوگوں کی لمبی لمبی قطاریں لگ گئیں۔ جب بلڈ بینک بھر گئے تو لوگوں کے گھروں سے عارضی طور پر فریج مانگ کر خون کی بوتلیں محفوظ کی گئیں۔ قطار میں لگا ایک دبلا پتلا نوجوان بڑا پرجوش تھا کہ اپنے وطن کے کچھ تو کام آئے گا۔

وہ اپنی باری پر اندر گیا۔ اس کا وزن ہوا تو کم نکلا۔ کم وزن کی وجہ سے اس کا خون نہ لیا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ باہر نکلا سامنے کی دکان سے دو کلو کا باٹ مانگا اور یہ جتائی کہ کم وزن کی وجہ سے اس کا خون نہیں لیا گیا جب کہ وہ دینا چاہتا ہے۔ یہ سن کر دکاندار نے دوسری بات نہیں کی اور اسے باٹ دے دیا۔ وہ باٹ اپنے کپڑوں میں چھپا کر پھر قطار میں لگ گیا۔ اب وزن پورا نکلا۔ ہجوم کی وجہ سے کسی نے دھیان نہیں دیا کہ یہ وہی نوجوان ہے جس کا وزن کم تھا۔ جوان خون دے کر باہر نکلا اور دکاندار کو شکریے کے ساتھ باٹ واپس کر کے چلا گیا۔

چونڈہ سیالکوٹ کا محاذ جہاں دوسری جنگ عظیم کے بعد ٹینکوں کی سب سے بڑی لڑائی ہوئی تھی وہاں محاذ پر جاتے ہوئے فوجیوں کو دو معصوم بہن بھائیوں نے روک لیا۔ انھوں نے انڈے اور مرغ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم اور خدمت نہیں کر سکتے' ہماری طرف سے یہ حقیر نذرانہ قبول کر لیجیے۔ بریگیڈیئر ان کا یہ جذبہ دیکھ کر آنکھوں میں مسرت کے آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے گاڑی سے نیچے اترا اور ان بچوں کو پیار کرتے ہوئے کہا "میرے بچو! ہمیں ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تمہاری معصوم دعاؤں کی ضرورت ہے تاکہ ہم دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا کر تمہاری اس معصومیت کی حفاظت کر سکیں۔"

یہ واقعات پڑھ اور سن کر اب وہ پاکستانی ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں جن کے دلوں میں آج بھی کچھ لگن اور احساس باقی ہے ورنہ سب کے لیے ایسا نہیں۔ آج ہمارے ملک میں درپردہ غیر مسلم ممالک کا راج ہے۔ ہم خدا کے بجائے اس کمزور سہارے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارا دین تو ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے کہ غیر مسلم مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔ لیکن ہم یہ حقیقت بھولتے جا رہے ہیں۔ تو کیا...... ہم واقعی مسلمان ہیں؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کا آغاز ۲۲/اکتوبر ۲۰۰۹ء کی صبح ایسے وقت ہوا جب پاک افغان سرحد (ڈیورنڈ لائن) پر نوا پاس کے مقام پر تعینات ایف سی کے جوانوں کو سامان رسد اور اسلحے کی سخت کمی کا سامنا تھا۔

کئی روز سے خراب موسم کے باعث رسد کی کوئی پرواز نہیں بھیجی جا سکی تھی۔ دہشت گردوں کی مسلسل ہٹ دھرمی اور یکے بعد دیگرے بلااشتعال کارروائیوں نے حکومت کو مجبور کر دیا تھا کہ آپریشن کی راہ اختیار کی جائے۔ چناں چہ جوابی کارروائی میں پاک فوج کا "آپریشن راہِ نجات" شروع ہوا۔ باجوڑ ایجنسی میں پاک افغان سرحد کے قریب بڑی سطح پر آپریشنز کی ذمہ داری پشاور کور کی تھی۔ پشاور کور نے مختلف مقامات پر ہنگامی طور پر اپنی سپاہ تک سامان حرب و ضرب اور اشیائے خورونوش پہنچانے کے لیے پاکستان ایوی ایشن کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ باجوڑ اسکاؤٹس کے قلعہ خار سے سامان رسد ہیلی کاپٹر پر لاد کر عین پاک افغان سرحد پر نوا پاس کے مقام پر ذخیرہ کیا جاتا۔

اگرچہ اربابِ اختیار کو اس مقام کی حساسیت کا ادراک تھا لیکن خطرات کی پروا نہ کرنا اور اپنے وطن کی حفاظت کے لیے سر پر کفن باندھ کر آتش نمرود میں کود جانا ہی پاک فوج کا طرۂ امتیاز ہے۔ چناں چہ یہ ذمہ داری پاکستان آرمی ایوی ایشن کے مایہ ناز اسکواڈرن "نائٹ سٹاکرز" کے حصے میں آئی۔ اب نائٹ سٹاکرز سے تعلق رکھنے والے ہیلی کاپٹر ایم آئی سترہ پر کیپٹن کے فرائض ہوا باز میجر ہمایوں جہانزیب انجام دے رہے تھے۔ صبح سے اب تک رسد کی تین اڑانیں حساس اور خطرناک علاقے میں پہنچائی جا چکی تھیں۔

چوتھی اڑان اترنے کے بعد سامان رسد اُتارا جا رہا تھا کہ دہشت گردوں نے راکٹ داغنے شروع کر دیے۔ ہیلی کاپٹر نے فوراً اڑان بھری۔ پہلا راکٹ دائیں انجن کو لگنے کے بعد اب یہ ہیلی کاپٹر ۱۸۰ ڈگری کا موڑ کاٹے واپس خار قلعے کی جانب محو پرواز تھا۔ اڑنے کے تین منٹ بعد ہیلی کاپٹر کے پچھلے حصے میں دھواں بھرنے لگا۔

قریباً مزید تیس سیکنڈ بعد انجن سے شعلے اٹھنے لگے۔ ادھر کیبن کا انٹرکام بھی ناکارہ ہو چکا تھا۔ کیپٹن ذیشان چیخ چیخ کر اپنے کپتان کو رفتار اور سطح زمین سے بلندی کم کرنے کا کہنے لگے۔ فلائٹ انجینئر حوالدار اذرم نے انھیں پچھلے حصے میں لگی آگ میں ہوتے مسلسل اضافے سے بھی آگاہ کیا۔ میجر ہمایوں اور معاون ہوا باز کیپٹن ذیشان نے تمام آلات' وارننگ کاشن لائٹس اور کنٹرول ٹھیک پا کر فوراً اترنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بہت ہی نازک اور مشکل فیصلہ تھا جو میجر ہمایوں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر کر ڈالا۔

اگر وہ مزید چند سیکنڈ غوروخوض کرنے میں صرف کرتے یا ہیلی کاپٹر چھوڑ کر مناسب فاصلے تک اپنے عملے کو لے جانا چاہتے تو دوسرا راکٹ ہرگز انھیں اس کی مہلت نہ دیتا۔ کیونکہ پہلی دفعہ انجن کو چھوتے گزرنے والے راکٹ کے بعد اب دوسرا اشست میں چند و جوں کی تصحیح کے ساتھ چند ہی سیکنڈ میں ہیلی کاپٹر کو آ لگتا۔ تب باقی عملے کے ساتھ ساتھ دونوں ہوا بازوں کے بھی پرخچے اڑ جاتے۔

میجر محمد ہمایوں کے لیے یہ صورت حال نئی نہ تھی۔ وہ پہلے بھی متعدد بار موت سے نبرد آزما رہ چکے تھے۔ عین موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے اعصاب قابو میں رکھنا اور درست فیصلہ کرنا ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ جب ۲۰۰۶ء میں وانا کے قریب واقع تیارزہ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

رسد بہم پہنچانے کی مہم کے دوران ان کے ہیلی کاپٹر سے صرف تین میٹر کی دوری پر دو راکٹ پھٹے تو بھی میجر ہمایوں نے پورے اطمینان سے ٹیک آف کیا تھا۔

اگلے ہی لمحے تیسرے راکٹ فائر کی آواز انھیں عقب میں سنائی دی۔ تب میجر ہمایوں کا ہیلی کاپٹر خیریت سے وانا میں اتر چکا تھا۔ وانا میں ابھی شکرانے کے نوافل ادا ہی کیے تھے کہ تیارزہ دی سے دوبارہ وائرلیس پیغام موصول ہوا: "دو آفیسروں اور سات جوانوں کی حالت تشویشناک ہے۔ انھیں جلد از جلد ایم ایچ پہنچانے کی ضرورت ہے۔" اس صورت حال میں یہ سر بکف ہواباز پھر ہیلی کاپٹر لے کر تیارزہ پہنچا اور زخمیوں کو فیلڈ اسپتال وانا پہنچایا۔ وہاں ڈاکٹروں کی ایک گھنٹے کی سرتوڑ کوشش کے باوجود تین جوان شہید ہو گئے۔ باقی زخمیوں کو راولپنڈی سی ایم ایچ پہنچانے کا مشن بھی میجر ہمایوں نے انجام دیا۔

۲۰۰۶ء میں چھانگی اور چترال کے ویرانوں سے پندرہ شہدا کے جسد خاکی اٹھا کر سی ایم ایچ کھاریاں لانے کا فریضہ بھی اسی ہواباز نے انجام دیا۔ ایک دفعہ پیش زیارت میں جب آپریشن جوبن پر تھا اور خطروں کا یہ کھلاڑی کمانڈوز کو اتار رہا تھا تو اچانک ۱۲.۷ ملی میٹر طیارہ شکن توپ کا فائر ہیلی کاپٹر پر آنے لگا۔ بالا کمان سے حکم ملا کہ درزک کی طرف مڑ جاؤ اور اگلے حکم کا انتظار کرو۔ اتنے میں درزک کی شمالی جانب سے بھی طیارہ شکن توپ بھاری فائر کرنے لگی۔ اب حکم ملا کہ دوبارہ ہدف کی طرف جاؤ اور مشن مکمل کرو۔ پلٹ کر لینڈنگ

میجر محمد ذیشان

کرنے کے لیے پرواز پہنچی کی تو زمین سے صرف دس گز کی بلندی پر اطلاع ملی کہ نیچے دشمن تاک میں ہے اور نشانہ بنائے گا لہٰذا اترا نہ جائے۔ یہ مشورہ پہلے سے ہدف پر موجود کمانڈوز نے دیا تھا جو کچھ دیر پہلے ہیلی کاپٹر سے اتارے گئے تھے۔ میجر ہمایوں نے وہیں سے ہیلی کاپٹر سنبھالا اور واپس پلٹے۔

دوسرے ہی لمحے عقب میں ایک خوفناک دھماکا سنائی دیا۔ یہ راکٹ ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنانے کے لیے داغا گیا تھا۔ وہ میجر ہمایوں کے بروقت پلٹنے سے ہیلی کاپٹر کو نہ چھو سکا۔ اس طرح صرف تین گھنٹوں میں میجر ہمایوں تیسری بار موت سے آنکھیں چار کر کے بحفاظت واپس میران شاہ پہنچ گئے۔

۲۰۰۸ء میں ایک بار اقوام متحدہ کے امن مشن کے تحت سوڈان میں شدید موسم نے اس ہواباز کی صلاحیتوں کا امتحان لینا چاہا۔ تب پرواز کے ۸۰۰ سو گھنٹوں کا تجربہ بھی ان کی خود اعتمادی میں شامل تھا۔ میجر ہمایوں نے انتہائی اعصاب شکن اور مایوس کن صورت حال پر قابو پا کر اپنے ہیلی کاپٹر کو بحفاظت موسم کے خونی پنجوں سے نکالا اور اسے اتارنے میں کامیاب رہے۔ اقوام متحدہ میں مزید دو سو گھنٹوں کی پرواز کا تجربہ لے باندھا اور اب پھر سے کبھی اواری ٹنل تو کبھی میران شاہ اور کبھی بلوچستان تو کبھی سوات یا باجوڑ اور بونیر میں فضا اور میجر محمد ہمایوں باہم پیچ کش ہوئے۔

آج پھر موت سے آنکھ مچولی کھیلنے والے یہ ہواباز درپردہ دشمن سے نبردآزما تھے۔ نیچے سنگلاخ پہاڑوں کی تیز دھار چوٹیاں تھیں اور فضا میں ہر لحظہ گھیرا تنگ کرتے ہوئے آگ کے شعلے۔ قریباً

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

آدھا ہیلی کاپٹر سیکنڈوں میں جل کر کوئلہ ہو گیا۔ میجر ہمایوں اپنے ہیلی کاپٹر کو دہشت گردوں کے نرغے سے زیادہ سے زیادہ دور لے جانا چاہتے تھے۔ چناں چہ وہ ہیلی کاپٹر کو پوری رفتار سے اڑانے لگے۔ ہوابازوں کو اب ہنگامی لینڈنگ کے لیے ہموار زمین کی تلاش تھی۔ تاہم بھرپور تلاش کے باوجود کوئی جگہ نہ مل پائی۔

اس دوران فلائٹ انجینئر حوالدار ازرم ہوابازوں کو مسلسل تکنیکی اعانت مہیا کر رہے تھے۔ وہ متعدد حربی مشقوں کے علاوہ دہشت گردوں کے خلاف آپریشن المیزان، آپریشن راہ راست اور آپریشن راہ نجات میں بھی حصہ لے چکے تھے۔ اچانک کیپٹن ذیشان زور سے چیخے ''سر! وہ سامنے ہنگامی لینڈنگ کی جگہ نظر آ رہی ہے۔ سر رفتار کم کریں اور پرواز نیچی۔'' اس گھڑی میجر محمد ہمایوں نے اپنے حواس پر مکمل قابو رکھا۔ وہ اپنے بھرپور حربی تجربے، کمال ذہانت اور مضبوط اعصاب کو بروئے کار لائے اور انتہائی تیز رفتاری سے غوطہ لگاتے ہوئے اترنے کے لیے بڑھے۔ جب زمین صرف ایک سو میٹر کے لگ بھگ رہ گئی تو اچانک ہیلی کاپٹر کا خودکار ہائیڈرالک سسٹم ناکارہ ہو گیا۔ میجر محمد ہمایوں نے معاون ہواباز کیپٹن ذیشان کو پکارا کہ فوراً کنٹرول پر آجاؤ۔

اس طرح دونوں ہواباز اب میکانکی کنٹرول سے ہیلی کاپٹر کو اتارنے لگے۔ وہ زمین سے دس میٹر کی بلندی پر ہوں گے کہ یکدم ہیلی کاپٹر کا ٹیل روٹر بھی ناکارہ ہو گیا۔ اس لمحے بھی فولادی اعصاب کے مالک ہواباز نے آخری فیصلہ کیا اور ہیلی کاپٹر کا سوئچ آف کر ڈالا۔ یوں وہ ہیلی کاپٹر پھٹنے کا وقت زیادہ طویل کرنا چاہتے تھے۔ اڑن کھٹولے نے زمین چھوتے ہی پوری قوت سے ۳۶۰ درجے کا چکر کاٹا اور اسی رخ پر رکا جس پر ہنگامی لینڈنگ کرائی جا رہی تھی۔

یہ منظر کچھ فاصلے پر موجود پاک فوج کی چیک پوسٹ کا عملہ بھی دیکھ رہا تھا۔ ایک افسر نے با آواز بلند اپنے جوانوں کو حادثے کے مقام پر پہنچنے کا حکم دیا۔ وہیں یہ منظر موبائل میں بشکل وڈیو محفوظ بھی کر لیا۔

حوالدار ازرم

حوالدار ندیم

نائیک ندیم

فضا میں موجود ہیلی ۳۱۲ اپنی مجوزہ رفتار سے تیز پرواز کرتے ہوئے جلد حادثے کے مقام پر پہنچ گیا۔ یہ پاک افغان سرحد کے قریب باجوڑ ایجنسی میں نواگئی کے قریب سرکاری قلعہ کا مقام تھا۔ ہنگامی لینڈنگ کرنے والے کیپٹن میجر محمد ہمایوں زخمی ہونے کے باوجود پوری طرح ہوش میں تھے۔ وہ لینڈنگ کے ساتھ ہی چھلانگ مار کر ہیلی کاپٹر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی ٹھوڑی کے نیچے کٹ لگا چکا تھا اور رانوں پر ورم آیا۔

معاون ہواباز کیپٹن ذیشان نیم بیہوش تھے۔ ہیلی کاپٹر کے خوفناک جھٹکے اور ۳۶۰ درجے کے چکر میں انھیں کمر کبھی اور پاؤں میں شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ان کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیتول نشست کے ساتھ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ دہشت گرد بھی اس ہیلی کاپٹر پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہنگامی لینڈنگ کے ساتھ ہی قریبی گاؤں سے مارٹر کے گولے برسنے لگے۔ ہیلی ۲۱۲ کے معاون ہوا باز میجر وقار تیزی سے آگے بڑھے۔ کیپٹن ذیشان کو ایم آئی ۱۷ کی نشست سے آزاد کرا کے ہیلی ۲۱۲ تک پہنچایا۔ جب ہوش و حواس بحال ہوئے تو میجر ہمایوں کو حوالدار ارزم کا خیال آیا جو اترتے ہوئے ساتھ ہی تھے۔ لیکن جونہی لینڈ کر چکے تو غائب ہو گئے۔

انھوں نے میجر وقار سے درخواست کی کہ ایک بار پھر ہیلی کاپٹر کے کیبن کی پڑتال کیجیے۔ حالانکہ میجر وقار نے پہلے بھی اُسے چیک کیا تھا اور انھیں وہاں کیپٹن ذیشان کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آیا۔ مگر کیپٹن کی خواہش کے احترام میں وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر پھر چلے۔ میجر وقار ابھی ایم آئی ۱۷ کی جانب بڑھے ہی تھے کہ وہ زوردار دھماکے سے پھٹ گیا۔ کیپٹن ذیشان ابھی تک بیہوشی کی حالت میں تھے۔ انھیں نیم بیہوشی میں بس اتنا یاد تھا جیسے کوئی بھی باہر انھیں کھینچ کر ہیلی کاپٹر سے نکال رہے ہیں۔ اسی عالم میں وہ مکمل بیہوش ہو گئے۔ بس ایک دھماکے کی موہوم سی آواز لاشعور میں گونجی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ایم آئی سترہ ایک خوفناک دھماکے سے تباہ ہو گیا۔

بیہوشی کی حالت میں کیپٹن ذیشان کے تخیل میں موت اور زندگی سے نبرد آزمائی کی فلمیں یکے بعد دیگرے چلنے لگیں۔ اگست ۲۰۰۶ء کا منظر ان کے سامنے آ گیا جب بلوچستان میں ان کے ایم آئی سترہ پر سیکڑوں گولیاں لگی تھیں۔ لیکن ماں کی دعا ان کے ساتھ تھی۔ ان کا معمول تھا کہ کسی بھی آپریشن پر جاتے ہوئے فون پر ماں سے دعا کرنے کی درخواست ضرور کرتے۔ تب آپریشن کی کامیاب تکمیل پر ان کے کیپٹن (آف دی ایئر کرافٹ) کو تمغۂ بسالت سے نوازا گیا تھا۔

منظر بدلا اور اپریل ۲۰۰۹ء کی فلم آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ اسکواڈرن کمانڈر اپنے افسروں اور جوانوں سے مخاطب تھے: ”بونیر میں دہشت گردوں کی ایک بڑی تعداد نے ہمیں للکارا ہے۔ وہاں آپریشن میں نقصان کا اندیشہ کافی زیادہ ہے۔ شاید تم میں سے آدھے سے زائد لوگ واپس نہ آ سکیں۔“ کیپٹن ذیشان نے تب بھی آگے بڑھ کر سب سے پہلی جنگی پرواز کے لیے خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کر دیا تھا۔ یہ آپریشن کامیابی سے ہمکنار ہوا یہی تھا کہ سوات کا امن معاہدہ ٹوٹ گیا۔

اب ایک انتہائی مشکل اور خونخوار آپریشن متوقع تھا۔ اس آپریشن میں پاکستان آرمی ایوی ایشن نے دنیا میں بلند ترین مقام پر لینڈنگ کر کے دہشت گردوں کا سامنا کرنا تھا۔ آپریشن کی کامیابی کا انحصار ایوی ایشن کی بالکنگ پوزیشن پر تھا۔ اس آپریشن میں بڑا جانی نقصان ہونا لازمی تھا۔ کیپٹن ذیشان اس موقع پر بھی سب سے پہلے اترنے والے تین ہیلی کاپٹروں (ایم آئی سترہ) میں سے ایک کے عملہ کا حصہ تھے۔

اس آپریشن کے تیسرے ہی دن پاکستانی فوج کے چیف آف جنرل اسٹاف نے آرمی ایوی ایشن میں ”غازی“ جا کر فرط جذبات میں کہا تھا ”میرا جی چاہتا ہے میں اس آپریشن میں حصہ لینے والے ایوی ایشن عملے کو سلیوٹ پیش کروں۔“

اب ان کی آنکھیں جو مشاہدہ کر رہی تھیں وہ بڑا بھیانک تھا۔ ۳ جولائی ۲۰۰۹ء کو اورکزئی ایجنسی میں دہشت گردوں سے نبرد آزما ایم آئی سترہ کریش ہوا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تمام عملہ ہواباز سمیت شہید ہو گیا۔ ایسے موقع پر ایوی ایشن کی سنہری روایات کے مطابق اگلا مشن ہمیشہ اسکواڈرن کمانڈر روائتی طور پر لے کر جاتے ہیں۔ اگلا درپیش مشن سوات کا تھا جس میں خطرات سے بھرپور علاقے میں سامان رسد ذخیرہ کرنا پڑا۔ ذیشان نے ایک بار پھر خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کرتے ہوئے یہ مشن بھی اپنے سر لے لیا۔ ذیشان کے تخیل کا منظر پھر بدلا۔

۲۲/اکتوبر ۲۰۰۹ء کو جب ان کے ہیلی کاپٹر نے سامان کی تین پروازیں نوا پاس تک پہنچا دیں تو نماز ظہر کا چھوٹا سا وقفہ کرکے پھر نازم پرواز ہوئے۔ اس ہیلی کاپٹر کے عملے میں شامل بھی لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ وہ کسی "سنیکچہ" ہیلی کاپٹر پر سوار نہیں۔ ایم آئی سترہ جیسے بڑے جسم اور آواز والے مال بردار ہیلی کاپٹر کی صورت میں ایک بڑا ہدف لیے وہ بار بار دہشت گردوں کے سامنے سینہ سپر ہو رہے تھے۔ ایسی صورت میں ایک ہی مخصوص علاقے میں پچھی اڑان لے جانے کا مطلب بالشبہ جان ہتھیلی پر رکھ کر ہی اپنے حکام بالا کی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانا تھا۔

کیپٹن میجر ہمایوں کے ساتھ آج پھر کیپٹن ذیشان کو بطور معاون ہواباز اس لیے بھیجا گیا کہ وہ ایسی نوعیت کے کئی آپریشنز کا تجربہ رکھتے تھے۔ خطرات میں ہوابازی کرنے کے حوالے سے ذیشان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ پھر انھیں آخری منظر دکھائی دیا جب وہ ہائیڈرالک سسٹم ناکارہ ہو جانے کے بعد اپنے ساتھی ہواباز کے ساتھ ہیلی کاپٹر لینڈ کر رہے تھے۔ پھر یکایک ہیلی کاپٹر گھوم گیا۔ اس دوران انھیں شدید چوٹیں آگئیں۔ پھر کوئی انھیں بےہوشی کی حالت میں ہیلی کاپٹر سے نکال کر لے گیا۔ اب انھیں ہوش آنے لگا۔ ان کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا "میرے ہیلی کاپٹر کا عملہ کہاں ہے؟" میرا عملہ کہاں ہے؟"

ان کے لاشعور میں محفوظ ہیلی کاپٹر پھٹنے کا دھماکا انھیں یہ باور کرا رہا تھا کہ لوند سیداں، تحصیل گوجر خان کے رہائشی، فلائٹ انجینئر حوالدار ازرم شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز ہو چکے۔ عملے کے مزید دو ارکان بھی شاید چند لمحے پہلے جام شہادت نوش کر چکے تھے یا پھر ہیلی کاپٹر کے آخری ۳۶۰ درجے والے جھٹکے سے دور جا گرے۔ ان میں لانڈھی کراچی کے رہائشی حوالدار ندیم محی الدین ایک منجھے ہوئے کو چیف تھے۔ جلتے ہوئے کیبن میں بھی اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے وہ ہواباز کو اترنے کی ممکنہ جگہ تلاش کرنے میں بھرپور اعانت فراہم کر رہے تھے۔ حوالدار ندیم نے بھی آپریشن المیزان اور آپریشن راہ نجات میں کئی کامیاب مشن انجام دیے تھے۔

عملے کے تیسرے رکن جو شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے بابو محلہ تحصیل و ضلع مردان کے نوجوان نائیک ندیم خان تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر پر سیکنیر کے فرائض انجام دیتے تھے۔ جب ان کا کیبن شعلوں میں گھرا ہوا تھا اور ریڈیو رابطہ بھی خراب ہو چکا تو نائیک ندیم خان پوری مہارت سے ہواباز کے ساتھ ہر ممکن طریقے سے ممکنہ لینڈنگ سائٹ کے بارے میں رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ ہیلی کاپٹر پھٹنے کے بعد ان کا جسد خاکی بھی ملبے سے کچھ فاصلے پر ملا۔

قضا نے شہادت کا جام ان تینوں جانبازوں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا جبکہ میجر ہمایوں جہانزیب اور میجر محمد ذیشان آج بھی بطور غازی پاکستان آرمی ایوی ایشن کے لیے قابل فخر اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ ◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جس نے کیا دشمن کو تتربتر

آپریشن ضرب عضب

اس شاندار عسکری یلغار کے پیچھے ان چھپے گوشے جس نے دشمنان پاکستان کو سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنے پہ مجبور کر دیا

محمود

یہ ۸ جون کا واقعہ ہے، دہشت گردوں نے کراچی ہوائی اڈے پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں ۲۶ پاکستانی شہید جب کہ ۱۰ دہشت گرد ہلاک ہوئے۔ یہ حملہ ٹی ٹی پی (تحریک طالبان پاکستان) اور آئی ایم یو (اسلامک موومنٹ آف ازبکستان) کے جنگجوؤں نے مل کر کیا۔

اس حملے سے قبل حکومت وقت اور جنگجوؤں کے مابین مذاکرات بھی چل رہے تھے۔ مگر ٹی ٹی پی سے منسلک تنظیمیں بار بار سیکورٹی فورسز اور پاکستانی عوام کو نشانہ بناتی رہیں۔ آخر کار افواج پاکستان سمیت پاکستانی قوم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ چنانچہ ۱۵ جون سے پاک

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

افواج نے شمالی وزیرستان میں چھپے بیٹھے جنگجوؤں پر دھاوا بول دیا۔ اس فوجی آپریشن کا نام "ضربِ عضب" رکھا گیا۔

آپریشن ضرب عضب کا تصور پاک بری فوج، جنرل راحیل شریف کے ذہنِ رسا کی تخلیق ہے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دن رات لگا کر آپریشن کا منصوبہ بنایا۔ درحقیقت یہ ٹی ٹی پی کے خلاف سب سے زیادہ منظم اور عرق ریزی سے بنایا گیا فوجی منصوبہ ہے۔

آپریشن ضرب عضب کے خدوخال بنانے میں جنرل راحیل شریف کو تین باصلاحیت اور اعلیٰ فوجی افسروں کا تعاون حاصل رہا۔ یہ تینوں حضرات پاک فوج کے مایۂ ناز حکمت کار (Strategists) سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں چیف آف جنرل اسٹاف لیفٹیننٹ جنرل اشفاق ندیم، ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشن میجر جنرل عامر ریاض اور ڈائریکٹر جنرل ملٹری انٹیلی جنس میجر جنرل سرفراز ستار شامل ہیں۔

یہ آپریشن انجام دینے کی ذمے داری پاک بری فوج کے مشہور "7 ڈویژن" کو سونپی گئی۔ فی الوقت اس کی کمان میجر جنرل ظفر اللہ خان کر رہے ہیں۔ یہ وطن عزیز کا قدیم ترین انفنٹری ڈویژن ہے جس سے منسلک جوان کئی جنگوں میں دادِ شجاعت دے چکے۔

7 ڈویژن XI کور سے تعلق رکھتا ہے جس کا ہیڈ کوارٹر پشاور میں ہے۔ اسی کور سے تعلق رکھنے والا دوسرا انفنٹری 9 ڈویژن برسرِپیکار 7 ڈویژن سے ایک سو کلومیٹر دور جانب جنوب مغرب تعینات کیا گیا۔ جب کہ 9 ڈویژن کے مشرق میں 40 ڈویژن متعین ہوا۔ 40 ڈویژن II کور سے تعلق رکھتا ہے جو "سیکنڈ سٹرائک فورس" بھی کہلاتی ہے۔ یوں شمالی وزیرستان کو گھیرے میں لے لیا گیا تاکہ جنگجو فرار نہ ہو سکیں۔

سیفِ عضب کی تاریخ

العضب ایک مقدس تلوار کا نام ہے۔ یہ انصار کے ممتاز صحابی حضرت سعد بن عبادہؓ کی ملکیت تھی۔ غزوہ احد کے موقع پر حضرت سعدؓ نے یہ تلوار نبی کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پیش کر دی۔ عربی میں العضب کے معنی ہیں: کاٹنا یا تیز دھار۔

آپ ﷺ نے یہ تلوار ایک اور ممتاز صحابی حضرت ابودجانہؓ کو مرحمت فرمائی۔ حضرت ابودجانہؓ عرب کے ممتاز شمشیر زن تھے۔ نبی کریم ﷺ نے العضب اس لیے آپ کو عنایت فرمائی تاکہ وہ کفار پر برق بن کر ٹوٹ سکیں۔

آرام طلبی

مشہور امریکی طنز نگار مارک ٹوین بڑا آرام طلب تھا۔ مطالعہ اور تحریری کام وہ عموماً بستر میں ہی انجام دیتا۔ ایک دن ایک اخباری نمائندہ اس کا انٹرویو کرنے آ پہنچا۔ مارک ٹوین نے اپنی بیوی سے کہا: "اسے خواب گاہ میں ہی بھیج دو۔"

"تم بستر سے باہر کیوں نہیں آ جاتے۔ کتنا برا لگے گا کہ تم بستر میں لیٹے رہو اور وہ کھڑا رہے۔" بیوی نے کہا۔

"اچھا......" مارک ٹوین نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "بات تو تمھاری ٹھیک ہے۔ اچھا ایسا کرو، ملازم سے کہو کہ یہاں ایک اور بستر لگا دے۔"

(ماریہ رسول، لاہور)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوران غزوہ حضرت ابو دجانہؓ نے نبی پاک ﷺ کی تلوار مبارک سے سیکڑوں کفار کو جہنم رسید کیا اور سرخرو ٹھہرے۔

بری فوج کا مایہ ناز ڈویژن

شمالی وزیرستان میں جنگجوؤں سے نبرد آزما ۷ ڈویژن کی بنیاد یکم اکتوبر ۱۹۴۰ء کو رکھی گئی۔ تب یہ برطانوی ہند فوج کا حصہ تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر اٹک میں بنایا گیا۔ اس کا نشان "سنہرا تیر" (Golden Arrow) ہے۔ اسی لیے یہ عسکری حلقوں میں گولڈن ایرو کے نام سے بھی مشہور ہوا۔

اس ڈویژن نے دوسری جنگ عظیم کے دوران آسام، برما اور تھائی لینڈ میں جاپانیوں کے خلاف جنگیں لڑیں۔ آزادی پاکستان کے بعد یہ پاک بری فوج کے حصے میں آیا۔ تب ہماری بری فوج صرف دو ڈویژنوں پر مشتمل تھی۔

قیام پاکستان کے بعد اس نے اب تک لڑی گئی تمام جنگوں میں حصہ لیا۔ ۷ ڈویژن کے جوانوں نے ہر محاذ پر بے مثال کارکردگی دکھائی اور دفاع وطن کی خاطر سینہ تان کر جانیں قربان کیں۔ یہ ڈویژن تین بریگیڈوں...... ۱۰، ۱۱۷ اور ۱۰۲ پر مشتمل ہے۔

۷ ڈویژن میں تقریباً تیس ہزار فوجی شامل ہیں۔ یہی جوان پامردی سے شمالی وزیرستان میں جنگجوؤں کے خلاف صف آرا ہوئے۔ ان کی جرأت و دلیری نے دشمنان پاکستان کے قدم اکھیڑ دیے اور وہ سر پہ پاؤں رکھ کر فرار ہو گئے۔

۷ ڈویژن کی سپاہ کو حملے کے دوران پاک بری فوج کے دیگر دستوں اور فضائیہ کی بھی بھرپور مدد حاصل رہی۔ ان میں سرفہرست کمانڈوز کی دو بٹالین شامل تھیں۔ یاد رہے، ایک بٹالین فوج میں ۳۰۰ تا ۱۲۰۰ فوجی ہوتے ہیں۔ ہمارے دلیر و جری کمانڈوز پاک بری فوج کے خصوصی دستے...... اسپیشل سروسز گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔

آپریشن ضرب عضب میں پاک بری فوج سے تعلق رکھنے والے ۱۷ میکانائزڈ ڈویژن، ۳۷ میکانائزڈ ڈویژن، ۱۰۵ انجینئرز ڈویژن اور ۱۳۱، ۳۲ آرمی ایوی ایشن نے بھی بھرپور حصہ لیا۔

دوران آپریشن جنگجوؤں کے ٹھکانوں پر بمباری کرنے اور میزائل داغنے کے لیے ایف سولہ اور میراج جنگی طیارے استعمال کیے گئے۔ جب کہ کوبرا گن شپ ہیلی کاپٹروں نے بھی لڑائی میں حصہ لیا۔

پاک بری فوج نے جنگجوؤں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے پاکستان ساختہ ڈرون بھی استعمال کیے۔ یاد رہے، پاکستانی نجی و سرکاری کمپنیاں ایسے ڈرون ایجاد کر چکیں جن پر میزائل نصب ہو سکتے ہیں۔ تاہم فی الوقت ان سے نگرانی و جاسوسی کا کام لیا جا رہا ہے۔

شمالی وزیرستان

پاک افواج کے حملے کا علاقہ شمالی وزیرستان ۴۷۰۷ مربع میل پر مشتمل ہے۔ یہ قبائلی علاقہ جات یا فاٹا کی دوسری بڑی ایجنسی ہے۔ آپریشن سے قبل یہاں تقریباً نو لاکھ افراد آباد تھے۔ آبادی کا بیشتر حصہ پشتون قبیلے وزیر سے ہے۔ بقیہ آبادی داوڑ قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔

وزیرستانی آزادی پسند اور دلیر لوگ ہیں۔ برطانوی سر پٹختے رہ گئے لیکن انھیں مطیع نہیں بنا سکے۔ بہرحال انگریزوں نے ۱۸۹۲ء میں علاقے پر قبضہ کیا اور ۱۸۹۵ء میں اسے ایجنسی کی شکل دی۔ ایجنسی کا صدر مقام میران شاہ ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

شمالی وزیرستان پہاڑی علاقہ ہے۔ ان کے درمیان چھوٹی بڑی وادیاں واقع ہیں۔ ان میں وادی توچی اور وادی کرم کو اہمیت حاصل ہے۔ پہاڑیوں کی بلندی ۵۰۰۰تا۸۲۰۰ فٹ ہے۔ پاکستان دشمن قوتوں نے انھی پہاڑی علاقوں میں اپنے مسکن اور کمین گاہیں بنائیں۔ لیکن وہ پاک بری فوج کے جوانوں سے بھلا کہاں چھپ سکتے تھے؟

اگرچہ دشمن نے شمالی وزیرستان میں دہشت گردی کا وسیع اور منظم ڈھانچا کھڑا کر لیا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے مقامی سرداروں کو شہید کیا۔ پھر ان کی جگہ مختلف علاقوں کے حاکم بن بیٹھے۔

انتہا پسند جنگجوؤں نے پھر مختلف جگہوں پر اسلحہ ساز کارخانے لگائے۔ ان کارخانوں میں بارودی سرنگیں، بم، خودکش حملہ آوروں کی جیکٹیں، رائفلیں، پستولیں اور گولیاں تیار ہوتی ہیں۔ مزید برآں جنگی تربیت دینے کے لیے مراکز بھی قائم کیے۔ خودکش حملہ آوروں کو تربیت دینے والے مرکز الگ تھے۔ وہاں ان کی برین واشنگ بھی کی جاتی۔

کئی مقامات پر دشمن نے سرنگیں بھی کھود رکھی تھیں۔ نیز غاروں میں فوجی چوکیاں بنائی گئیں۔ دشمنوں کے ہر اول دستے طیارہ شکن توپوں اور راکٹوں سے بھی لیس تھے۔ غرض پچھلے آٹھ نو سال کے دوران شمالی وزیرستان میں دشمنوں نے باقاعدہ فوج تیار کر لی۔

لیکن جیسے ہی پاک افواج نے علاقے پر حملہ کیا، دشمن کی فوج پتوں کے مانند بکھر گئی۔ یہ سطور قلم بند ہونے تک دشمن کے ۴۰۰ جنگجو مارے جا چکے اور سیکڑوں زخمی ہوئے۔ شمالی وزیرستان کے بیشتر علاقوں میں ان کا نیٹ ورک بھی تباہ ہو چکا اور وہ تتر بتر ہو گئے۔

ماہرین عسکریات کا کہنا ہے کہ گو دشمن اپنا سب سے بڑا ٹھکانا کھو بیٹھا ہے، تاہم وہ پوری طرح برباد نہیں ہوا۔ اس لیے پاک افواج کو چاہیے کہ پاکستانی علاقوں، شہروں اور دیہات میں جہاں جہاں دہشت گردوں کے ٹھکانے ہیں، انھیں بھی تباہ کیا جائے۔ یوں ہی وطن عزیز دہشت گردی کی لعنت سے نجات پا سکتا ہے۔

احتجاج

ایک بوئنگ طیارے نے سمندر پر پرواز کے دوران ابھی نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کیپٹن نے اعلان کیا: ''خواتین وحضرات توجہ فرمائیے! طیارے کا ایک انجن خراب ہو گیا ہے۔ تاہم تین انجن ہمیں بہ حفاظت ہماری منزل پر پہنچا دیں گے۔ البتہ آدھے گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔'' ایک گھنٹے بعد کیپٹن کی پھر آواز ابھری

''توجہ فرمائیے! ہمیں افسوس ہے کہ طیارے کا دوسرا انجن بھی خراب ہو گیا ہے۔ تاہم باقی دو انجنوں پر ہم اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔ البتہ اب ہمیں دو گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔'' تھوڑی دیر اور گزری تھی کہ کیپٹن نے پھر اعلان کیا: ''خواتین وحضرات! ہم انتہائی دکھ کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ جہاز کا تیسرا انجن بھی خراب ہو گیا ہے۔ لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم بہ حفاظت اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ البتہ ہمیں تین گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔''

بار بار کے اعلانات سے جھنجلایا ہوا ایک مسافر بڑے غصے سے بولا: ''کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ اگر چوتھا انجن بھی خراب ہو گیا تو کیا ہم ساری رات پرواز ہی کرتے رہیں گے؟''

(فردوس اعظم، شاہدرہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ظالم و جابر قوتوں کے خلاف

فردِ جرم

ایک مغربی جرنیل کی ایمان افروز کہانی، ظلم سہتے مظلوموں کی دلدوز چیخوں نے آخرکار اس کا نیم مردہ ضمیر جگا ڈالا

نگہت یاسمین

سلمیٰ نے سر اٹھا کر ایک نظر بوسیدہ چھت کو دیکھا ننھے ننھے سوراخوں سے چھلتی دھوپ نیچے تک پھیل چکی تھی۔ پھر ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تاحد نگاہ ریت چمک رہی تھی۔ کہیں کہیں زیتون کی جھاڑیاں برگ و بار کے بغیر مرجھائی کھڑی نظر آئیں۔ صحرا میں دور تک اپنی ہی زمین پر پناہ گزینوں کے بدرنگ خیموں کی قطاریں غیر انسانی ماحول میں کسمپرسی کے باعث مزاحمت کے نشاں نمایاں تھیں۔

کچھ فرلانگ کے فاصلے پر خاردار تاروں کے پیچھے ایک اسرائیلی فوجی چوکی میں بیٹھا دوربین لگائے اسی جانب دیکھ رہا تھا۔ گرم ہوا میں بچوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ سلمیٰ نے آنکھوں کے آگے ہاتھوں کا چھجا بنا کر ٹیلے کے اطراف میں کھیلتے بچوں میں سالم کو تلاش کیا۔ اچانک ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی آواز پر نشانہ بازی کے کھیل میں مشغول بچے منتشر ہونے لگے۔ ٹیلے کے اطراف سے نمودار ہونے والے لڑکوں میں سالم نمایاں تھا۔ قریب آ کر ساتھیوں کو الوداعی سلام کیا اور ماں سے لپٹ کر خیمے میں داخل ہو گیا۔

اسرائیلی فوجی بے زاری سے ریتلے ذروں کو گھور رہا تھا کہ اقوام متحدہ کے شعبہ انسانی وسائل (ہیومن ریسورس) کا سربراہ جنرل (ر) بیرس چوکی میں داخل ہوا۔ فوجی کو یہ جنرل درشت اسرائیلی افسر کے مقابلے میں ناصا نرم مزاج لگتا تھا۔ ہلکا سا سیلوٹ مار اس نے دوربین جنرل کی طرف بڑھا دی۔ وہ بھی پناہ گزینوں کے خیموں کو تاکنے لگا۔ دھوپ ریت کے ذروں کو سونا بنا رہی تھی۔ انتہائی طاقت ور دوربین سے ان بے خانماں انسانوں کے چہرے ہاتھ برابر فاصلے پر محسوس ہوئے۔ سلمٰی کا چہرہ نظر آیا تو چہرے کے نقوش جنرل کی یادداشت پر دستک دینے لگے۔

"ان پناہ گزینوں سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے فوجی کو حکم دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد چوکی میں سلمٰی اور سالم موجود تھے جس پر نیلا و سفید جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سالم بے پروائی سے چیتھڑی کی گیند اپنے ہاتھ میں تھما رہا تھا۔ کبھی ایک ہاتھ سے اُچھالتا اور دوسرے میں منتقل کرتا۔ مگر سلمٰی نگاہیں جھکائے دروازے کے نزدیک بالکل ساکت کھڑی دیر تک اپنے قدموں کو دیکھتی رہی۔ لب ایک دوسرے پر سختی سے جمے ہوئے۔ وہ مشرقی خستہ لباس میں ملبوس تھی۔ آنکھوں کی پتلیاں گویا ٹھہری ہوئی تھیں۔

"کس قدر بے نیازی ہے؟..... اتنی خاموشی!" جنرل نے بغور جائزہ لیا۔ "خوف اور اندیشوں سے کوسوں دور..... ان کے پاس ہے ہی کیا جسے کھونے کا وہم ہو؟ شاید ایسی ہی کسی عورت نے شیخ یٰسین کو جنم دیا ہوگا۔" جنرل سوچتا چلا گیا۔

بالآخر کئی بار پلکیں جھپکانے کے بعد وہ مخاطب ہوئی

"یہاں کیوں بلایا ہے؟"

"تم دور سے گلاب لگ رہی تھیں، سونگھنے کے لیے......" فوجی کا استہزائی جملہ جنرل کے مڑنے اور شعلہ برساتی نگاہوں کے سبب پورا نہ ہو سکا۔ جنرل نے جھنجھلا کر عرق آلودہ پیشانی پونچھی اور فوجی کو ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کا کہا۔ وہ عبرانی میں بڑبڑاتا باہر نکل گیا۔

"میں نے اسے ناحق بلایا مگر یہ عورتیں اتنی مختلف کیوں ہیں؟" ایک طرف سلمٰی کی لاتعلقی دوسری جانب فوجی کا گھٹیا مذاق..... اسے اپنی زندگی میں آنے والی عورتیں یاد آئیں..... لیلیٰ، الزبتھ، اینا، شیری، جولی، جینا، میری، ماریا، باربرا، ویرا، ایمی! ان گنت عورتیں جن کے اب نام بھی یاد نہیں تھے۔ اسکول، کالج کی ساتھی، شریک کار خواتین، بیروت کے کلبوں میں ناچتی تھرکتی، پیرس کی سڑکوں پر بازاروں میں دل بہلاتی، گناہ پر آمادہ کرتی، سجی سجائی کھلونا سی عورتیں..... ان دو قسم کی عورتوں میں قطبین جتنا بُعد کیوں ہے؟

تبھی اسے اپنی ماں یاد آئی جو امریکی فوجیوں کے قیام کی یادگار کے طور پر اسے بیروت کے ایک اسپتال چھوڑ گئی تھی۔ کلیسا کے یتیم خانے میں اس کی پرورش ہوئی۔ دس برس کا تھا کہ ایک فرانسیسی نژاد لاولد جوڑا اسے امریکا لے گیا۔ ماں اس کی ماں کون تھی؟ کہاں گئی؟ وہ بالکل نہیں جانتا تھا۔ وہ بار بار لاشعوری طور پر مشرق وسطیٰ کے سلگتے ہوئے خطے میں چلا آتا شاید ماں کی تلاش میں! وہ لگ بھگ پچاس برس کا ہو چکا تھا مگر ماں کے لمس کی تلاش اسے بے چین کیے رکھتی۔

سالم کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ماں کو جھنجھوڑ رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ تذبذب کے عالم میں جنرل نے سوال کیا "تم سارہ کی بہن...... یا بیٹی ہو؟"

چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھ کر شناسائی کا گمان یقین میں بدل گیا۔ اس نے گہری سانس لی۔

"میری خالہ تھی...... تم واقف ہو؟" سوالیہ نظریں سلمٰی نے اس پر مرکوز کیں۔

"تھی...... تو کیا؟" جنرل جملہ پورا نہ کر سکا۔

"ہاں...... وہ آزادی کی خاطر جان ہار گئی۔" وہ عجیب انداز سے مسکرائی۔

"مگر کب؟ کیسے؟" جنرل کا اضطراب چھلک گیا۔

"ارض فلسطین تو کئی سال سے حالت جنگ میں ہے۔ نہتے مرد و زن اور بچے جارحیت کے آگے سینہ سپر ہیں۔" سرسراتی ہوئی آواز ملامتی لہجہ اس کا منہ چڑانے لگا...... "وہ ایک گوریلا تھی دشمن کو مطلوب...... پھر ایک محاصرہ ہوا۔ سامان خورونوش ختم اور دیگر سہولیات منقطع اندھا دھند بمباری...... وہ اور اس جیسے لاتعداد فلسطینی رزق خاک ہوئے۔ آخر کب تک لڑتی؟؟"

اس کی آواز بتدریج مدھم ہوتی چلی گئی۔ مگر چاروں سمت بے نام بازگشت گونج اٹھی:

"کب تک لڑتی؟...... کب تک لڑتی؟"

"اور سعاد؟" خالی الذہن جنرل نے کرسی تھام لی۔

"دونوں آسمانوں پر آزادی وطن کی منتظر ہیں۔"

جنرل کو اپنے کیریئر کی شروعات یاد آئیں۔ جنگ زدہ خطوں میں فریقین کے مابین صلح بندی کروانا۔ پھر عارضی جنگ بندی برقرار رکھنا...... اقوام متحدہ کے بنیادی مقاصد کس قدر متاثر کن تھے۔ اس فوج میں شمولیت نے اسے لبنان پہنچا دیا۔ مسلمان، عیسائی اور دروزی اکائیوں میں تقسیم لبنان۔ گو ناٹ کلب کی زندگی رواں دواں تھی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ! مگر عرب شیوخ کی باہمی چپقلش نے ارض مقدس کو مسئلے میں تبدیل کر دیا۔ زیتون کے باغوں پہ چھائی گہری اداسیاں اور ستم رسیدہ فلسطینیوں کے اندتے ہوئے قافلے عیاش حکمرانوں سے سراپا سوال تھے۔

اس کی اولین تقرری بیروت کے گرد و نواح میں ہوئی۔ اسے ماں کی کشش وہاں لے گئی تھی۔ فارغ اوقات میں ہر عورت کے چہرے ٹٹولتا نقوش اپنے خدوخال سے ملاتا۔ وہیں سارہ اور سعاد دونوں بہنوں سے سامنا ہوا۔ وہ تحریک آزادی فلسطین کی سرفروش کارکن تھیں۔ سعاد تو مارے نفرت کے اس سے بات تک کرنا پسند نہ کرتی۔ مگر سارہ جس کی آنکھوں میں شرارے ناچتے تھے اس سے بری طرح الجھتی۔ شادی کی رات بیوہ ہو جانے والی عورت اسے حیرت زدہ کر دیتی۔ بجائے غم میں ڈوبنے کے وہ دیوانہ وار وطن کی بازیابی کا نعرہ لگاتی۔ اس نے سوچا تھا کہ ایسی ہی کوئی عورت ماں کی یاد بھلا سکتی ہے۔ مگر یہ بات کہنا تو کجا سوچنا بھی محال تھا۔ زندگی کے تضادات نے اسے لادین بنا دیا مگر سارہ تو مومنہ تھی!

پھر صبرا اور شتیلا کے کیمپ...... ۱۹۸۲ء میں فلسطینی مہاجرین کے لرزہ خیز قتل عام کی یاد نے برسوں بعد بھی اسے رلا دیا۔

"تم جو چاہو تو تمہاری رہائش کا بندوبست یورپ کے کسی شہر میں ہو سکتا ہے۔" وہ رک رک کر بدقت تمام بولا۔

"یورپ...... جہاں بوسنیا ہے؟" سلمٰی کا لہجہ خنجر اور الفاظ گویا تلوار تھے۔ نگاہیں ہی نہیں اس کا جھکا ہوا سر بھی جھٹکے سے اٹھا تھا۔ یورپ...... جس نے مسلمان نام کی آبادی کو خاک و خون میں نہلا کر نسلی تطہیر کے فلسفے کو عملاً ثابت کر دکھایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بوسنیا....." جنرل بری طرح چونکا تو کیا وہ جانتی ہے اقوام متحدہ کی امن فوج سے بوسنیا میں کیا جرم سرزد ہوا؟" یہ سوچ کر اس کا منہ کھلا رہ گیا۔

"ہم بیروت' قبہ عمان میں تین نسلوں سے پناہ گزین' جبکہ غزہ میں محصور ہیں۔ ہم صحرا کی مائیں ہیں! ریت کے ذروں جتنی تعداد میں مجاہدوں اور شہدا کو جنم دیتی رہیں گی۔ ہماری ماتا کی چمک تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر دے گی۔" سلمیٰ کا پرنم قہقہہ گونجا۔ سالم حیرت زدہ سا اسے دیکھنے لگا۔

وہ دن جانے کس لمحے گئے اسے خبر ہی نہ ہوئی..... وہ کہیں دور نکل گیا تھا۔

۱۹۹۲ء کا موسم بہار' بوسنیا.....

مرغزاروں کا مسکن' حسین نظاروں کا وطن..... مگر وہ جس وقت وہاں پہنچا تو کیمپ ہی کیمپ دور تک خیمے ہی خیمے! ہر جگہ بس ایک منظر تھا اور یہی منظر بھی یکساں۔ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے تنازع چل رہا تھا۔ وہ اپنے ہی وطن میں محصور اور کیمپوں میں رہنے پر مجبور تھے۔ ہر وقت جنونی سربوں کی زد میں رہتے۔ کمیونزم کی بساط لپیٹنے کی سزا افغانستان سے لے کر یوگوسلاویہ تک مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ پناہ گزینی کا عذاب بھی ملا! صدیوں تک رہتے بستے کے باوجود سربوں کو زمین کے حق ملکیت کا دعویٰ قبول نہ تھا!

اسے حکام بالا کی ہدایات کے مطابق حملہ آور سرب قافلوں کی نقل و حرکت پر صرف نظر رکھنی تھی۔ جنونیوں کو روکنا یا ان کی خبر دینا ممنوع تھا۔ کیسا سیدھا سادہ قتل عام تھا اس کا! انسانیت کا! بحر امن فوج نے بوسنیا میں کیا ذمے داری انجام دی؟ محض سربوں کو حفاظتی حصار فراہم کیا' مسلمانوں کے لیے آنے والی سپلائی لائن منقطع کر دی اور انسانی حقوق کو بالائے طاق رکھ ڈالا۔ آہ! وہ بھی تو اس جرم میں برابر کا شریک تھا۔ تبھی بوسنیا کے نام پر بری طرح چونکا۔

بیرن کسی سفارش کے بغیر کرنل کے عہدے تک پہنچا تھا۔ جنگ بلقان کے دوران امدادی کارروائیوں میں حصہ لیتے ہوئے ایک شام پہاڑی سے جو لڑھکا تو ایک ضعیفہ کے قدموں میں جا ٹھہرا۔ وہ رائفل سے سیدھا اس کے دل کا نشانہ باندھے ہوئے تھی۔ بین الاقوامی ادارے کی جانب داری نے مظلوم لوگوں کے دلوں میں آتش بپا کر رکھی تھی۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے رحم کی اپیل بھی نہ کی۔ کچھ دیر وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ ضعیفہ کی آنکھوں میں کبھی ممتا جھلکتی تو کبھی نفرت کے سائے لہراتے۔ اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ عورت نے نگاہیں ہٹائے بغیر آواز دی:

"ہم بیروت' قبہ عمان میں تین نسلوں سے پناہ گزین' جبکہ غزہ میں محصور ہیں۔ ہم صحرا کی مائیں ہیں! ریت کے ذروں جتنی تعداد میں مجاہدوں اور شہدا کو جنم دیتی رہیں گی۔

"رحمین!"

وہ نام کی طرح نرم و نازک' ملیح چہرہ تھا۔ اس سے نظر ہٹانا دل کے بس میں نہ تھا۔ وہ واقعی گلاب تھی۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا حد ادب سے تجاوز تھا مگر آنکھیں' وہ گہری اداس آنکھیں..... قریب پہنچ کر رحمین کا چہرہ اس کی وردی اور رنگ دیکھ کر متغیر ہو گیا۔ گود سے بچے زمین پر رکھ کر وہ بولی:

"نانی!..... ایک کو مار کر کیا ہو گا؟ پوری بٹالین پوری رجمنٹ....." وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر بلک پڑی۔ "مگر اسے بتا دو کہ اس بچے کا نام صلاح الدین ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جو یورپ اپنے مرب باپ اور اس کے ہم مذہبوں کے لیے ڈراؤنا خواب ثابت ہوگا۔"

نانی سلیمہ نے پھر ایک تلخ حقیقت بیان کر کے گویا اس پر فرد جرم عائد کر دی۔ یک لخت ماحول کی خوبصورتی اور فطرت کا حسن جہنم زار میں بدل گیا۔ شدت جذبات سے نانی نواسی دونوں کے چہرے دہک رہے تھے۔

"زمانوں سے ساتھ رہتے ہم تو نام کے مسلمان تھے۔ اس کی شادی یقیناً کسی مرب عیسائی سے ہوتی۔ مگر مسلمان عورتوں کو علیحدہ کر کے جبراً بے عزتی کرنا اور ساری دنیا کی خاموشی......" سسکیاں تھیں کہ وہ ڈوبتا جا رہا تھا۔

"تم نے ہمیں سکی سے سلیمہ اور تنجی سے زمین بانی بنا دیا۔ تم نے ہمیں بربرے کی مائیں بنایا بچ بستہ ٹھٹھرا دینے والی...... ہمارے جذبات ہماری خواہشات منجمد کر ڈالیں۔"

سلیمہ کا لہو جما دینے والا لہجہ موسم بہار کی خنک ہوا میں اس کا بدن کپکپا گیا۔ وہ صاف شفاف مجبوری آنکھوں میں اپنے لیے نفرت اور انتقام بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ سینے میں درد کی شدید لہر اٹھی اس نے بھی تو مرب درندوں کو تحفظ اور مدد فراہم کی تھی۔ لہٰذا ایک ظالم و مظلوم کے درمیان کیا رشتہ ہو سکتا ہے بجز دشمنی کے؟ اس نے چاہا کہ زمین اس کا گریبان پکڑے اور تار تار کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔ مگر وہ صلاح الدین کو سینے سے لگائے کھڑی تھی۔ اس نے اپنے سارے جذبات بچے میں منتقل کر دیے تھے۔

"صلاح الدین کا نام ہی تمہیں ڈراوے گا۔" ماحول میں ذرے ذرے سے پکار گونج رہی تھی۔

جب وہ پیرس لوٹا تو بے حد خاموش اور بکھرا ہوا تھا۔ روح میں ہر لمحہ ضمیر کی عدالت لگتی اور وہ خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پیر مارتا۔ آخر اس نے کتابوں میں پناہ ڈھونڈ لی۔ علم نفسیات میں تخصیص کے بعد شعبہ انسانی وسائل میں تبادلہ بآسانی ہو گیا۔ مگر دنیا میں جنگ کے شعلے بھڑکتے ہی رہے۔ اب وہ اسلحہ سنبھالنے کے بجائے جنگ کے اسباب اور اثرات پر رپورٹیں مرتب کرتا۔ جنگ زدہ اقوام کے نفسیاتی مسائل کا جائزہ لیتا۔ پناہ گزینوں کو سامان خورد و نوش اور ادویہ کی فراہمی بھی اس کے کار منصبی میں شامل تھے۔

جارح اور غاصب اقوام کا پلہ بھاری رہنے کے باعث مسائل جوں کے توں رہے۔ انصاف کی دھجیاں بکھیرتا عالمی ادارہ اپنے قیام کا جواز ثابت کرتے کرتے الجھتا چلا گیا۔ جنرل پیری کو اپنی پیدائش کا جواز ہی سمجھ میں نہیں آتا تھا اس فوج کی کارکردگی خاک سمجھ میں آتی؟

۲۰۱۴ء میں جنرل (ر) پیری کو بطور نمائندہ اقوام متحدہ فلسطینی پناہ گزینوں کی حالت زار کا جائزہ لینے غزہ آنا پڑا۔ غزہ میں اسرائیلیوں کی ناکہ بندی نے فلسطینی پناہ گزینوں کو نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

واپسی کا سفر سوچوں میں کٹا۔ سلمٰی کے ساتھ ملاقات نے اسے ماضی میں پہنچا دیا تھا۔ فضائی میزبان نے کافی لا کر رکھی تو وہ چونک گیا۔

"جبر کے خلاف سینہ سپر تحریک مزاحمت ہم ماؤں کے دم سے ہے۔ اپنے بچوں کو دشمنوں کے سامنے کھڑا کرنا جوش و جنون سے زیادہ ہے۔ اسرائیلی جیل خانوں میں قید تشدد اور تعذیب کا شکار مائیں اپنے خون، جان و مال اور عزت کی قربانیاں دے کر جو تاریخ رقم کر رہی ہیں اس کا تصور کرنا تمہارے لیے مشکل ہے۔" سلمٰی کی آواز آسمانوں میں گونج رہی تھی۔

اسے صدر دفتر پیرس آئے ہوئے دو ہفتے بیت چکے تھے مگر یادداشت کے پردے پر وقتاً فوقتاً مائیں نمودار ہو جاتیں...... سیاہ ماتمی لباس پہنے دائرے کی صورت اپنے پاؤں جلدی سے زمین پر مارتی گنگناتی "ہم صحرائی مائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں ہم برف زادوں کی مائیں ہیں۔" اس نے خود کو بہلانے کے کتنے جتن کیے مگر بے سود۔ برسوں سے جاری اندرونی بحث سے وہ تنگ آ گیا۔ تبھی ماؤں نے اسے کیوں ملزموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا؟ جنگی جرائم میں ملوث افراد کی فہرست میں اس کا نام شامل نہیں تھا مگر وہ نادیدہ سزا کاٹ رہا تھا۔ "کیا ظالم کی حمایت ظلم کا حصہ نہیں؟" اس کے دل میں کسی نے سرگوشی کی۔

بلند ہوتی آوازوں سے گھبرا کر وہ ایک شام پارک میں جا بیٹھا۔ ننھے ننھے بچے اپنی ماؤں کے گرد کھیلتے دور نکل جاتے۔ پھر واپس پلٹ کر ان کے اطراف چکر لگاتے اور ماؤں سے چمٹ جاتے۔

اگلی صبح وہ ڈاک دیکھ رہا تھا کہ وادی کشمیر سے آئے ایک خط نے سلگتی چنگاری کو ہوا دے ڈالی۔ نواح سری نگر بھارتی فوجیوں نے ایک معذور لڑکے کو اغوا کیا اور پھر اسے اذیتیں دے کر ہلاک کر ڈالا۔ اب اس کی ماں زیتون بیگم انصاف چاہتی تھی۔ اس نے لکھا:

"ہم کہساروں کی مائیں وادی کشمیر میں جدوجہد اور صبر پر عمل پیرا ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے حالت جنگ میں....."

کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"اُف۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"کہساروں کی مائیں!....."

"دنیا کے کونے کونے میں ماؤں کو ذلیل و رسوا کر کے ہم کس قسم کا امن چاہتے ہیں؟؟" وہ بلند آواز میں بڑبڑایا۔

اگلے ہی دن اس نے قبل از وقت سبکدوشی کا اعلان کر کے سب ساتھیوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ کانفرنس ہال میں میڈیا کے کئی نمائندے موجود تھے۔ مشہور خبر رساں ایجنسی کے صحافی نے اسے چھیڑا "گویا اب آپ کیریئر کے اختتام پر زندگی کا آغاز کریں گے۔" پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ "باون سال کی عمر کیا ہے! عیش و عشرت کی کیا کمی ہے آپ کے لیے۔"

لیکن وہ تو کسی اور ہی دھن میں تھا۔ خودکلامی کے انداز میں بول پڑا۔ سامنے درجنوں مائیکوں پہ آواز اور الفاظ ارتعاش پیدا کرنے لگے۔

"میرا اختتام کیریئر ماؤں پر قربان....

"..... اے عزم و ہمت کے پیکرو! صبر و استقامت کی تصویرو!

"اے حیادار تہذیب کے گہوارو! اے امت مسلمہ کی ماؤ! تمھیں سلام!!"

وہ پھر کرسی دھکیل کر کھڑا ہوا سیلوٹ کے لیے ہاتھ پیشانی پر لگائے بوڑھا جرنل دھاڑیں مار کر روتے ہوئے بول اٹھا:

"فلسطین سے کشمیر، بوسنیا سے عراق و افغانستان تک مسلمان مائیں بری طرح لہولہان ہیں مگر اپنی ممتا کو کسی صورت ملی سالمیت پر غالب نہیں آنے دیتیں۔ وہ بے دریغ قربانیاں دیے چلی جا رہی ہیں اپنے بیٹوں بھائیوں اور عصمتوں کی.....

"آج یوم مادر مہربان پورے کرۂ ارض پر تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے مگر میں مغرب کا ایک نمایاں فرد اپنی ماں کو آج تک نہیں دیکھ سکا۔ میں ایک جھولے سے اٹھایا گیا بچہ ہوں جسے ایک لاولد جوڑے نے گود لیا۔ ماؤں سے خالی ہمارے سماج میں وحشی درندوں یا پھر ذہنی مریضوں کا ہجوم ہے۔"

اگلی صبح اخبارات میں ایک کالمی خبر شائع ہوئی:

"اقوام متحدہ میں شعبہ انسانی وسائل کے سربراہ جرنل (ر) پیرس اپنی سبکدوشی کے موقع پر ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ انھیں نفسیاتی اسپتال منتقل کر دیا گیا جہاں ان کا علاج پاکستانی نژاد ڈاکٹر شیریں کر رہی ہیں۔"

◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھوج میں لالچ آ جائے
تو سارا علم ضائع

کھوجی

چوروں کے کھرے کھوجنے والے کی سراغ رسانی کا انوکھا قصہ۔ ایک دن اُسے عجب امتحانی گھڑی سے واسطہ پڑ گیا

کمال [illegible]

وہ دسمبر کی سرد رات تھی۔ اس سال جاڑا بھی معمول سے کچھ زیادہ ہی پڑ رہا تھا۔ تبھی مرغ کے بانگ دینے پر عبداللہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھا۔ چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے اپنے کرتے کے گریبان میں منہ ڈال کر سینے پر پھونک ماری۔ پھر کے ساتھ والی چارپائی پر سوئی اپنی بیوی زینب کے قریب آتے شانہ ہلایا۔ پھر اسے آواز دی ”زینب اٹھ جا! نماز کا وقت ہو گیا ہے۔“

”کیا ہے؟“ زینب نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا اور دوسری طرف کروٹ لے کر پھر سو گئی۔

”میں کہہ رہا ہوں اب اٹھ بھی جاؤ۔“

”کیا اذان ہو گئی؟“

”نہیں ابھی تو مرغ نے بانگ دی ہے۔“

”مرغ نے ابھی پہلی بانگ ہی دی ہو گی۔ ویسے بھی آج کل کے مرغ وقت بے وقت بانگیں دیتے رہتے ہیں۔ زمانے کے ساتھ انسان تو بدلا سو بدلا جانور اور چرند پرند بھی بدل گئے۔ تم نے سنا نہیں اب تو مرغے بھی رات کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بولتے ہیں۔ قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ میں تو سونے لگی ہوں۔ ابھی اذان میں بڑا وقت پڑا ہے۔“

عبداللہ دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا اور اذان کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر اذان نہ ہوئی اور مرغ نے دوبارہ بانگ دی تو وہ سوچ میں پڑ گیا ”زینب ٹھیک ہی کہتی ہے۔ وقت کے ساتھ ہر چیز بدل چکی۔ شہروں کے ساتھ ساتھ اب گاؤں کے ماحول میں بھی بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ رہن سہن کے ساتھ لوگوں کے مزاج بھی بدل گئے۔

”وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو عبداللہ اپنے بزرگوں سے سنتا اور ان پر عمل کرتا آیا تھا آج اس کے پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں ان باتوں کا مذاق اڑاتے اور ہنستے تھے۔ اسے یاد تھا کہ ان کے ہاں چراغ جلتے ہی دادی اونچی آواز سے کلمہ پڑھتی اور پھر ایک شعر سا پڑھتی ”دیا بلے گل ہا نکلے۔ چراغ روشن مراد حاصل۔“

اسی طرح رات کو سوتے وقت جب چراغ بجھایا جاتا تو تب بھی کلمہ پڑھتے۔ سونے سے قبل تو خاص طور پر کلمہ پڑھا جاتا۔ بقول دادی کے اگر کوئی بندہ سوتے ہی میں اپنے رب کے پاس چلا جائے تو آخری دم اس کی زبان پر کلمہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح سو کر اٹھنے پر بھی کلمہ پڑھا جاتا۔ عبداللہ کو بچپن ہی سے یہ روایت پسند تھی۔

آج بھی بجلی آ جانے کے باوجود جونہی مغرب کی اذان کے ساتھ ہی جلائی جاتی تو بے اختیار اس کی زبان سے وہ مخصوص فقرے ادا ہو جاتے۔ سوچا جائے تو ان باتوں پر عمل کرنے سے نقصان تو کوئی نہیں تھا۔ پر آج کی نسل مانے بھی ہو تو پرانے لوگوں کو جاہل اور دقیانوسی کہہ، پرانی باتوں اور قدروں کا مذاق اڑاتی ہے۔

اب اسی بات کو لیجیے کہ کچھ عرصہ پہلے تک گاؤں میں کہیں چوری ہو جاتی تو پولیس کے بجائے کھوجی کو بلایا جاتا۔ عبداللہ کے باپ دادا بھی کھوجی تھے۔ اسے یہ پیشہ وراثت میں ملا۔ وہ اپنے خاندان میں واحد فرد تھا جس نے اپنا آبائی پیشہ ترک نہیں کیا مگر اب لوگ چوری ہو جانے پر پولیس کو خبر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا بھلا ایسے فرسودہ طریقے سے کہیں چور پکڑا جا سکتا ہے؟ حتیٰ کہ اس کا اپنا بیٹا بھی مذاق اڑاتا۔ ”ابا آپ بھی کس صدی کی بات کرتے ہیں! اب تو چور ایسے نت نئے طریقوں سے چوری کرتے ہیں کہ پولیس بھی دنگ رہ جاتی ہے۔ پہلے چور بھی سادہ لوح تھے کوئی نہ کوئی سراغ یا کھرا چھوڑ جاتے ہوں گے۔“

”نہیں بیٹے! ایسی بات نہیں تھی۔ کھوج لگانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ تیرا باپ کہتا ہے نہیں یہ بڑا مشکل فن ہے۔ کھوجی بننے کے لیے بڑی محنت اور ریاضت درکار ہوتی ہے۔“

”نہیں ابا! میرا خیال ہے کہ اس طرح چور پکڑنا تو تیر تکا لگانے والی بات ہے۔“

عبداللہ بیٹے سے زیادہ بحث نہ کرتا پر اسے اپنے کھوجی ہونے پر بڑا ناز تھا۔ ساٹھ سالہ زندگی میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے کھرا نہ پایا اور چور نہ پکڑا گیا۔ کھوج اس کا شوق تھا۔ یہ کام وہ فی سبیل اللہ کرتا۔ جن کے گھر کھرا پہنچ جاتا وہاں سے پانی تک نہ پیتا۔ اس کا کہنا تھا کہ کھوج میں اگر لالچ آ جائے تو علم ضائع ہو جاتا ہے۔

عبداللہ متقی عبادت گزار قناعت پسند اور اللہ پر توکل رکھنے والا انسان تھا۔ لوگ اس کی بڑی عزت کرتے۔ اکثر اپنے گھریلو مسائل کے لیے اس سے دعا کرواتے اور مشورہ بھی کرتے۔

گاؤں میں عبداللہ کی چند کلے زمین تھی۔ کھیتی باڑی سے جو روکھی سوکھی مل رہی تھی وہ اس پر خوش اور مطمئن تھا۔ مگر بیٹا کھیتی باڑی بھی ناپسند کرتا۔ وہ اکثر باپ کو الزام دیتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اگر آپ نے مجھے آٹھ جماعتوں سے زیادہ پڑھایا ہوتا تو میں بھی شہر جا کر کوئی اچھی سی نوکری کرتا۔ گاؤں میں پڑا سڑ نہ رہا ہوتا۔"

"اللہ کا شکر ادا کیا کرو! کس چیز کی کمی ہے تمہیں؟ اس کا بڑا کرم ہے کسی کا محتاج نہیں کیا۔ شہر میں کیا رکھا ہے؟ افراتفری! نفسا نفسی! ہر بندہ اس طرح بھاگ رہا ہے جیسے پیچھے پاگل کتا لگا ہو۔ اپنے گاؤں میں کتنا سکون اور سکھ ہے۔ شہروں میں یہ سب کہاں؟"

مگر بیٹے کو شہر میں نوکری کا جنون تھا۔ لہٰذا وہ اپنی ضد پوری کر کے ہی رہا۔ بیٹے نے بڑا زور لگایا کہ وہ زمین بیچ کر شہر چلے جائیں۔ وہاں کوئی کاروبار کر لیں گے مگر عبداللہ نہ مانا۔ اس نے اپنی زمین اور گاؤں چھوڑنا کسی طور قبول نہ کیا۔

اذان کی آواز آئی تو وہ چونکا۔ زینب کو آواز دیتا چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا۔ چادر کی بکل ماری اور تیز تیز قدموں سے مسجد کی طرف چل پڑا۔ برگد کے قریب سے گزرا تو ٹھٹک گیا۔ زمین پر کوئی گٹھڑی نما سی شے پڑی تھی۔ خوف کی ایک لہر رگ و پے میں دوڑ گئی۔ "خدا معلوم کیا بلا ہے؟" اس نے سوچا۔

آخر ہمت کر کے آگے بڑھا۔ معلوم ہوا کوئی آدمی ہے۔ عبداللہ نے اسے چھو کر دیکھا، وہ بے ہوش تھا۔ وہ الٹے قدموں گھر کی طرف بھاگا اور جلدی جلدی اپنے بستر سے رضائی اٹھا لایا۔ آدمی کو رضائی اوڑھائی اور نماز پڑھنے چلا گیا۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی سیدھا اس آدمی کے پاس آیا۔ وہ پہلے سے قدرے بہتر حالت میں تھا۔ عبداللہ گھر آیا تو زینب رسوئی میں تھی۔ اس نے انگیٹھی میں سرخ انگاروں کو نکال ڈالے اور باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ لوٹا اور دیگچی میں سے گرم گرم دودھ گلاس میں ڈال جتنی تیزی سے آیا تھا اسی طرح باہر کی طرف لپکا۔ زینب نے یہ ساری کارروائی دیکھی تو پوچھنے لگی "یہ کس کے لیے لے جا رہے ہو؟"

"برگد تلے ایک آدمی سردی سے بے ہوش پڑا تھا۔ خدا جانے کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟"

"تم نے سارے زمانے کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟ اور یہ تمہاری رضائی کدھر ہے؟"

"وہ میں نے اسی کو اوڑھا دی۔ بیچارا تن کے کپڑوں میں گٹھڑی بنا پڑا تھا۔"

"لو اور سنو!" زینب نے ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا "بھلا تم نے اپنی رضائی کیوں اوڑھا دی کھیس دے دیتے؟ اب تم کیا اوڑھو گے؟ جیسے بڑے نواب ہو نا۔"

عبداللہ خاموشی سے دودھ کا گلاس لیے باہر نکل گیا۔ وہ شخص ہوش میں آ چکا تھا۔ عبداللہ نے اسے سہارا دیتے ہوئے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھایا۔ اس کے کپڑے نہایت گندے اور بوسیدہ تھے۔ جسم سے اٹھتی بو بھی بڑی واضح تھی۔ شاید وہ کافی دنوں سے نہایا نہیں تھا۔ داڑھی اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ عبداللہ نے اس سے ایک دو سوال کیے تو وہ خاموش رہا۔

"بیچارا اللہ جانے کن دکھوں کا مارا ہوا ہے یا پھر شاید گونگا ہے۔" عبداللہ نے دکھی دل سے سوچا۔ "ہو سکتا ہے کوئی اللہ لوک ہو۔ ایسے لوگوں کو بھی دنیا والے کہاں جینے دیتے ہیں!" دن چڑھتے ہی گاؤں بھر میں اس شخص کی ڈرامائی آمد کی خبر پھیل گئی۔ لوگ اسے دیکھنے جمع ہو گئے۔

وہ رضائی میں لپٹا سر جھکائے بیٹھا اپنے حلیے سے مجذوب لگ رہا تھا۔ کچھ روز عبداللہ اس کے کھانے پینے کا بندوبست کرتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ گاؤں کے دوسرے گھروں سے بھی کھانا آنے لگا۔ چونکہ وہ بات چیت نہ کرتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں تھا صرف اشاروں سے کام چلاتا چناں چہ سائیں گونگا کے نام سے وہ مشہور ہو گیا۔

آہستہ آہستہ سادہ لوح اور ضعیف العقیدہ لوگوں کا برگد کے نیچے ہجوم رہنے لگا۔ انھوں نے برگد سے ملحق جگہ پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا دی جہاں سائیں بابا ہر وقت نہ جانے کس گیان میں معروف رہتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سائیں بابا کی دھوم دور دور تک پھیل گئی۔ لوگ اپنی اپنی آرزوؤں کے خالی کشکول لیے پہنچنے لگے۔ وہ سائیں بابا کے وسیلے سے رب تک اپنی آرزوئیں، امیدیں، حسرتیں اور تمنائیں پہنچانا چاہتے تھے۔ سادہ لوح نادان لوگ نہیں جانتے تھے کہ اللہ تو شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ وہ تو کہتا ہے مجھے سچے دل سے پکارو میں سنتا ہوں۔

سادہ لوح نادان لوگ نہیں جانتے تھے کہ اللہ تو شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ وہ تو کہتا ہے مجھے سچے دل سے پکارو میں سنتا ہوں۔

ہر کسی کی آرزو مزاج اور ظرف کے مطابق تھی۔ کوئی یہ چاہتا تھا کہ خوب بارش ہو، گندم کی فصل اچھی ہو اور وہ زمیندار کا قرض اُتار سکے۔ کسی ماں کی یہ آرزو تھی کہ بیٹی کے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔ کسی کو بیٹے کی تمنا کھینچ لائی۔ کوئی ساس کے ہاتھوں دکھی تھی اور کسی کو سوتن کا روگ تھا۔ کوئی محبوب مانگنے اور کوئی جوئے میں جیتنے کی تمنا لیے آتا۔ بابا کے پاس آنے والوں میں تن کے روگی بھی تھے اور من کے بھی۔ مختلف بیماریوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے بیمار، اپاہج، کوڑھی اور ذہنی مریض بھی اس سے مسیحائی کے طالب تھے۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ لوگوں کے کام ہونے لگے اور سائیں بابا کی کرامات کی دھوم دور دور تک پھیلتی چلی گئی۔ برگد تلے ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہنے لگا اور عقیدت مندوں نے لنگر کا باقاعدہ سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ بابا جی سر جھکائے بیٹھے رہتے۔ لوگ اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کا اظہار کرتے تو وہ انگلی اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے اور پھر لوگوں کو اشارے سے جانے کا کہتے۔ آنے والے اپنی استطاعت کے مطابق نذرانے لاتے اور بابا کے قدموں میں رکھ دیتے جو وہ لوگوں ہی میں بانٹ دیتے۔

چودھری رب نواز کے ہاں پانچ بیٹیوں کے بعد سائیں بابا کی دعا سے بیٹا پیدا ہوا تو اُن کی شہرت کو مزید چار چاند لگ گئے۔ اس روز چودھری اتنا خوش تھا کہ بزار منت سے بابا جی کو کندھوں پر اٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ چودھری نے بہت منتیں ترلے کیے کہ سائیں بابا اس کی بیٹھک میں مستقل رہائش اختیار کر لیں پر انھوں نے اشارے سے منع کر دیا۔ سائیں بابا نے نومولود کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اور پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ چودھری بہت خوش تھا کہ وہ پہلی بار اس کے گھر آئے تھے۔ ورنہ پہلے بہت لوگوں نے منتیں کیں، ہاتھ جوڑے کہ سائیں جی ان کے گھر کو عزت بخشیں مگر وہ ہمیشہ انکار کر دیتے تھے۔

چودھری نے بیٹا پیدا ہونے کی خوشی میں زبردست جشن منایا۔ شہر سے مشہور گانے والی بلوائی گئی۔ اس روز گاؤں میں میلے کا سماں تھا۔ رات بھر محفل رقص و سرود برپا رہی۔ اس کے بعد سب لوگ جب تھک کر چور ہو گئے تو کسی کو سدھ بدھ نہ رہی۔ دن چڑھے چودھرانی کی بلند و بالا چیخ نے ساری حویلی کو ہلا کر رکھ دیا۔ تجوری کھلی پڑی تھی تمام نقدی اور زیورات غائب تھے۔

چودھرانی سینہ پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ جو دوست احباب اور رشتہ دار حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے سب اپنی اپنی جگہ شرمندگی محسوس کرنے لگے۔ پھر کسی نے پولیس کو خبر کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر چودھری

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

صاحب کچھ ہچکچا رہے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ پولیس تو سب کو شامل تفتیش کرے گی۔ حتیٰ کہ گھر کی عورتوں سے بھی پوچھ گچھ ہوگی۔ پھر گھر آئے مہمانوں سے بھی چھان بین ہوتی اور یہ سب چودھری کو کسی طور گوارا نہ تھا۔

کسی نے رائے دی کہ عبداللہ نجومی کو بلایا جائے۔ عبداللہ نے آ کر پہلے تو مصلیٰ منگوایا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر تجوری کا جائزہ لیا۔ کمرے کا معائنہ کیا۔ آدھے پونے گھنٹے میں وہ کھرا ناپنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن جس جگہ وہ پہنچا لوگوں کے ساتھ ساتھ خود اس کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹ گئیں۔

"سائیں بابا...... یہ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا۔ ان پر تو شک کرنا بھی گناہ ہے۔"

چودھری نے عبداللہ کی خوب بے عزتی کی "اوئے تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا! کیا کہہ رہا ہے تو؟ خوب کھرا ناپا ہے۔ بڑا کھوجی بنا پھرتا ہے۔ شرم نہیں آتی؟ توبہ توبہ نعوذ باللہ! بابا جی اور چوری...... خدا کے قہر سے ڈرو۔"

عبداللہ خود حیران تھا اور کسی طور سائیں بابا کو چور ماننے پر تیار نہیں تھا۔ بھلا درویش کو مال و دولت سے کیا سروکار؟

"میں کب کہتا ہوں کہ چوری سائیں بابا نے کی ہے۔ میرا تو بس کھرا یہاں آ کر ختم ہو گیا ہے۔ چور یہاں تک آیا اور پھر شاید بابا جی کی کرامت سے اس کا کھرا غائب ہو گیا۔"

عبداللہ سے مایوس ہو کر ناچار چودھری نے پولیس سے مدد طلب کی لیکن وہ بھی چور کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔ کچھ دن بعد ملک اکرم کے ہاں چوری ہوئی۔ چور پہلے کی طرح صفایا کر کے چلتا بنا۔ پولیس آئی۔ کئی روز تفتیش ہوتی رہی۔ گاؤں کے مشکوک لوگ اور ملازم وغیرہ زیر عتاب آئے لیکن اس بار بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

تھانیدار نے دبے لفظوں میں سائیں بابا کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا تو عقیدت مندوں نے اسے اتنا ڈرایا کہ وہ بھی خوفزدہ ہو گیا۔

تھک ہار کر دوبارہ عبداللہ کو بلوایا گیا۔ عبداللہ کا کھرا پھر سائیں بابا کے ڈیرے پہنچ کر ختم ہوا۔ اس بار عبداللہ نے برملا اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ "میرا علم اب کام نہیں کرتا۔ لگتا ہے میں اب واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں ٹھہرا پرانے وقتوں کا آدمی میرا طریقہ کار اب کہاں کامیاب ہو سکتا ہے۔"

عبداللہ کو اپنی بے عزتی سے زیادہ ناکامی کا صدمہ تھا۔ اُسے اپنے علم و فن اور صلاحیت پر بڑا ناز تھا۔ اُسے اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں پہلی بار ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ وہ لوگوں کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگا۔ اسے محسوس ہوا لوگ اس پر ہنس رہے ہیں، مذاق اُڑا رہے ہیں۔

اب تو عبداللہ کے تئیں اس کی عزت دو کوڑی کی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ رات دن بے چین رہتا۔ زینب اُسے سمجھاتی "فضل کے ابا! تم نے کیوں یہ بات دل کو لگا لی! بھول چوک تو ہر بشر ہی سے ہوتی ہے۔ کیا ہوا اگر تم چور کا کھرا نہیں ناپ سکے۔ بچے ٹھیک ہی کہتے ہیں آج کل کے چور نت نئے طریقے آزماتے ہیں۔"

عبداللہ جواب میں خاموش رہتا۔ اس رات چاند پورے جوبن پر تھا۔ چاندنی میں ہر چیز بڑی صاف اور واضح نظر آ رہی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ سائیں بابا نے گودڑی اتار پھینکی اور انگڑائی لے کر اٹھا۔ اپنا بوریا اٹھایا اور نیچے گڑھے سے ایک پوٹلی نکالی جسے دیکھ کر آنکھوں میں ناقابلِ چمک آ گئی۔ اس نے پوٹلی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اچانک کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ گھبرا کر تیزی سے پلٹا۔ دیکھا عبداللہ کھڑا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اُسے دیکھتے ہی سائیں نے اپنا دایاں ہاتھ اونچا کر دیا۔ ایک تیز دھار خنجر اس میں دبا تھا۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ ورنہ میں جان سے مار دوں گا۔" سائیں بابا نے خنجر عبداللہ پر تان لیا۔

"خنجر واپس رکھ لو! میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ واقعی میری کھوج کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے؟ مگر مجھے خوشی ہوئی کہ میرا علم میرے پاس ہے۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اس لیے نہیں کہ میں تم سے ڈر گیا اور جان بچانے کے لیے تم سے جھوٹ بول رہا ہوں بلکہ صرف اس لیے کہ میں گاؤں کے لوگوں کو صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا۔ ان سادہ لوح لوگوں نے تمہیں بڑے اونچے سنگھاسن پر بٹھا دیا تھا۔ تمہاری اصلیت جان کر انہیں بہت صدمہ ہوگا اور نیکی پر سے ان کا اعتبار اٹھ جائے گا۔"

صبح جب لوگوں نے سائیں بابا کو غائب پایا تو انہیں بہت دکھ ہوا۔ وہ سب لوگ عبداللہ کو مورد الزام ٹھہرانے لگے۔ اُن کے خیال میں عبداللہ نے سائیں بابا پر چوری کا شک کیا تھا اس لیے وہ چلے گئے۔ عبداللہ سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا اور اپنی صفائی میں ایک لفظ تک نہیں بولا۔

"فضل کے ابا آخر تمہیں کیا پریشانی ہے۔ رات رات بھر جاگتے رہتے ہو۔ کیا سائیں بابا کے جانے سے پریشان ہو؟ انہیں گئے ہفتے سے اوپر ہونے کو آیا پر تم ابھی تک اُن کے جانے کا سوگ منا رہے ہو۔ تم نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ وہ تمہاری وجہ سے گئے ہیں۔ اپنے آپ کو خوامخواہ مجرم بنائے بیٹھے ہو۔ وہ اللہ والے تھے ان لوگوں کا ایک جگہ ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ جوگی اور سانپ کا بھی کبھی مستقل ٹھکانہ ہوا ہے؟ دل میں لہر آئی اور چل دیے۔ ہو سکتا ہے کبھی دوبارہ لوٹ آئیں۔"

زینب نے اسے بہت تسلی دلاسا دیا مگر عبداللہ جواب میں خاموش ہی رہتا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ درویشی کی بکل میں ایک چور چھپا ہوا تھا۔ وہ دوسروں کا تو مال و دولت لوٹ کر لے گیا مگر اس کے دل سے بھی اعتبار کا پودا جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

☆......☆......☆

اس روز عبداللہ صبح کی نماز پڑھنے مسجد جانے کے لیے نکلا تو قدم زمین نے جکڑ لیے۔ سائیں بابا برگد تلے اسی جگہ جھونپڑی میں اپنے مخصوص انداز میں براجمان تھا۔

"اب کیوں آئے ہو یہاں؟ کیا کوئی نیا ڈھونگ رچانا چاہتے ہو" عبداللہ نے اس پر طنز کیا۔

"تم چوری کا کھوج کیسے لگا لیتے ہو؟"

"کیا یہی پوچھنے کے لیے لوٹ آئے؟"

"نہیں!" سائیں بابا جیسے کسی سوچ میں تھا۔

"پھر کیوں آئے ہو؟ جو کچھ تم لوٹ کر لے گئے تھے وہ کافی نہیں تھا۔"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد سائیں بابا بولا "میں بھی کھوجی بننا چاہتا ہوں۔"

"چور اور کھوجی...... بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔" عبداللہ کے لہجے میں بے یقینی اور حیرت تھی۔

"نہیں میرے بھائی میرا مذاق مت اڑاؤ! مجھے ضرور سکھاؤ کہ تم کھوج کیسے لگاتے ہو" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"کھوجی بننے کا کوئی قاعدہ کلیہ تو ہے نہیں اور نہ ہی یہ کوئی ایسا علم ہے کہ میں تمہیں پڑھا سکوں۔ تاہم تمہیں اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق یہ ضرور بتاؤں گا کہ کھوجی بننے کے لیے کن بنیادی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اس سے پہلے تمہیں میری دو باتوں کا جواب دینا ہوگا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"پوچھو!" سائیں متوجہ ہو کر بیٹھ گیا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تم نے چوری کیوں کی؟"

"دوسری یہ کہ جو کچھ تم حاصل کرنا چاہتے تھے وہ تو کر چکے۔ پھر لوٹ کر کیوں آئے؟"

"چوری میں نے اس لیے کی کہ یہ میرا پیشہ ہے۔ میں جب اس گاؤں میں پہنچا تو جیل سے بھاگ کر آیا تھا۔ یہ داڑھی بھی میں نے پولیس سے چھپنے کے لیے بڑھائی تھی۔ جس رات میں تمہیں ملا میں تھکن سے چور اور کئی روز سے بھوکا تھا۔ تم لوگ مجھے نجانے کیا سمجھے۔ میں نے بھی سوچا کہ پولیس سے بچنے کا اس سے بہتر طریقہ شاید اور کوئی نہیں۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے بدلے حلیے میں پولیس بھی نہیں پہچان پائے گی تو میں چوری کر کے چلا گیا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا "تمہاری دوسری بات کا جواب شاید مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ اب میری بات کا جواب دو کہ سچی جنت کے لیے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔"

"سچوں کی پہلی منزل پانے کے لیے من کا آئینے کی طرح اجلا اور شفاف ہونا شرط ہے۔ من کو لالچ، مکر و فریب، ریاکاری اور غرض سے پاک کرو۔ پھر اپنے اندر توکل کا ایک دیا جلا کر بیٹھ جاؤ۔ اندر روشنی ہو تو سچوں آسان ہو جاتی ہے۔"

سائیں کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا "تم سے میری ایک التجا ہے۔ لوگوں کو میرے بارے میں کچھ مت بتانا۔"

عبداللہ زبان سے تو کچھ نہیں بولا مگر اس کے ہاتھوں کی گرفت نے سائیں کو یقین دلا دیا کہ اس کا راز راز ہی رہے گا۔

"ایک درخواست اور ہے۔ کسی طریقے سے لوگوں کو منع کر دو کہ وہ میرے پاس نہ آیا کریں۔ وہ مجھے نجانے کیا سمجھتے ہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ میں......"

عبداللہ نے سائیں کی بات کاٹ دی اور بولا "لوگوں کو آنے سے مت روکو۔ یہ لوگ تم سے نہیں مانگتے۔ یہ تو صرف اپنے یقین کی ڈوری سے بندھے چلے آتے ہیں۔ تم نہ ہوتے تو کوئی اور ہوتا۔ تمہارے سہارے آس کا دامن پھیلائے رہتے ہیں مایوس اور ناامید نہیں ہوتے۔ اپنے دکھ درد تمہارے سامنے بیان کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔ ورنہ ہم سب جانتے ہیں مرادیں پوری اور دکھ دور کرنے والا تو وہ اوپر بیٹھا ہے نیلی چھتری والا۔" عبداللہ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔

"تم مجھے نماز اور قرآن پڑھنا سکھا دو۔ شہر سے آتے ہوئے میں قرآن پاک ساتھ لیتا آیا ہوں۔"

کچھ دیر ان دونوں کے درمیان خاموشی رہی پھر عبداللہ بولا "ابھی تم صرف الف کا ورد کیا کرو۔"

"بس صرف الف؟" سائیں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں صرف الف۔ بندے کو صرف ایک الف ہی درکار ہوتا ہے۔ جس نے الف کی حقیقت پالی وہ کسی اور چیز کا محتاج نہیں رہتا۔"

سائیں کو گہری سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر عبداللہ مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔

عبداللہ جب مسجد سے لوٹا تو پو پھٹ چکی اور دن کا اجالا چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ سائیں بابا مدھم آواز میں الف اللہ کا ورد کر رہا تھا۔ عبداللہ کچھ دیر خاموشی سے کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر آنکھوں میں آئے آنسو انگلی کی پوروں سے پونچھتا گھر کی طرف چل پڑا۔

◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاکستان تو جنت ہے

مغربی تہذیب سے متنفر ایک جرمن لڑکے کا اعلانِ حق

نوید اسلام صدیقی

مختار صاحب میرے محلے میں رہتے ہیں۔ اکثر مسجد میں ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ انھوں نے ایک واقعہ سنایا جو انھی کی زبانی پیش ہے۔

میری بیٹی جرمنی میں مقیم ہے۔ اس کے پڑوس میں رشید صاحب نامی پاکستانی رہتے تھے۔ جب وہ پاکستان آنے لگے تو بیٹی نے ان کے ہاتھ ہمارے لیے کچھ سامان بھجوایا۔ موصوف گجرات کے رہائشی ہیں۔ میں وہ سامان لیے ان کے پاس گجرات گیا۔ ان کے گھر کا پتا لڑکوں سے پوچھ رہا تھا کہ انھوں نے ایک لڑکے کو آواز دی "اوئے جرمن اوئے جرمن!"

بھورے بالوں والا ایک گورا چٹا لڑکا وہاں آ گیا۔ وہ رشید صاحب کا بیٹا عمران تھا۔ وہ بہترین انداز میں پنجابی بول رہا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں رشید صاحب سے ملاقات ہوئی جو عزت و احترام سے ملے۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر انھوں نے بتایا "عمران لمبے چوڑے جسم کی وجہ سے چالیس پینتالیس سال کا لگتا ہے ویسے اس کی عمر تیرہ سال ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کی والدہ سے میں نے میرج کی تھی تاکہ جرمن شہریت حاصل کر سکوں۔ پچھلے ماہ میرے چچا فوت ہوئے تو مجھے گجرات آنا پڑا۔ ضد کر کے یہ بھی ساتھ آ گیا۔ یہ پاکستان دیکھنا چاہتا تھا۔ چونکہ گھر میں پاکستان کے بارے میں بہت باتیں ہوتی تھیں اسی لیے وہ پر تجسس رہنے لگا۔

"پاکستان آ کر عمران نے عجیب تماشا لگا دیا۔ کہتا ہے کہ جرمنی بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے! وہاں ہر چیز مصنوعی ہے حتیٰ کہ پیار بھی نقلی ہے۔ جبکہ پاکستان میں مجھے اصلی محبت ملی۔ اسی لیے پاکستان تو جنت ہے۔ مجھے واپس جرمنی نہیں جانا۔

"میں اسے سمجھاتا ہوں کہ ہم جرمنی میں رہتے ہیں۔ یہاں تم کس کے پاس رہو گے؟ تو کہتا ہے کہ کہیں بھی رہ لے گا۔ روزانہ محلے سے کسی مرد یا عورت کو پکڑ لاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ان کے گھر رہ لے گا۔"

دوران گفتگو عمران بھی قریب بیٹھا تھا۔ وہ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا "انکل! آپ مجھے اپنے پاس لاہور بلوا لیں۔"

میں نے کہا "بیٹا! اپنے والد کا مسئلہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر تم جرمنی واپس نہ گئے تو تمہاری والدہ ان پر مقدمہ کر سکتی ہیں۔ تم فی الحال ابو کے ساتھ واپس چلے جاؤ۔"

یہ سن کر عمران اٹھا اور باہر نکل گیا۔ رشید صاحب کچھ دیر سر پکڑے بیٹھے رہے پھر بولے "عمران بے چین طبیعت کا مالک ہے۔ میں نے اس کی ماں کو طلاق دے دی تھی۔ تین سال وہ اس کے پاس رہا۔ پھر جب میں اپنی پاکستانی بیوی کو جرمنی لے گیا تو یہ ہمارے پاس رہنے لگا۔

"ہمارے گھر کا ماحول زیادہ مذہبی نہیں مگر انٹرنیٹ سے اس نے دین اسلام کے متعلق ساری معلومات حاصل کر لیں۔ وہ پھر اکثر کہنے لگا کہ جرمن عورتوں میں شرم ہے نہ حیا! ہم اس غیر اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے ذہنی عذاب جھگت رہے ہیں۔

"جب کبھی وہ ماں کے پاس جاتا تو اس سے مذہب پہ بحث کرنے لگتا۔ وہ مجھ سے شکایت کرتی کہ آپ اسے کیا سکھا پڑھا کر بھجواتے ہیں؟ میں بتاتا کہ انٹرنیٹ اس کا استاد ہے۔ یہ ماں کو کہتا کہ وہ اسے جہنم کی آگ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

"اسکول والے بھی اس سے نالاں تھے۔ مجھے اساتذہ کے سامنے پیشیاں بھگتنا پڑیں۔ استاد کہتے کہ یہ سائنس کی جماعت میں مذہب پہ گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ جو بات سائنس کے معیار پہ پوری نہ اترے وہ مذہب کے معیار پہ پوری اتر سکتی ہے۔

"جرمنی میں عمران سارا دن کمپیوٹر سے لگ رہتا اور مختلف علما سے مسائل کا حل پوچھتا۔ مجھے اکثر کہتا یورپ اور جرمنی میں اسلام کا مستقبل بہت روشن ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب یورپی جوق در جوق اسلام میں داخل ہوں گے۔ میں بھی دینی تعلیم حاصل کر کے تبلیغ کا فریضہ انجام دوں گا۔"

اس موقع پر میں نے سوال کیا "کیا جرمنی میں اسلام پھیل رہا ہے! اور کیا عمران کے ہم خیال جرمن موجود ہیں؟"

رشید صاحب گویا ہوئے: "جی ہاں! پچھلے ایک عشرے میں کئی جرمن مسلمان ہو چکے۔ جرمنی میں اسلام بڑی سرعت سے پھیل رہا ہے۔ مگر عمران تو اب پاکستان پر فدا ہے۔ میں نے کئی بار اسے یہاں کے حالات سے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہشت گردوں، خودکش حملہ آوروں، اغوا کاروں اور بھتا خوروں کے بارے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

آگاہ کیا۔ لیکن وہ یہی جواب دیتا ہے:

"نبی کریم ﷺ کو ساری زندگی اس سے کہیں زیادہ بڑی شیطانی قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ کفار اور منافقین نے انھیں سکون کا سانس نہیں لینے دیا۔ یہ تو عیاں ہے کہ جو مسلمان رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلا، اسے شیطان اور اس کے حواری ضرور چیلنج کریں گے۔ لیکن ایک بات کا مجھے سو فیصد یقین ہے کہ شیطان کے مقدر میں شکست لکھ دی گئی ہے۔ آپ مجھے موت سے خوفزدہ نہ کریں۔ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کی 'لائف انشورنس' پیدائش سے قبل ہی کر دیتا ہے۔"

یہ باتیں سن کر میں نے کہا: "رشید صاحب! آپ تو خوش قسمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عمران جیسا نیک اور پرہیزگار بچہ دیا۔ وہ صدق دل سے دنیا میں خدا تعالیٰ کا پیغام پھیلانا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عمران جیسے جرمن شہریوں کی بدولت ؎

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اسی دوران ملازم نے یہ اطلاع دے کر ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع کر ڈالا کہ کھانا تیار ہے۔ رشید صاحب مجھے کھانے کی دعوت دیتے ہوئے بولے:

"گو اطعام میں میرے چھ سات رشتے دار آئے بیٹھے ہیں۔ یہ سب اپنے بچوں یا بھتیجوں بھانجوں کو جرمنی بھجوانا چاہتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لیے بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کو تیار ہیں۔ ادھر میرا جرمن بیٹا ہے جو جرمنی سے دور بھاگتا اور پاکستان کو جنت قرار دیتا ہے۔ یہاں آ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں، جبکہ پردیس کی چکاچوند سے پاکستانیوں کی آنکھیں چندھیائی ہوئی ہیں۔"

◆◆◆

نماز میں خشوع کی تدبیر

پانچ وقت کی نماز ہم سب پڑھتے ہیں لیکن ہمارا ذہن یکسو نہیں ہوتا۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے؟ جب محنت لگ رہی ہے۔ وقت بھی لگ رہا ہے تو اس سے نفع کیوں نہ ہو۔ ہر نماز میں خشوع کے حصول کی کوشش بھی کریں۔ یعنی نماز کو ایک بے روح رسم کے بجائے اپنے رب سے ملاقات اور گفتگو میں بدلنے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے صرف توجہ درکار ہے۔ ایک یا ایک سے زیادہ درج ذیل چیزوں پر توجہ مرکوز کرنا بھی کافی ہو سکتا ہے:

☆ جو لفظ یا کلمہ زبان سے کہیں، اس کے معنی ساتھ ساتھ دل میں دہرائیں۔

☆ اللہ تعالیٰ میرے سامنے ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں یا کر رہا ہوں، اسے وہ سن رہا ہے، دیکھ رہا ہے۔

☆ میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور بات چیت کر رہا ہوں۔

☆ میری یہ نماز آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کی جائے گی، اپنے اختیار سے کوئی ایسی چیز نہ کروں کہ یہ قبول نہ ہو۔

خشوع کے حصول کی جو ترکیب قرآن نے بتائی، وہ یہی ہے کہ دل کو دھڑکا لگا رہے کہ اپنے رب سے ملاقات کرنا اور اسی کے پاس واپس جانا ہے۔

آنے والی نماز ہی سے آپ خشوع پیدا کرنے کے لیے ان تدابیر پر عمل شروع کر دیں اور پھر ان پر برابر عمل کرتے رہیں۔ ان شاء اللہ نماز سے آپ کو مطلوب زاد راہ ملنا شروع ہو جائے گا۔ (خرم مراد)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

زندگی میں سب سے اہم بات یہی ہے کہ جنید جمشید کا سوٹ جیت لو یا جوتوں کا جوڑا اور "واش کی گاڑی" پا کے دنیا جہاں کی خوشیاں سمیٹو۔

احسان، صبر و برداشت، بھائی چارے اور محبت کی تعلیمات بھول جایئے اب وقت ہے کہ اپنے مدمقابل سے چار چوٹ کا مقابلہ کیجیے۔ آپ کی منزل یہ ہے کہ اسے ہرا کر دم لیں...... چاہے قومی ٹی وی پہ آپ اپنا مذاق ہی کیوں نہ اڑوا لیں اور لوگ آپ کو احمق و گاؤدی سمجھنے لگیں۔

فہد مصطفیٰ کے پروگرام "جیتو پاکستان" میں ہر دفعہ نت نئے مناظر دیکھنے کو ملے۔ ایک پروگرام میں انہوں نے چھے سات خواتین کو قطار میں کھڑا کر دیا تاکہ ان کے مابین موٹر سائیکل جیتنے کی خاطر مقابلہ ہو سکے۔

جیتنے کے لیے انھیں مرغ کی آواز نکالنی تھی۔ جو ہو بہو آواز نکالتی موٹر سائیکل جیت جاتی.... جی ہاں آج ہم پاکستانیوں کی شامیں اس انداز میں گزرتی ہیں کہ ہم اچھی خاصی تعلیم یافتہ اور معقول نظر آنے والی خواتین کو "ککڑوں کوں" کرتے دیکھتے ہیں تاکہ وہ انعام پا سکیں۔

شاید آج کے کمرشل پسند دور میں ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

اب ہر ماہ رمضان پہ ٹی وی پہ ایسے اشتہاروں کی بھرمار ہو جاتی ہے جن کا موضوع روحانیت اور مذہب ہوتا ہے۔ اسلامی بینکاری موضوع گفتگو بنی، جبکہ ہوٹل والے گاہکوں کو لبھانے کے لیے خصوصی پیش کشیں کرتے ہیں۔ مثلاً ایک دام میں جتنا کھا سکتے ہیں کھائیے۔

جب مذہب کو بھی تجارت بڑھانے کا آلہ بنا لیا جائے تو سادگی اور لالچ و ہوس سے بچنے کے درس اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ چناں چہ یہ سمجھنا خام خیالی ہے کہ ٹی وی پروگرام پیش کرنے والے ناظرین و حاضرین کے مذہبی جذبات سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔

جو بھی اداکار و فن کار خوش شکل، خوش گفتار اور گفتگو میں ماہر تھا، اسے ڈراموں اور صبح کے شو سے نکال کر رمضان پروگرام کا کرتا دھرتا بنا دیا گیا۔ اور ان پروگراموں میں وہ نئی صورت و ہیئت لیے سامنے آئے۔

اب نئی نسل کے علما و فضلا کو بھول جایئے، ڈراموں اور فلموں کے ہمارے ہیرو نئی نویلی شیروانیوں اور قمیصوں میں ملبوس ہو کر رمضان پروگرام بخوبی چلا سکتے ہیں۔ ان کے نت نئے فیشن...... اس پہ کیا خامہ فرسائی کی جائے!

درحقیقت یہ اس کمرشل ازم کے نمائندے ہیں جس نے رمضان المبارک کو بھی تجارت بنا ڈالا۔ ان کے قیمتی ملبوسات، شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹ اس تعلیم کے بالکل برعکس ہے جو ماہ رمضان ہمیں سکھاتا و پڑھاتا ہے۔

لیکن ہمارے معاشرے میں منافقت کا خاصا چلن ہو چکا، اسی لیے مزید دونا ہیں اب ہمارے مردہ احساسات کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ خصوصاً جب یہ منافقت بہت سے لوگوں کو پر لطف تفریح فراہم کرنے لگے۔

اب ماہ رمضان کے موقع پر نشر ہونے والے پروگراموں کے پروڈیوسر بھی سمجھ چکے کہ ناظرین کی توجہ کیونکر اپنی جانب مبذول کرائی جائے۔

پروگرام میں بہت سے مفت تحفے رکھیے، پس منظر میں مذہبی موسیقی چلایئے اور روتین علما بلایئے، لیجیے رمضان اسپیشل شو تیار ہو گیا۔ اس میں معلوماتی سوال بھی ڈال دیجیے تاکہ پروگرام میں کچھ خوش رنگی آسکے۔ اب گھر کا ہر فرد یہ پروگرام دیکھ کر ماہ کے مذہبی رومان میں بخوبی مست ہو جاتا ہے۔

یہ پروگرام بھٹکے مزاج اور ایسے گھٹیا واقعات سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر تحفے دینے سے کراہت سے آتی۔ خدا کا شکر ہے کہ بعض چینلوں نے اسلامی تعلیمات پر بھی پروگرام بھی پیش کیے۔ مگر انھیں مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ یہ بھی ہمارے شستہ و مہذب معاشرے کے زوال کی نشانی ہے۔

حاضرین کی طرف تحفے اچھالنا ان میں لالچ و طمع پیدا کرتا ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ پروگراموں میں ایسے مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے بلائے جائیں جو کسی مصیبت یا آفت میں مبتلا اور حقیقی معنوں میں ضرورت مند ہوں۔ انعام و تحفے دینے والی کمپنیاں پھر ان بے یار و مددگار لوگوں کا ہاتھ تھامیں، انھیں مالی امداد دیں لیکن اس طرح کہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہونے پائے۔ کیونکہ حکم ہے کہ نیچے والے ہاتھ کو پتا نہ چلے کہ اوپر والا ہاتھ کس کا ہے اور یوں ان کی عید خوشیوں بھری اور یادگار بنا دیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پروگرام میں پاکستان کی ایسی نامور شخصیات کو بلایا جائے جو سماجی بھلائی، تعلیمات، سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر اہم شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ کمپنیاں پھر انھیں تحائف دیتے ہوئے اچھی بھی لگیں گی۔

اگر سماجی بھلائی کو بے جا چرچا کیا جائے تو یہ عمل اسلامی تعلیمات سے دور ہو جاتا ہے اور خود نمائی کے زمرے میں آتا ہے۔ ہمارے دین میں مستحسن بات یہ ہے کہ چپ چاپ رو کر خوشی سے بھلائی و نیکی کے کام کیے جائیں۔

امید ہے کہ اگلے ماہ رمضان میں ایسے پروگرام دیکھنے کو نہیں ملیں گے جن میں اچھا خاصا پڑھا لکھا میزبان اور بزعم خود "مذہبی عالم" انتہائی بھونڈے انداز میں لوگوں کو آم کھلاتا نظر آتا ہے۔ یا پھر ایک آدمی نے حاضرین و ناظرین کے سامنے اپنا سر منڈا دیا تاکہ موبائل جیت سکے۔ تاریخ شاہد ہے کہ گزشتہ ادوار میں لوگوں کی تحقیر کے لیے ان کے سر مونڈ دیے جاتے تھے۔

اس قسم کے پروگرام ہماری مذہبی اقدار و روایات اور مہذب و شائستہ چلن سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ دیکھنے والوں میں لالچ و ہوس، بے غیرتی اور بے حیائی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔

مگر یہ پروگرام ترتیب دینے والے اور چینل ہی واحد مجرم نہیں... ہم یعنی عوام بھی برابر کے قصوروار ہیں۔ جب تک ایسے گھٹیا پروگراموں کے خلاف زوردار عوامی احتجاج نہیں ہوتا، وہ ہمارے معاشرے کے رہے سہے تار و پود بکھیرنے میں مصروف رہیں گے۔

◆◆◆

چھلکنے کی دیر ہے

میر انیس مرنے سے قبل ماہ محرم میں حیدرآباد دکن گئے تھے۔ لکھنؤ سے حیدرآباد تک گاڑی میں سفر کیا۔ دوران سفر انھیں دستوں کی بیماری نے گھیر لیا۔ حیدرآباد میں ایک ڈیڑھ ہفتہ رہے۔

بیماری میں علاج کے باوجود افاقہ نہ ہوا اور وہ واپس لکھنؤ آ گئے۔ مرنے سے تین چار روز قبل میرزا دبیر مزاج پرسی کے لیے آئے۔ اور آتے ہی کہا: "میاں انیس طبیعت تو بخیر ہے۔" میر انیس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "پیالی بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے۔"

(منتخب: نقی حسین نقی امروہوی، کراچی)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جب ایک ایماندار وزیر رشوت خور انسپکٹر سے ٹکرائے

سندھ کے ممتاز سیاست دان الحاج شمیم الدین کی آپ بیتی سے اچھوتا انتخاب

محمد عزیز

یہ تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے۔ الحاج شمیم الدین بحیثیت وزیر تحصیل نقل سے رکن سندھ اسمبلی سردار سرکی کی دعوت پر کسانوں کو مالکانہ حقوق کے سرٹیفکیٹ دینے جیکب آباد گئے۔ الحاج صاحب اس سفر کا احوال یوں بیان کرتے ہیں:

"ہم جیکب آباد کے مضافاتی علاقے کی جانب گامزن تھے۔ دورانِ سفر ایک بار مڑ کر دیکھا تو پچھلے موڑ پر پولیس موبائل رک چکی تھی۔ اپنی گاڑی کے ڈرائیور سے کہا کہ آہستہ ہو جاؤ، پولیس موبائل بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ سردار سرکی گاڑی میں میرے ساتھ تھے کہنے لگے "سائیں چلے چلو۔ اس سڑک پر اس موڑ سے آگے پولیس نہیں آئے گی۔ یہ پولیس اور دھاڑیل (ڈاکوؤں) کے گروہ کا معاہدہ ہے۔"

جب ہم اجتماع گاہ پہنچے تو کیا دیکھتا ہوں کہ چھے سات تنومند لمبے تڑنگے جوان بڑی بڑی پگڑیاں باندھے ہوئے جن کے گلوں میں رائفلیں لٹکی تھیں، کمر اور سینے پر گولیوں کی پیٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور اجرکیں کاندھوں پر دھری تھیں، چلتے ہوئے اگلی صف تک آ گئے۔ انھیں دیکھ کر سارے افسر اور معززین احتراماً کھڑے ہو گئے۔ منتظمین نے انھیں اگلی صف میں بٹھایا۔

میں نے سردار سرکی سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ وڈیرے یا سردار ہیں؟ سردار صاحب نے بتایا "یہی ڈاکو (دھاڑیل) ہیں۔ آپ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ملنے آئے ہیں۔" کھانے کے بعد وہ لوگ اسٹیج پر مجھ سے مصافحہ کرکے واپس اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ میں سوچتا رہ گیا کہ اس علاقے میں قانون نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں؟

مجرم ہمیشہ کیونکر حکومت اور وزیروں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں الحاج ایک معمولی اہلکار کے تبادلے کی روداد بیان کرتے ہیں۔ تب وہ وزیر محنت بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ مختلف اداروں اور تنظیموں کی طرف سے انھیں شکایت ملی کہ بعض لیبر انسپکٹر بلاوجہ اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہیں۔ چناں چہ انھیں تکلیف دہ صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس پر انھوں نے لیبر انسپکٹروں کا ایک اجلاس بلا کر انھیں سمجھایا کہ وہ درست طریقے سے کام کریں اور یہ جان لیں کہ جہاں سے بدبو اٹھے گی، وہیں نظر جائے گی اور گرفت بھی ہوگی۔

چند انسپکٹر گزشتہ پانچ برس سے ایک ہی علاقے میں کام کر رہے تھے۔ انھوں نے حکم دیا کہ انھیں کسی دوسرے علاقے میں بھیج دیا جائے۔ ان میں سے ایک انسپکٹر فضل نامی عہدے دار علاقہ سائٹ میں کافی عرصے سے تعینات تھا۔ (یہ کراچی کا سب سے بڑا صنعتی علاقہ ہے) جب انھوں نے اس کے تبادلے کا ذکر کیا تو سیکرٹری لیبر کا کہنا تھا "سر! آپ اسے نہ چھیڑیں۔ یہ پہاڑ ہیں۔ یہ اپنا تبادلہ رکوا لیں گے، آپ کی اور میری بات بھی خراب ہوگی۔"

الحاج صاحب کو لیبر سیکرٹری کی بات سن کر تعجب ہوا کہ ایک انسپکٹر اتنا طاقتور ہو سکتا ہے! اس سے پورا محکمہ خوف زدہ ہو جاتے۔ حتیٰ کہ محکمہ اس کا تبادلہ کرنے سے گریزاں ہے۔ الحاج صاحب نے سیکرٹری سے کہا "اس کو علاقہ ملیر میں بھجوا دیجیے۔ بعد میں جو کچھ ہوا، میں دیکھ لوں گا اور محکمے کے وقار پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔" لہٰذا فوری طور پر اس کا ٹرانسفر آرڈر جاری کر دیا گیا۔

انسپکٹر فضل کو جس دن پروانہ منتقلی ملا، وہ سیدھا الحاج صاحب کے دفتر آیا۔ ان کے سیکرٹری شاہ منصور عالم کے سامنے جیب سے کنگھا نکالا اور بالوں میں پھیرتے ہوئے کہا "جتنی دیر میں، میں بالوں میں کنگھا کرتا ہوں اتنی دیر میں میرا ٹرانسفر آرڈر کینسل ہو جائے گا۔" پھر نہایت رازداری سے کہا کہ وزیر صاحب کو کہیں، یہ حکم واپس لے لیں۔ میں انھیں ایک سال میں کروڑ پتی بنا دوں گا۔"

وہ یہ بھول گیا تھا کہ ہر ایک اس کی طرح پیسے کا میت نہیں اور اس کا واسطہ الحاج صاحب سے پڑا تھا جن کی ایمان داری کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ ایک بار الحاج صاحب کی دیانت داری کے متعلق سابق گورنر سندھ جنرل (ر) معین الدین حیدر نے کہا تھا "مجھے اس ملک میں دو ایمان دار افراد مل جائیں تو اس ملک کی کایا پلٹ دوں۔ ابھی تک ایک آدمی ملا ہے وہ ہیں الحاج شمیم الدین۔"

جب کروڑ پتی بنانے کی بات الحاج صاحب کے نوٹس میں لائی گئی تو انھوں نے اس انسپکٹر کو دفتر سے نکال دیا اور اسے متنبہ کیا کہ اگر وہ دوبارہ یہاں آیا تو نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ اس پر وہ بڑبڑاتا چلا گیا۔ بعد ازاں انسپکٹر نے ان کے علاقے کے ایک ایک مسلم لیگی

تحریکِ پاکستان کے ممتاز کارکن، الحاج شمیم الدین ۱۷ مارچ ۱۹۳۱ء کو بدایوں، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد والدین کی ہمراہی میں کراچی آئے۔ نوجوان ہوئے تو سیاست میں حصہ لینے لگے۔ صوبائی حکومت میں کئی بار وزیر رہے۔ پاکستان کو ترقی یافتہ بنانا آپ کا دیرینہ خواب تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

عام دستیاب اس مائع کی قدر کیجیے جس کے دم قدم سے ہی زمین پہ زندگی کا وجود ہے

پانی ہے سونا چاندی

یہ کوئی معمولی شے نہیں

ڈاکٹر جاوید اقبال

صبح کا وقت تھا۔ سہانی ہوا چل رہی تھی۔ حمید صاحب غسل خانے کے سامنے سے گزرے تو دیکھا کہ بڑا بیٹا ذیشان نلکا کھولے شیو کر رہا ہے۔ پانی شراشر ضائع ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ چیخ پڑے ”ارے ذیشان نلکا تو بند کر دو۔ بیٹا پانی بہت قیمتی شے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اسے یوں ضائع نہ کرو۔“

پانی انسانی زندگی کا نہایت اہم غذائی جزو ہے۔ ہمارا دوتہائی جسم پانی ہی پر مشتمل ہے۔ ایک عام انسان کے جسم میں ۳۵ سے ۵۰ لیٹر تک پانی ہوتا ہے۔ مردوں میں کل وزن کا ۶۵-۷۰ فیصد حصہ پانی ہے۔ جبکہ خواتین میں ۶۵ فیصد پانی ہوتا ہے۔ صرف دماغ کو ہی لیں تو اس کا ۸۵ فیصد حصہ پانی ہے۔ امراض سے لڑنے والے ہمارے خلیے خون میں سفر کرتے ہیں۔ خون بذات خود ۸۳ فیصد پانی ہی ہے۔ ہمارے ہر جسمانی خلیے میں موجود پانی ہی سے بدن کے تمام نظام چلتے ہیں۔ ان میں نظام ہضم کے علاوہ دوران خون اور فضلات کے اخراج کا نظام بھی شامل ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جسم انسانی میں اہمیت

پانی جسم انسانی کی بناوٹ اور اس کی مشینری کے اندر افعال انجام دینے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی یا کمی کی صورت میں انسانی جسم مختلف خرابیوں سے دوچار ہو جاتا ہے۔ پانی کے ذریعے انسانی جسم میں درج ذیل افعال بخوبی انجام پاتے ہیں:

۱۔ یہ غذا کو بڑی آنت کے ذریعے جذب کرنے میں مدد دیتا ہے۔

۲۔ خون کو مائع حالت میں رکھنے میں مددگار رہتا ہے۔

۳۔ پانی کی مناسب مقدار کے باعث جسم کا درجہ حرارت ہر موسم میں معمول پر رہتا ہے۔

۴۔ یہ لعاب دار جھلی کو ہمیشہ مرطوب رکھتا اور جسم کے غدودوں کو مختلف رطوبتیں خارج کرنے میں مدد دیتا ہے۔

۵۔ جسم سے فاضل مادوں کو پیشاب کے ذریعے خارج کرتا ہے۔

۶۔ پاخانے کے اخراج میں معاون رہتا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق گردے انسانی جسم سے روزانہ ۳۴ گیلن مائعات خون میں سے فلٹر کرتے ہیں۔ یہ اسی لیے ممکن ہوا کہ خون میں پانی کی مناسب مقدار موجود ہوتی ہے۔

پانی کے فوائد

پانی کے کئی فوائد ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

☆ اس کی تاثیر سرد ہے۔ یہ پیاس بجھاتا اور بے ہوشی، حرکات، ہچکی نیز قبض دور کرتا ہے۔

☆ پیشاب کی جلن اور یرقان کے عارضے میں مفید ہے۔

☆ جسم کے زہریلے مادے پیشاب اور پسینے کے راستے خارج کرتا ہے۔

☆ خوراک کے ہضم ہونے میں مددگار ہے۔ ہاضمے کے کئی مسائل سے بچاتا ہے۔

☆ خون گاڑھا یا خراب ہونے سے روکتا ہے۔

☆ بخار کی حالت میں پانی پلانے سے حدت دور ہوتی ہے۔

☆ جسم کی عمومی صحت کے لیے پانی کی مناسب مقدار ضروری ہے۔

کمی کے نقصانات

پانی کی کمی سے خون میں غذائی رطوبتیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس سبب خون گاڑھا ہو جاتا ہے۔ مزید برآں درج ذیل امراض بھی انسانی جسم پر حملہ آور ہو سکتے ہیں:

☆ معدے کے امراض مثلاً قبض و بواسیر۔

☆ چکر آنا۔

☆ سر میں درد اور بھاری پن محسوس ہونا۔

☆ تھکن اور کمزوری۔

☆ منہ کی خشکی اور بھوک کی کمی۔

اگر جسم میں پانی کی شدید کمی (ڈی ہائیڈریشن) ہو جائے تو درج ذیل کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں:

☆ نظر کی دھندلاہٹ۔

☆ سماعت کی کمی۔

☆ خشک اور گرم جلد۔

☆ نبض کی رفتار میں اضافہ اور سانس کا پھولنا۔

☆ چال میں لڑکھڑاہٹ۔

غلاظت بھرے پانی کے نقصانات

جراثیمی بیماریاں بالخصوص آنتوں کی سوزش، قبض اور بواسیر پھیلنے کا سب سے بڑا ذریعہ گندا پانی ہے۔ نلکوں کے پانی میں ایک تو پائپوں کے اندر جم جانے والی مٹی اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

غلاظت شامل ہوتی ہے۔ دوسرے اس میں بعض اوقات گٹر کا پانی مل جاتا ہے۔ اس لیے نلکوں کے پانی کو خطرے سے خالی نہیں سمجھنا چاہیے۔

آلودہ پانی انسانوں کا ایک بڑا قاتل ہے۔ ہر سال تیس لاکھ پاکستانی آلودہ پانی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بارہ لاکھ انسان اپنی زندگی سے ہاتھ بھی دھو بیٹھتے ہیں۔ ان میں دو لاکھ پچاس ہزار بچے شامل ہیں۔ ایک عالمی تجزیے کے مطابق صوبہ سندھ میں جو پانی عوام کو میسر ہے وہ انتہائی غیر معیاری ہے۔ اسی طرح تجزیے سے ثابت ہوا کہ کراچی میں پینے کے پانی میں انسانی فضلہ ملا ہوتا ہے۔ طبی ماہرین کے مطابق صاف پانی کی فراہمی سے اسہال اور دیگر جراثیمی بیماریوں کی شرح پچاس فیصد کم ہو سکتی ہے۔

دیہات میں ندی نالوں کنوؤں اور جوہڑوں کے پانی میں کسی نہ کسی طرح جانوروں کا فضلہ پیشاب اور دیگر غلاظت شامل ہو جاتی ہے۔ اس لیے ایسا پانی بھی جراثیم سے پاک نہیں ہوتا۔ اس گندے پانی سے [illegible] قسم کی کئی بیماریاں پھیلتی ہیں جن میں ٹائیفائیڈ بخار یا آنتوں کا بخار اور ہیضہ قابل ذکر ہیں۔ انتڑیوں کی سوزش بدہضمی گیس معدے کا السر اپھارہ اسہال اور جوڑوں کا درد جیسے امراض بھی گندا اور ناقص پانی پینے سے لاحق ہو سکتے ہیں۔ ان بیماریوں کی وجہ سے ہر سال لاکھوں جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ نیز یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شہروں میں ایک دم ہیضہ یا پیٹ درد یا قے کی شکایات سننے میں آتی ہیں۔ یہ پریشان کن صورت حال بھی گندے پانی کی وجہ سے جنم لیتی ہے۔

زندگی کا دارومدار پانی پر ہے۔ اس لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم تھوڑی سی تکلیف کر کے گھر میں استعمال ہونے والا پانی جراثیم سے پاک کر لیں۔ حکومتی ادارے تو بڑے پیمانے پر پلانٹ لگا کر کیمیائی مادوں کے ذریعے پانی صاف کرتے ہیں لیکن گھر میں پانی ابال کر پینا آسان طریقہ ہے۔

طریقہ یہ ہے کہ پہلے پانی کو کسی صاف کپڑے سے چھان لیجیے۔ پھر اسے آدھ گھنٹا ابالیے۔ اس کے بعد ٹھنڈا کر کے نوش جان کیجیے۔

شہروں میں گندا پانی جمع کرنے کے لیے زمین دوز ٹینکی بنائی جاتی ہے۔ ان ٹینکیوں کا پانی بھی آلودہ ہو سکتا ہے۔ اگر یہ پانی مجبوراً استعمال کرنا پڑے تو درج بالا طریقے سے ابال لیجیے۔

کولمبیا میں واقع یونیورسٹی آف ساؤتھ کیرولینا سے وابستہ ڈاکٹر مارک ڈیوس کا کہنا ہے "ہماری بیشتر تکالیف کا تعلق ناکافی غذا کی نسبت گندا پانی پینے سے ہے۔" یہ حقیقت ہے کہ ہمیں نوش کی جانے والی اشیا کے معیار کا ضرور خاص خیال رکھنا چاہیے۔ عموماً اس طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم اپنی پیاس اور طلب کے مطابق مناسب پانی نہیں پیتے۔ کہا جاتا ہے کہ پیاس کا احساس کم سے کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے ایک ماہر غذائیات کا کہنا ہے "لوگ اکثر و بیشتر پیاسے ہوتے ہیں مگر اسے بھوک سمجھتے ہیں۔" گویا لوگوں کی بڑی تعداد بھوک اور پیاس کے درمیان امتیاز کرنے سے قاصر ہے۔

پانی کے ذریعے حیران کن علاج

کھانا کھانے کے دوران بہت کم مقدار میں پانی پینا چاہیے مگر ایک دو گھنٹے بعد جی بھر کے پانی پیا جا سکتا ہے۔ صبح نہار منہ پانی پینا تمام امراض کا شافی علاج ہے۔ کھانے کے دوران معمولی مقدار اور کھانے کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد خاصی مقدار میں پانی پینا ہاضمے کی قوت بڑھاتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ یوں خدا کے طاقت بخش اجزا بخوبی جزوِ بدن بن کر صحت برقرار رکھتے ہیں۔

کھانا کھانے سے پہلے اور فوراً بعد پانی پینے سے قوتِ ہاضمہ کمزور اور طاقت کم ہو جاتی ہے اور جسم پھولنے لگتا ہے۔ البتہ کھانے کے دوران ایک دو گھونٹ پانی پینے سے کھانا جلد ہضم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں بھی اعتدال لازم ہے۔ گرمی کی وجہ سے بھوک نہ لگے تو کھانے سے ایک گھنٹا قبل ٹھنڈا پانی پینے سے وہ کھل جاتی ہے۔ جو افراد قبض کا شکار رہتے ہوں' کھانے کے دوران دو تین گھونٹ پانی پی لیں۔ عارضہ جاتا رہے گا۔ اس کے علاوہ صبح خالی پیٹ ایک گلاس پانی پینا قبض رفع کرتا ہے۔

پانی مزمن امراض سے بھی صحت یاب کرتا ہے۔ اسے ہم "علاج بالما" یعنی "پانی سے علاج" کہتے ہیں۔ یہ طریقہ علاج تقریباً ایک سو سال قبل اوٹی کوہنی (جرمنی) نے دریافت کیا اور اس کے ذریعے علاج کر کے شفا پائی۔ اس علاج کا بنیادی تصور یہ ہے کہ جسم انسانی میں فاسد مادے جمع ہونے سے بیماری آتی ہے۔ لہٰذا اگر فاسد مادوں کو خارج کر دیا جائے تو بیماری سے نجات مل جاتی ہے۔

علاج بالما کے ذریعے بے شمار امراض سے نجات پائی جا سکتی ہے۔ ہم یہاں صرف پیٹ کے امراض کا تذکرہ کریں گے۔

۱۔ تیزابیت۔
۲۔ ریح والی پیچش۔
۳۔ قبض۔
۴۔ بواسیر۔

طریقہ علاج

صبح بیدار ہوتے ہی مسواک یا برش کرنے سے قبل سوا کلو یا چار بڑے گلاس پانی یک وقت پیجیے۔ پانی پینے کے بعد مسواک یا برش کر لیجیے۔ اس تجربے کے دوران ناشتے کے دو گھنٹے بعد پانی پیا جائے۔ اسی طرح دوپہر اور رات کا کھانا کھاتے ہوئے بھی پانی دو گھنٹے بعد ہی پیجیے۔

جو افراد ناتوانی' بیماری یا صحت کی عمومی کمزور حالت میں ہوں اور ایک ہی وقت سوا کلو پانی یا چار بڑے گلاس پانی نہ پی سکیں' وہ ابتدا میں ایک یا دو گلاس نوش کریں۔ پھر آہستہ آہستہ اور مستقل مزاجی سے مقدار بڑھا کر چار بڑے گلاس پانی پینے پر آ جائیں۔ یہ طریقہ علاج مسلسل جاری رکھیں۔ یہ بیماروں کے علاوہ صحت مند لوگوں کے لیے بھی مفید ہے۔ بیمار تندرستی حاصل کرتے جبکہ صحت مند بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس طریقہ علاج سے نظام ہضم کے زیادہ تر امراض تین تا چھے ماہ کے اندر اندر ٹھیک ہو گئے۔ دیگر امراض کے شفایابی کا تناسب حسب ذیل ہے:

نام بیماری	کتنے عرصے میں شفایابی ہوئی
قبض	دس دن
فشارِ خون	ایک ماہ
معدہ میں گیس	دس ماہ
ذیابیطس	ایک ماہ
تپ دق	تین ماہ
سرطان	چھے ماہ

مریض کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے ایک ہفتے دن میں تین مرتبہ چار بڑے گلاس پانی پی لے۔ اس کے بعد دوسروں کی طرح ایک دفعہ چار بڑے گلاس پانی پی لے۔ اوائل میں معمول سے زیادہ پیشاب کی حاجت ہو گی پھر یہ خلل دور ہو جائے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیماریوں کا شافی علاج

رات کھانے کے بعد سوتے وقت دانت اچھی طرح صاف کر لیجیے۔ مسواک یا ٹوتھ پیسٹ کرنے کے بعد اچھی طرح کلی کریں۔ بعد میں پانی کی طلب ہو تو پی سکتے ہیں لیکن کچھ کھانا نہیں۔ اس کے بعد سو جائیے۔ صبح اٹھ کر بغیر تھوکے اور کلی کیے نیم گرم یا تازہ پانی کا ایک گلاس پی لیں۔ کم از کم پون گھنٹا یا بہتر ہے ایک گھنٹے تک کچھ نہ کھائیں پئیں۔

یہ عمل پہلے دن ایک گلاس سے شروع کریں۔ ہفتہ عشرہ کے اندر اسے بڑھاتے ہوئے چار گلاس تک لے جائیں۔ یاد رہے صبح اٹھ کر نہ کلی کرنی ہے اور نہ تھوکنا ہے۔ اس عمل سے ان شاء اللہ بیشتر بیماریاں سال چھ ماہ کے اندر اندر غائب ہو جائیں گی۔

پانی اور سنت نبوی ﷺ

پانی سنت کے مطابق پیا جائے تو ثواب ملے گا اور ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔ آپ کی ایک ایک سنت کامیابی کی دلیل ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ نے پانی پینے سے متعلق کن باتوں کی ہدایت فرمائی ہے۔

۱۔ پانی بیٹھ کر دائیں ہاتھ سے اور بسم اللہ پڑھ کر پیا جائے تو حاجت کے مطابق وہ جسم میں جاتا ہے۔ کھڑے ہو کر پانی پینے پر ضرورت سے زائد پانی جسم میں جاتا ہے جو استسقا کا باعث بنتا ہے۔ اسی لیے آپؐ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے ممانعت فرمائی ہے۔ اگر پانی کھڑے ہو کر پیا جائے تو معدہ اور جگر کی بیماریاں گھیر لیتی ہیں۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ اگر تمھیں پتا چل جائے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے کا کتنا نقصان ہے تو وہ پانی تم حلق میں انگلی ڈال کر باہر نکال دو۔

۲۔ حضور پاک ﷺ نے غٹاغٹ پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ پانی ٹھہر ٹھہر کر تین سانسوں میں پیجیے۔ اگر پانی تین سانس میں نہ پیا جائے تو درج ذیل امراض جنم لے سکتے ہیں:

☆ سانس کی نالی میں پانی جانے کا خدشہ ہے۔

☆ دماغ کے پردوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ پانی کی لہریں ان پردوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ ٹھہر ٹھہر کے پانی پینے سے دماغ پر مضر اثرات مرتب نہیں ہوتے۔

☆ معدے میں زیادہ پانی چلا جاتا ہے۔ یوں وہاں پھیلاؤ جنم لیتا ہے۔ اگر یہ پھیلاؤ اوپر کی طرف ہو تو دل اور پھیپھڑوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اگر یہ پھیلاؤ دائیں طرف ہو تو جگر کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ بائیں طرف ہونے سے تلی کو نقصان پہنچتا ہے۔ جبکہ نیچے کی طرف دباؤ ہونے سے آنتوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

۳۔ حضور پاک ﷺ ہمیشہ کھلے پیالے میں پانی نوش فرمایا کرتے۔ وجہ یہ ہے کہ تنگ برتن میں پینے سے دل کو فرحت حاصل نہیں ہوتی۔ اسی سلسلے میں مشہور ریاضی دان نیٹا غورث کا ایک مقولہ ہے: "پانی کھلے برتن میں ہو، چڑے کا اور آٹا جو کا۔ یہ تینوں چیزیں مجھے مل جائیں تو میں آسمان کا حساب لگا سکتا ہوں۔"

۴۔ پینے والے برتن میں سانس لینے سے آپؐ نے منع فرمایا ہے۔ یوں خطرہ ہوتا ہے کہ پانی سانس کی نالی میں چلا جائے۔ مزید براں پانی میں جراثیم بھی داخل ہو جاتے ہیں۔

۵۔ پانی ہمیشہ تازہ پینا چاہیے۔ حضور پاکؐ ہمیشہ شیریں (یعنی قدرتی میٹھا) پانی نوش فرمایا کرتے۔ ایک ماہر ارضیات کا کہنا ہے کہ جس علاقے میں کھجور کے درخت زیادہ ہوں وہاں کا پانی میٹھا ہوتا ہے۔ ◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جانے کن الفاظ میں محوِ گفتگو ہو گئیں، یہ آغاز تھا پیار کے رشتے کی استواری کا!

نام تو اس کا زرناز تھا مگر اپنے نام سے وابستہ خصوصیات کے برعکس وہ غربت کی انتہائی پست سطح پر زندگی بسر کر رہی تھی۔ دنیا میں کوئی بھی اس کا ایسا ہمدم نہ تھا جس پر وہ ناز کر سکتی۔ ڈھاوڑ کے قریب خانہ تنگی کی رہنے والی تھی جہاں سردیوں میں کھیتوں میں مزدوری کر کے گزر اوقات کیا کرتی۔ موسم گرما میں جھلسا دینے والی دھوپ کی شدت سے بچنے کی خاطر وہ ہر سال گاؤں والوں کے ساتھ کوئٹہ آ جاتی۔ انہی کے ساتھ شہر کے کسی خالی قطعہ زمین پر عارضی جھونپڑی ڈال کر رہا کرتی۔

زرناز جمعرات کے علاوہ ایک دو دن بعد آنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ باقاعدگی کے ساتھ روزانہ چکر لگانے لگی۔ ہم لوگوں کو بھی اس کا انتظار رہنے لگا۔ وہ بہت کم الفاظ میں بہت کچھ کہہ دیا کرتی۔ ہمارے بچوں کے لیے اس کے دل میں نانی دادی جیسی شفقت کا جذبہ موجزن رہتا۔ پہلے پہل تو گھر کے برآمدے میں فرش پر اپنی پوٹلی کا تکیہ بنائے دو ساعت میں لیٹا کرتی۔ بعد میں اہلیہ نے ایک کمرے میں مستقل ٹھکانا وقت گزاری کے لیے فراہم کر دیا۔

وہ صبح کا ناشتا، دوپہر کا کھانا کھانے اور سہ پہر چائے پینے کے بعد اپنی جھونپڑی میں لوٹ جایا کرتی۔ برسوں موسموں کی شدت کی ماری جب کمرے میں قالین پر لیٹے کشن کا سرہانا لیے، تکیے کے نیچے جلد گہری نیند کی آغوش میں پہنچ جاتی اور خراٹے لینے لگتی تو ہم اس کی آسودگی کی کیفیت سے بہت محظوظ ہوتے۔ وہ رضاکارانہ طور پر اہلیہ کے سر کی مالش کرتی اور پاؤں وغیرہ دبا دیتی۔ بدلے میں اہلیہ اسے اتنے پیسے دے دیتی کہ اسے در در بھیک مانگنے کی حاجت نہ رہتی۔ یوں اس کا احساس گداگری جاتا رہا اور وہ ہمارے کنبے کا ایک فرد ہی بن گئی۔

زرناز کے نحیف بدن سے محبت اور خلوص کی خوشبو آیا کرتی۔ گو اس کا دھوپ جلا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ برسوں کی مشقت اور محنت کے باعث ہاتھوں کی رگیں پھول گئی تھیں۔ لیکن پیوند لگے، مرجھائے رنگوں کے لباس فاخرہ میں بھی زرناز تمکین اخلاص اور شفقت کا مرمریں حسین پیکر لگتی۔

سردیوں کے آغاز پر اسے ڈھاوڑ مراجعت کرنا تھی۔ الوداعی ملاقات پر وہ بہت آزردہ ہوئی۔ رخصت ہوتے وقت اس نے سر سے چادر سرکائی، آسمان کی طرف نگاہ کیے اپنے دونوں ہاتھ دعا کی صورت اٹھائے اور جانے اپنی زبان میں ہمارے لیے کیا کیا کچھ مانگا۔ ہمیں سمجھ نہ آیا مگر جس سے وہ ملتجی تھی، وہ اس کی زبان بخوبی سمجھ گیا ہوگا کہ وہ دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔

المیہ

ایک شخص نے اپنے دوست سے پوچھا: ”اتنے اداس کیوں نظر آ رہے ہو؟“

”پانچ سال قبل میں نے اپنی بیوہ اور بے اولاد خالہ کو پاگل قرار دلوا کر ایک پاگل خانے میں داخل کرا دیا تھا اور ان کی دولت و جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ اب ان کا انتقال ہو گیا ہے اور مرتے وقت وہ ساری دولت و جائیداد میرے نام کر گئی ہیں۔“ اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔

”اب مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ مرتے وقت وہ ذہنی طور پر بالکل ٹھیک تھیں۔ کیونکہ پاگل کی وصیت پر اس کی دولت و جائیداد اولاد کے سوا کسی کو نہیں مل سکتی۔“ دوست نے اداسی سے بتایا۔ (از ظفر وقاص، اسلام آباد)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بہار کی آمد کے ساتھ ہمیں زرناز کا بھی انتظار رہنے لگا۔ وہ بھی بہار بن کر آتی اور خوشیوں کے پھول کھلاتی، خلوص کی خوشبو بکھیرتی۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وہ آ گئی۔ ہمارے بچے کھلکھلا اٹھے۔ ایک دم گھر میں خوشی اور رونق کی لہر دوڑ گئی، جیسے کوئی لڑکی سسرال سے اپنے میکے آئی ہو۔

وہ اپنے ساتھ گٹھڑی میں کچھ سبزیاں تحفتاً لائی۔ سبز دھنیا، ٹماٹر، بھنڈی، آلو گوبھی وغیرہ۔ یہ سب چیزیں تو بازار سے بھی با آسانی مل جاتی ہیں مگر جس پیار اور خلوص سے وہ یہ تحفے لائی تھی، وہ تو بازار میں کسی مول نہیں مل سکتا۔ اس نے دیگر تحفوں کے بعد آخر میں سب سے قیمتی تحفہ نکالا جو پلاسٹک کے لفافے میں بند تھا۔ یہ قیمتی خوبصورت تحفہ رنگین دھاگوں سے کڑھا ہوا، چھوٹے چھوٹے شیشوں سے مزین، جھلملاتا ہوا تکیے کا غلاف میری بیٹیا کے لیے تھا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔

میں نے زرناز کے ناتواں، ابھری رگوں والے ہاتھوں اور اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں پر نظر ڈالی پھر بلوچی کشیدہ کاری کے اس شاہکار کو دیکھا۔ اس نے بہت محنت و لگن سے باریک سوزن کاری سے دھاگوں کے ابھرے نقش و نگار کی حسین تخلیق کی تھی۔ میں نے ان بھدی انگلیوں کا جائزہ لیا جن میں نجانے کتنی مرتبہ اس تخلیقی عمل کے دوران سوئیاں چبھی ہوں گی۔ اب تو چبھن کی تکلیف کے وقت اس کے منہ سے سی بھی نہیں نکلتی ہوگی کہ انگلیاں ایسے گھاؤ برداشت کرنے کی بچپن ہی سے عادی ہو گئی تھیں۔

میں جذباتی ہو گیا اور فرطِ احترام و عقیدت سے زرناز کے مرمریں محنت کش ہاتھوں کو چوم لیا۔ وہ حیرت زدہ بوکھلاہٹ سے مسکراتی ہوئی تشکرانہ انداز میں مجھے تکنے لگی..... شاید زندگی میں پہلی بار کسی نے اس کی تخلیق کو ایسے احترام سے پذیرائی دی تھی۔

زرناز کی آمد کا سلسلہ ہر سال معمول بن گیا۔ وہ ہماری بہت سی محبت سمیٹ کر جاتی اور واپسی پر ہمارے لیے اپنی کوئی نہ کوئی حسین تخلیق لے کر لوٹتی۔ اس بار وہ آئی تو اپنے ساتھ گراں ترین تحفہ..... ایک "رلی" لائی جو نجانے کس طرح محنت مزدوری سے فارغ ہو کر، راتوں کو چراغ کی مدھم روشنی میں تیار ہوئی تھی۔ اس کے ایک ایک ٹانکے میں ہم لوگوں کے لیے پیار اور خلوص پرو دیا گیا تھا۔

رلی کپڑے کی ایک چادر ہے جیسے کھیس! اسے آپ اوڑھ سکتے اور بچھا بھی لیتے ہیں۔ یہ کپڑے کے رنگین اور پھولدار چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو سوزن کاری کے ذریعے باہم جوڑ کر کمال مہارت سے علم جیومیٹری کے اصول و قواعد کے مطابق مثلثوں، چوکوروں، مستطیلوں یا مماثل اشکال کی صورت دینے کے بعد دیدہ زیب ڈیزائنوں میں ڈھالی جاتی ہے۔

یہ ایک ماہر ریاضی دان یا ماہر اشکال ہی کا کام ہے۔ یہ ان پڑھ بلوچ خواتین کیونکر اس ہنر اور علم کی حامل ہوتی ہیں؟ یہ کاریگری، دستکاری، یہ محنت مشقت یقیناً ان کی جبلت میں شامل ہے۔ یہ تو اس مہر گڑھ تہذیب کا تسلسل ہے جو ہزاروں برس پر محیط ہے۔

ہم نقل مکانی کر کے اسلام آباد آ گئے لیکن ہمارا دل، ہماری زرناز کوئٹہ ہی میں رہ گئی۔ مگر خلوص و محبت کی رلی آج بھی ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ سنا ہے وہ سادہ دل، پیکر وفا خاتون ہمارے آنے کے بعد گھر کے در و دیوار سے لپٹ لپٹ کر روتی رہی۔ پیار کا بے لوث رشتہ بھی عجیب ہے۔ وہ زبان، قومیت اور وطنیت کے بندھنوں سے آزاد ہوتا ہے۔

◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کالا بلا

توہم پرستی میں گرفتار

ایک امیر خاتون کی سبق آموز کہانی

بشیر احمد بھٹی

سیٹھ نے جونہی اپنی کار بنگلے سے نکالی، عجیب ماجرا پیش آیا۔ کم از کم یہ دوسروں کے لیے انوکھا ہی تھا۔ بیگم کے کہنے پر سیٹھ نے کار روک لی۔ انھوں نے حکم نامہ جاری کیا ''آج کا یہ سفر ملتوی۔ اگر ہم نے سفر کیا تو کوئی بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔''

سیٹھ صادق چنے والا اینڈ گنے والا اپنی بیگم کا ہر حکم [illegible] کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ انھوں نے جو کہہ دیا، وہ سیٹھ صاحب سمیت ملازموں کے لیے گویا پتھر پر لکیر کے مترادف ہوتا۔

سیٹھ صادق کے والد ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ ابتدائی ایام کسمپرسی میں گزرے۔ پھر وہ چنے کا کاروبار کرنے لگے۔ سولہ سولہ گھنٹے روزانہ کی محنت رنگ لائی۔ مثل ہے کہ جس کا ہاتھ اللہ میاں پکڑ لے وہ ترقی کرتا ہے۔ لہٰذا سیٹھ کے والد نے خوب پیسا کمایا۔ چند برسوں میں وہ لاکھوں میں کھیلنے لگے۔ ان کی آنکھیں بند ہوئیں تو تمام کاروبار، بینک بیلنس اکلوتے بیٹے صادق کے نام ہو گیا۔ سیٹھ صادق چنے کے ساتھ گنے کا کاروبار بھی کرنے لگے۔ چناں چہ وہ سیٹھ صادق چنے اینڈ گنے والا کے نام سے مشہور ہوئے۔

ان کی بیگم بڑی ضعیف الاعتقاد تھی۔ مثل مشہور ہے کہ وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ سیٹھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

صادق اپنی بیوی کی اس بیماری سے تنگ تھے۔ نت نئے مفروضے قائم کرنا اور وہم میں مبتلا ہونا بیگم کی عادت تھی۔ کوئی نہ کوئی من گھڑت شوشہ چھوڑنا فطرت ثانیہ بن گیا تھا۔

صادق بظاہر تو سیٹھ تھے لیکن بیگم کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی۔ بیگم کے سامنے ہمیشہ مؤدب رہتے۔ بیگم کا نت نیا طوفان کھڑا کر دیتا۔ نوکروں کو بھی قرار نہیں تھا اکثر ملازم کچھ عرصے بعد بھاگ جاتے۔ پھر نئے ملازم ڈھونڈنا بھی سیٹھ صادق کی ذمے داری تھی۔ اب جو واقعہ پیش آیا وہ بظاہر معمولی سا تھا۔

ہوا یوں کہ جونہی سیٹھ کی کار بنگلے سے نکل کر سڑک پر سیدھی آئی ایک سیاہ رنگ بلا آگے سے گزر گیا۔ اس بات نے بیگم کو وہم میں مبتلا کر دیا۔ ان کا موقف تھا کہ کالے بلے کا راستہ کاٹنا اچھا شگون نہیں ہوتا لہٰذا آج کا سفر ملتوی۔ حالانکہ سیٹھ نے کچھ ضروری کام بھی نمٹانے تھے لیکن بیگم صاحبہ کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔

کار دوبارہ بنگلے میں چلی آئی۔ بیگم صاحبہ بڑبڑا رہی تھیں "لوگ بھی کیسے جاہل ہیں۔ آخر کالے بلے پالنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو ویسے بھی منحوس ہوتا ہے۔ بلدیہ والوں کو چاہیے وہ کتوں کی طرح ان کالے بلوں کو بھی زہر دے کر تلف کر دیں۔ موئے نگوڑے حادثات کا سبب بنتے ہیں۔"

خیر بات آئی گئی ہوئی۔ سیٹھ صادق نے کار گیراج میں کھڑی کر دی۔ اس پوش کالونی کے مشرقی حصے میں کچی کالونی تھی یعنی غریبوں کی بستی! وہاں گندگی کے ڈھیر بکثرت تھے جن پہ ہر وقت مکھیاں بھنبھناتی رہتیں اور اسی باعث آبادی کا نام مکھی کالونی رکھ دیا گیا۔

سیٹھ صادق کا ایک پرانا ملازم وہاں رہتا تھا۔ اس کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ سیٹھ کے پاس آیا اور شادی میں شرکت کی دعوت دی۔ ملازم کا اصرار تھا کہ وہ بیگم صاحبہ کو بھی ساتھ لائیں تاکہ اس کی عزت افزائی ہو سکے۔ سیٹھ صادق نے ملازم سے وعدہ کر لیا کہ وہ ضرور آئیں گے۔ شادی کے دن سہ پہر چار بجے سیٹھ اور اس کی بیگم مکھی کالونی پہنچ گئے۔

ملازم کا نام شوکت علی تھا۔ وہ بڑے تپاک سے پیش آیا۔ سیٹھ صادق تو مردوں کے ساتھ بیٹھ گئے بیگم مکان کے اندر چلی گئیں جہاں عورتیں موجود تھیں۔ غریبوں کی بستی تھی۔ سیٹھ چاہتے تھے جلد شادی کی رسومات ادا ہو جائیں کیونکہ انھیں کچھ ضروری کام نمٹانے تھے۔ شوکت علی ان کی خدمت میں پیش پیش تھا۔ وہ غریب خوش تھا کہ سیٹھ نے بیٹی کی شادی میں شرکت کر کے اس کا مان بڑھایا ہے۔ یہ اس کے لیے بڑے فخر کی بات تھی۔

شادی کی رسومات ادا ہو گئیں۔ بارات دلہن کو لے چلی گئی۔ سیٹھ صاحب کی بیگم زنان خانے سے برآمد ہوئی۔ سیٹھ صادق نے شوکت علی سے اجازت لی۔ دونوں میاں بیوی کار میں بیٹھے اور گھر کو روانہ ہوئے۔ ابھی کار کچھ دور ہی گئی تھی کہ اچانک ایک سیاہ بلا سامنے سے گزر گیا۔

سیٹھ صاحب نے ایک دم بریک لگا کر کار روکی اور بیگم کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ ابھی حکم ہو گا شادی والے گھر واپس چلیے کالے بلے نے راستہ کاٹا ہے، آگے بڑھنے سے نقصان ہو سکتا ہے۔ مگر بیگم صاحبہ بولیں "رک کیوں گئے چلیے نا۔"

سیٹھ صاحب بولے "کالا بلا راستہ کاٹ گیا ہے۔ اب کیا خیال ہے؟"

بیگم بولی "کچھ نہیں ہوتا، یہ صرف ضعیف الاعتقادی کے بادل تھے جو ایک نظارہ دیکھ کر میرے ذہن سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

چپت گئے۔"

یہ سن کر سیٹھ دنگ رہ گئے اور سوچنے لگے "بیگم نے ایسا کون سا منظر دیکھ لیا ہے جس نے ان کی کایا پلٹ دی؟"

پوچھا "بیگم! آپ بتانا پسند کریں گی کہ کس نظارے نے آپ کو ضعیف الاعتقادی کی دلدل سے نکالا؟"

وہ مسکرا کر بولیں "میں نے شادی والے گھر میں دیکھا کہ ایک کالا بلا جو ان کا پالتو تھا صحن میں پھر رہا ہے۔ اس نے کئی بار آنے جانے والوں کا راستہ کاٹا مگر کسی نے پروا نہیں کی۔ سب اپنی باتوں اور کاموں میں مگن رہے۔ رخصتی کا وقت آیا تو دولہا دلہن کا راستہ بھی کاٹ گیا مگر کسی نے اس کی جانب دھیان نہیں دیا۔ دلہن کے والد نے یہ کہا کہ کالا بلا راستہ کاٹ گیا ہے وہ سفر ملتوی کرتا ہے۔

بارات چلی گئی تو میں سوچنے لگی، یہ غریب لوگ کتنے مضبوط عقیدے کے مالک ہیں۔ ضعیف الاعتقادی انھیں چھو کر بھی نہیں گزری۔ چناں چہ فیصلہ کر لیا کہ میں بھی آئندہ فضول توہمات سے دور رہوں گی۔ یہ سب میں نے کچی کالونی کے ان غریبوں سے سیکھا ہے۔"

سیٹھ صادق بیگم صاحبہ کی بات سن کر مسکرائے اور کار آگے بڑھا دی۔

◆◆◆

امام مالکؒ

☆ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دو اور اس کی نافرمانی سے روکو۔

☆ مسجد میں منافقوں کی حالت وہی ہوتی ہے جیسی چڑیوں کی پنجروں میں کہ دروازہ کھلتے ہی اڑ جاتی ہیں۔

☆ زیادہ مت ہنسو، زیادہ ہنسنا بیوقوفی کی علامت ہے۔

☆ بے وجہ مزاح نہ کرو، اس سے ذلیل ہو جاؤ گے۔

☆ جس بات سے تم دوسروں کو روک رہے ہو اسے خود بھی نہ کرو۔

☆ لوگوں کے پاس اپنی ضرورتیں بہت کم لے کر جاؤ کیوں کہ اس میں ذلت و رسوائی ہے۔

☆ اپنے گھر والوں اور ان لوگوں سے، جو تمھاری عزت کرتے ہیں، خوش خلقی سے پیش آؤ۔

☆ پست خیال، آوارہ مزاج اور فحش گو لوگوں سے دور رہو۔

☆ ظالم کا ہاتھ پکڑو اور اسے ظلم سے روکو۔

☆ جو شخص اس لیے مظلوم کے ساتھ چلتا ہے کہ اسے اس کا حق دلوائے، اسے اللہ تعالیٰ اس دن ثابت قدم رکھے گا جس دن لوگ پھسلیں گے۔

☆ صرف رضائے الٰہی کے لیے نیک اعمال کی لگن رکھو، جب رضائے الٰہی کے لیے کوئی کام کرو تو اسے بہتر انداز میں کرو۔

☆ ناپسندیدہ باتوں سے چشم پوشی کرو اور بردباری سے کام لو۔

(انتخاب: شاہد جلال، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

آپ کا دنیائے نیٹ میں ساتھی

انٹرنیٹ ڈاؤن لوڈ مینیجر

اس کارآمد دوست سے ہمیشہ مفت خدمات حاصل کرنے کے لیے ہمارا مفید گُر آزمائیے

بشارت علی چوہدری

انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈنگ کے لیے یوں تو بے شمار سافٹ ویئر دستیاب ہیں لیکن ہماری نظر میں ان کا بے تاج بادشاہ ہے:

"Internet Download Manager"

جسے زیادہ تر لوگ مختصراً "آئی ڈی ایم" کہتے ہیں۔ "آئی ڈی ایم" جدید ترین ٹیکنالوجی استعمال کر کے انتہائی تیز رفتاری سے ہر شے ڈاؤن لوڈ کرتا ہے۔ اس کا تازہ ترین ورژن اس کی ویب سائٹ

www.internetdownloadmanager.com

سے مفت ڈاؤن لوڈ کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک ٹرائل ورژن اور تیس دن کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔ پھر یہ

مزید ڈاؤن لوڈنگ سے انکار کر دیتا ہے۔

اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ سافٹ ویئر مفت استعمال کرنے کی میعاد اب ختم ہو چکی۔ آپ اسے مزید استعمال کرنا چاہتے ہیں تو آن لائن قیمت ادا کر کے سیریل نمبر (Serial Number) خریدیے۔ چونکہ آپ کو مفت استعمال کی عادت پڑ چکی ہوتی ہے، لہٰذا پیغام دیکھتے ہی ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے یوں تو کئی غیر قانونی طریقے انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ بہت سی ویب سائٹ سے آئی ڈی ایم کا سیریل نمبر مل جاتا ہے۔ یا چند کلو بائٹ کی ایک پیچ فائل کے ذریعے سافٹ ویئر کو پیچ (Patch) کر دیا جاتا ہے۔ یوں وہ دوبارہ قابل استعمال ہو جاتا ہے۔

لیکن مذکورہ طریقے غیر قانونی ہیں اس لیے ہم انھیں بیان نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر آئی ڈی ایم کو عام طریقے سے ان انسٹال (Uninstall) کر کے دوبارہ انسٹال (Reinstall) کریں، تو پھر بھی مسئلہ جوں کا توں رہے گا کیونکہ پروگرام دوبارہ رجسٹری میں ایک خاص قسم کی انٹریز شامل کر دیتا ہے جو انسٹال کرنے پر بھی ختم نہیں ہوتیں۔ ان انٹریز کی وجہ سے ہی "آئی ڈی ایم" دوبارہ انسٹال کرنے کے باوجود کام نہیں کرتا۔ معقول طریقے سے رجسٹری ایڈیٹر میں جا کر ان انٹریز کو تلاش کرنا اور ڈیلیٹ کرنا بہت مشکل ہے۔ اگر دوسری رجسٹری انٹریز میں غلطی سے تبدیلی ہوئی یا ڈیلیٹ ہو گئیں تو آپ پوری ونڈوز سے بھی ہاتھ دھو سکتے ہیں۔

انٹرنیٹ پر خاصی مغز ماری کے بعد ہم نے ایسا زبردست سافٹ ویئر تلاش کیا ہے جس کی مدد سے آپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"آئی ڈی ایم" رجسٹری انٹریز سمیت مکمل طور پہ ان انسٹال کر سکتے ہیں۔ یوں لگے گا، جیسے آپ کے کمپیوٹر میں کبھی "آئی ڈی ایم" انسٹال ہی نہیں ہوا۔ یوں آپ "آئی ڈی ایم" کا نیا یا پرانا ورژن دوبارہ انسٹال کر کے ایک بار پھر تیس دن مفت ڈاؤن لوڈنگ کے مزے لے سکتے ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کام شاید مشکل ہو۔ جی نہیں! کمپیوٹر کی ہلکی پھلکی سمجھ رکھنے والا شخص بھی اسے آزما کر مصیبت سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔

اس مقصد کے لیے جو سافٹ ویئر ہم استعمال کریں گے۔ اس کا نام ہے Revo Unistaller۔ سب سے پہلے مندرجہ ذیل لنک سے اسے ڈاؤن لوڈ کر کے انسٹال کیجیے:

www.revounistaller.com

ڈیسک ٹاپ پہ اس کا آئیکون بن جائے گا۔ اسے ڈبل کلک کر کے چلائیے۔ چونکہ یہ سافٹ ویئر بھی آپ مفت استعمال کرنا چاہیں گے۔ لہٰذا ٹرائل پیریڈ منتخب کر لیجیے۔

قارئین! اب آپ کے سامنے جو ونڈو نمودار ہوگی، اس میں ان تمام سافٹ ویئرز کی فہرست موجود ہے جو آپ کے سسٹم میں انسٹال ہیں۔ اس میں آپ "آئی ڈی ایم" کا سبز آئیکون منتخب کر کے Unistall کے سرخ بٹن پہ کلک کر دیجیے۔

چند لمحوں بعد "آئی ڈی ایم" کا ان انسٹالیشن ونڈو اوپن ہو جائے گا۔ اس میں Full منتخب کر کے "آئی ڈی ایم" کو ان انسٹال کر دیجیے۔ آخر میں ری اسٹارٹ کی آپشن آئے گی اسے Cancel کر دیجیے۔

اب ایک نئی ونڈو ظاہر ہو گی۔ اس میں Advance منتخب کر کے Scan پہ کلک کیجیے۔ آپ کی سسٹم رجسٹری میں "آئی ڈی ایم" کی جو بھی انٹریز ہوں گی، سافٹ ویئر انہیں تلاش کر کے سکرین پہ ظاہر کر دے گا۔ یہاں آپ Select All کے بٹن پہ کلک کیجیے اور ساتھ ہی موجود Delete پہ کلک کر دیجیے۔ آخر میں Finish پہ کلک کر کے عمل مکمل کیجیے۔

لیجیے قارئین کام ختم ہوا۔ "آئی ڈی ایم" اپنی تمام فائلوں سمیت آپ کے کمپیوٹر سے ایسے غائب ہو چکا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ بس اب سسٹم ری اسٹارٹ کر کے "آئی ڈی ایم" کا نیا یا پرانا ورژن انسٹال کیجیے اور مفت ڈاؤن لوڈنگ کا لطف اٹھائیے۔

چلتے چلتے "آئی ڈی ایم" کے کچھ ذیلی مسائل کا بھی ذکر ہو جائے۔ اکثر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ یوٹیوب یا فیس بک وغیرہ جیسی ویب سائٹ پہ وڈیو دیکھتے ہوئے "آئی ڈی ایم" کی وڈیو ڈاؤن لوڈ آپشن ظاہر نہیں ہوتی۔ اس مسئلے کی مندرجہ ذیل وجوہ ہو سکتی ہیں:

۱۔ "آئی ڈی ایم" کا ورژن کافی پرانا ہوگا۔

۲۔ ویب براؤزر میں "آئی ڈی ایم" کی ایکسٹینشن نہیں ہوتی۔

مسائل کا حل یہ ہے کہ آپ سب سے پہلے www.filehippo.com سے گوگل کروم کا تازہ ورژن ڈاؤن لوڈ کر کے انسٹال کیجیے۔ اس کے بعد آپ "آئی ڈی ایم" کی ویب سائٹ سے تازہ ترین ورژن ڈاؤن لوڈ کر کے انسٹال کیجیے اور براؤزر میں "آئی ڈی ایم" کی ایکسٹینشن کو ان ایبل کر دیجیے۔ اب آپ نے براؤزر میں جب بھی آن لائن وڈیو دیکھی تو "آئی ڈی ایم" کی ڈاؤن لوڈ بار بھی ضرور ظاہر ہوگی۔ اس پہ کلک کر کے آپ اپنی پسندیدہ وڈیو ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔

◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بائیکاٹ کر دیا۔

امریکیوں کو ان دنوں ایک کیمیائی مادے ”کاربالک ایسڈ“ کی اشد ضرورت تھی کہ یہ جراثیم کش ادویہ میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ کیمیائی مادہ خاص قسم کے کوئلے سے تیار ہوتا تھا جو صرف جرمنی میں پایا جاتا تھا۔ جنگ چھڑنے کے بعد جرمنی نے اسے امریکا بھجوانے پہ پابندی لگا دی۔ چنانچہ امریکا میں زخمیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔

جنگ کے شعلے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ لاکھوں کروڑوں لوگ میدان جنگ میں پڑے تڑپ رہے تھے۔ امریکا میں کاربالک ایسڈ میں کمی کی بدولت زخمیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کا کوئی نعم البدل بھی موجود نہیں تھا۔ امریکا کی افتی قیادت جمع ہوئی۔ اس نے امریکا بھر کے سائنسدانوں کو جمع کر لیا۔ پھر ایڈیسن کو ان کا صدر بنا کر متبادل طریقے سے کاربالک ایسڈ تیار کرنے کی ذمے داری سونپی۔

دنیا کے سب سے بڑے موجد ایڈیسن کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ ہنگامی صورت حال میں اس نے ملک و قوم کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا۔ اگلے ہی روز سائنسدانوں کی میٹنگ بلائی اور ان کے سامنے یہ مدعا رکھا ”اگر ہم کوئلے سے کاربالک ایسڈ تیار نہیں کر سکتے تو ہمیں کسی اور چیز پہ غور کرنا چاہیے۔“

ایک سائنسدان بولا ”مگر کیسے سر؟ ہم ایسی کیمیائی چیزوں سے یہ کام لے سکتے ہیں جن میں کوئلے کی خاصیت پائی جائے۔“

پورے ہال میں شور بلند ہوا ”یہ ناممکن ہے سر!“

لیکن ایڈیسن نے بڑے ٹھنڈے دماغ سے سوچ کر کہا ”جب تک ہم پوری طرح کوشش نہ کر لیں ہم کسی چیز کی نفی نہیں کر سکتے۔“

ایک دفعہ پھر ایڈیسن کے سامنے بہت بڑا چیلنج آ کھڑا ہوا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور کام میں جت گیا۔ کاربالک ایسڈ کی کمی سے لاکھوں امریکیوں کی جانیں خطرے میں تھیں اور ایڈیسن یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہنگامی طور پہ ایک تجربہ گاہ بنائی۔ سائنسدانوں کو گروہوں میں تقسیم کیا اور چوبیس گھنٹے کام شروع کر دیا۔ کچھ دن بعد ایڈیسن نے تجربہ گاہ کے ایک سینئر سائنسدان سے پوچھا ”کاربالک ایسڈ کی تیاری میں کتنا وقت لگے گا؟“

وہ بولا ”سر ابھی تو ہمیں یہی علم نہیں کہ یہ کام ہوگا کیسے!“

ایڈیسن نے اسے تسلی دی ”نوجوان گھبراؤ مت! ابھی تمھیں سب بتاؤں گا کہ یہ کام کیسے ہوگا۔“

”تو پھر سر ہم یہ کام نو ماہ میں مکمل کر لیں گے۔“

سینئر سائنسدان کا یہ جواب سن کر ایڈیسن بولا ”ہرگز نہیں، ہمارے زخمی نو ماہ تک میدان جنگ میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت کاربالک ایسڈ کی اشد ضرورت ہے۔“

”لیکن سر یہ سب کیسے ہوگا؟“

”میں یہ کام خود کروں گا۔“

ایڈیسن کو ناکامی کے لفظ سے شدید نفرت تھی۔ پھر وہ ہر صورت اپنے ملک اور قوم کو بچانا چاہتا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح کام پہ جت گیا۔ پھر دنیا نے دیکھا، ایڈیسن کی محنت اور اس کا عزم و استقلال رنگ لایا۔ نو ماہ نہیں بلکہ صرف سترہ دنوں میں اس نے کاربالک ایسڈ تیار کر کے امریکی صدر کو پیش کر دیا۔

اٹھارویں دن تجربہ گاہ میں سات سو پونڈ کاربالک ایسڈ تیار ہوا اور صرف ایک مہینے بعد ایک ٹن روزانہ کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

لحاظ سے مال تیار ہونے لگا۔ جیسے ہی ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو ان اتحادیوں کے درمیان صلح کا معاہدہ ہوا، ایڈیسن نے سائنسدانوں کی تنظیم کی صدارت سے استعفیٰ دیا، فوجی خدمات سے سبکدوش ہوا اور واپس اپنی پرانی تجربہ گاہ میں ڈیرے ڈال دیے۔

ہم گزشتہ کئی برس سے لوڈشیڈنگ کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ پاکستان کے بیس کروڑ عوام اس وقت حالت جنگ میں ہیں۔ مگر اس دوران پاکستان میں ایک بھی ایسا حکمران سامنے نہیں آسکا جو دس ہزار پاکستانی سائنسدانوں میں سے کسی "ایڈیسن" کو تلاش کر کے اسے لوڈشیڈنگ کے خاتمے کی ذمے داری سونپ سکے۔

لوڈشیڈنگ پاکستان کے حال اور ماضی کا سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔ ہماری بدقسمتی دیکھیے، ہم مسئلہ لوڈشیڈنگ حل کرنے کے بجائے جمہوریت کی رکھوالی کرتے رہے۔ عوام گرمی میں تڑپے اور حکمران حکومت کی مدت پوری کرنے کے غم میں مبتلا رہے۔ آج ایک بار پھر ملک بھر میں لوڈشیڈنگ کی سیاہ ڈائن اپنے کالے بال کھولے کھڑی ہے۔ دیہات میں بائیس اور شہروں میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے لوڈشیڈنگ ہوتی ہے، صنعتیں بند ہو چکیں اور انڈسٹری تباہ ہو رہی ہے۔ مزدور فاقوں پر مجبور ہیں، دیہاڑی دار مزدوروں کے چولہے بجھ گئے۔ سیالکوٹ، فیصل آباد کے بہت سے کارخانے اور ملیں بند ہو چکی ہیں۔

کاش پاکستان کے حصے میں بھی کوئی ایڈیسن آ جاتا جو ستر برس کا کام ستر دنوں میں انجام دے کر مزدوروں کی تین سو روپے دیہاڑی ضائع ہونے سے بچا لیتا... وہ تین سو روپے جن سے شام کو گھر جاتے وقت وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے روٹی اور بوڑھے والدین کے واسطے دودھ خرید کر لے جاتے ہیں۔

◆◆◆

ترجیح

عارف صاحب کی ملاقات ایک روز الہ دین کے جن سے ہوگئی۔ اس نے کسی بات پر خوش ہو کر انھیں پیش کش کر ڈالی کہ وہ ان کی کوئی ایک خواہش پوری کر سکتا ہے۔

عارف صاحب فوراً بولے "کراچی کی جن سڑکوں پر ابھی تک فلائی اوور نہیں بنے ان سب پر ایک صاف ستھرا چوڑا اور شاندار فلائی اوور بنا دو۔ روزانہ کسی نہ کسی سڑک پر میری گاڑی ٹریفک میں پھنس جاتی ہے جس کے سبب گھر پہنچنے میں بہت دیر ہوتی ہے۔"

"یہ تو بہت مشکل کام ہے سر!" جن سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "ہزاروں ٹن سریا، سیمنٹ اور دوسرا میٹریل درکار ہوگا، لیبر بھی چاہیے ہوگی۔ سیکڑوں دکانیں ہٹانا ہوں گی۔ بے شمار محکموں میں کام پھنس جائیں گے اور ممکن ہے کہ رشوت نہ ملنے کی وجہ سے وہ فلائی اوور مکمل ہونے کے بعد توڑ دیے جائیں۔"

عارف صاحب مایوسی سے بولے "اچھا تو مجھے ایک تفصیلی مضمون لکھ کر لادو جسے پڑھ کر میں عورت کو مکمل طور پر سمجھ سکوں کہ وہ کیا سوچتی ہے۔ کیوں روتی ہے، کیوں ہنستی ہے، کیا چاہتی ہے اور اسے کس طرح خوش رکھا جا سکتا ہے؟"

جن نے ایک بار پھر سر کھجایا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد مردہ لہجے میں بولا "ٹھیک ہے سر! میں شہر کی ساری سڑکوں پر فلائی اوور ہی بنا دیتا ہوں۔"

(وحید تنویر، عارف والا)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

آخری قسط

شاہِ افغانستان کی واپسی

جب محض تلواروں اور خنجروں سے لڑنے والے افغانوں نے توپوں اور رائفلوں سے لیس انگریز فوج کے چھکے چھڑا دیے..... افغانستان میں نبرد آزما امریکیوں و یورپیوں کے لیے تاریخ کا ایک عبرت ناک باب

پروفیسر محمد فاروق قریشی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پچھلی اقساط کا خلاصہ: افغانستان پاکستان کا شمالی ہمسایہ ملک ہے۔ یہ کوہ ہندوکش کی برف پوش چوٹیوں اور پہاڑی دروں کے درمیان پہاڑی میدانی اور صحرائی خطوں پر مشتمل ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۲۵۰۰۰۰ مربع میل ہے اور وسطی ایشیا، جنوبی ایشیا اور مغربی ایشیا کے سنگم پر واقع ہے۔ اس کی آبادی تین کروڑ ہے جو تاجک، ازبک، ہزارہ، درانی، غلزئی اور پشتون قبائل پر مشتمل ہے۔ یہاں قبائل کے درمیان خون کے جھگڑے اور لڑائیاں ہوتی رہتی اور جنگجو سرداروں کے درمیان اتحاد بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ محل وقوع کے اعتبار سے عالمی بساط پر افغانستان کی اہمیت مسلمہ ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں افغانستان عالمی استعماری طاقتوں روس اور برطانیہ کے درمیان سرد جنگ کا میدان بنی رہی اور ہر ایک نے اپنے اپنے مقاصد کے لیے اس کا استعمال کرنے کی کوشش کی۔

۱۷۴۷ء میں احمد شاہ ابدالی نے درانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس میں موجودہ افغانستان، پشاور، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور کشمیر کے علاقے شامل تھے۔ احمد شاہ ابدالی کا تعلق سدوزئی قبیلے سے تھا۔ ۱۷۷۲ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا۔ ۱۷۹۳ء میں تیمور شاہ کے انتقال کے بعد اس کے چوبیس بیٹوں میں باہمی لڑائی چھڑ گئی۔ چنانچہ شاہ زمان، شاہ محمود اور شاہ شجاع نے یکے بعد دیگرے اقتدار سنبھالا۔ شاہ شجاع نے ۱۸۰۳ء سے ۱۸۰۹ء تک افغانستان پر حکومت کی۔ پھر اس کے سوتیلے بھائی شاہ محمود نے سدوزئی مخالف قبیلے بارکزئی سے مل کر شاہ شجاع کو نملا کی لڑائی میں شکست دی اور تخت سے محروم کر دیا۔ شاہ شجاع کچھ غدار ساتھیوں کی وجہ سے گرفتار ہو گیا اور کشمیر کے گورنر کی قید میں رہا۔ شجاع کی بیوی وفا بیگم سدوزئی حرم اور بچوں کے ساتھ لدھیانہ میں انگریزوں کی عملداری میں پناہ لے چکی تھی۔ اس نے پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ سے مذاکرات کر کے شاہ شجاع کو کشمیر سے رہائی دلوائی لیکن اس کے بعد رنجیت سنگھ نے اس کو لاہور میں نظر بند کر دیا۔ دوران حراست اس کو سخت اذیتیں اور مصائب برداشت کرنے پڑے۔ اس کے بیٹے کو اس کے سامنے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کا گھر لوٹا گیا، ساز و سامان لوٹ لیا گیا۔ یہاں تک کہ شجاع سے اس کی سب سے قیمتی متاع کوہ نور ہیرا بھی چھین لیا گیا۔ پھر بھی اس کو رہائی نہ ملی۔ بالآخر شجاع نے اپنے وفادار ملازموں کی مدد سے ایک سرنگ کھودی اور اس کے راستے لاہور سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ رہائی کے بعد وہ لدھیانہ میں انگریزوں کے مہمان کے طور پر اپنی بیوی وفا بیگم سے جا ملا۔

تیس سالہ جلاوطنی کے دور میں شجاع نے تین مرتبہ اپنا تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پہلی مرتبہ اس نے کچھ فوج اکٹھی کر کے کشمیر پر حملہ کیا لیکن ناسازگار موسم اور دشوار گزار راستے کی وجہ سے ناکام رہا۔ دوسری مرتبہ اس نے بچے ہوئے قیمتی زر و جواہرات بیچ کر فوج بھرتی کی اور سندھ کے راستے قندھار پر حملہ آور ہوا لیکن بارکزئی حکمرانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس کی فوج تباہ ہو گئی اور خود اسے بھاگ کر اپنی جان بچانا پڑی۔ تیسری مرتبہ اس نے انگریزوں اور رنجیت سنگھ کے ساتھ ملی بھگت کے ذریعے پشاور پر قبضہ کر لیا لیکن اپنے غیر ضروری تکبر اور شاہانہ رویے کی وجہ سے اپنے اتحادی سرداروں کی ہمدردیاں کھو بیٹھا اور ایک مرتبہ پھر اس کو لدھیانہ میں پناہ لینا پڑی۔

شاہ شجاع اپنے کھوئے ہوئے تخت کی بازیابی کے لیے چوتھی اور آخری مرتبہ انگریزوں کی انڈس آرمی کے ہمراہ افغانستان پہنچا۔ افغانستان پر بالادستی حاصل کرنے کی گریٹ گیم (Great Game) میں روس نے برطانیہ کو سفارتی شکست دے دی اور افغانستان کے طاقتور امیر دوست محمد خان کے ساتھ سفارتی اور فوجی معاہدے کر لیے۔ جواب آں غزل کے طور پر ہندوستان کے برطانوی گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ نے فوجی قوت کے بل بوتے پر جلاوطن شاہ شجاع کو کٹھ پتلی بادشاہ کے طور پر افغانستان کے تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۸۳۸ء میں شاہ شجاع اور برطانیہ کی انڈس آرمی کی مشترکہ مہم جوئی کا آغاز کیا گیا۔

جولائی ۱۸۳۸ء میں میک نیگٹن نے لدھیانہ میں شاہ شجاع سے ملاقات کی اور اس کو منصوبے سے آگاہ کیا۔ شجاع منصوبہ سازی میں شامل نہ کیے جانے پر ناخوش تھا لیکن اس کے پاس اس کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس نے انگریزوں سے یقین دہانیاں حاصل کیں کہ اس کے خاندانی اور ملکی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ نیز افغانستان کی تعمیر نو کے لیے مالی امداد

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دی جائے گی۔ اس طرح برطانیہ، رنجیت سنگھ اور شجاع کے اتحاد ثلاثہ کے نتیجے میں شجاع نے چوتھی مرتبہ اپنے تخت کی بازیابی کے لیے افغانستان کا رخت سفر باندھا۔ ایملی ایڈن اپنے ایک خط میں شملہ کے فرحت بخش موسم اور وہاں کے وزرا اور ان کی پارٹیوں کی تعریف کرتی ہے۔ لارڈ آک لینڈ شملہ میں افغانستان پر حملے کے پروگرام کو آخری شکل دے رہا تھا۔ اگرچہ کچھ لوگوں نے اس منصوبے پر شکوک کا اظہار کیا لیکن میک نیگٹن اور اس کے سخت گیر ساتھیوں نے اس کو حملے پر آمادہ کر لیا۔ لارڈ آک لینڈ نے "شملہ منشور" میں اعلان کیا جس میں اس ارادے کا اظہار کیا گیا کہ برطانیہ افغانستان تخت کے اصل حقدار شاہ شجاع کی فوجی مدد کرے گا تاکہ وہ اپنا تخت دوبارہ حاصل کر لے۔ تاریخ میں اس کو پہلی اینگلو افغان جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جنگی منصوبے کے مطابق انگریز جنرل برنس کو سر کا خطاب دے کر سندھ روانہ کر دیا گیا تاکہ وہ فوجوں کے سفر میں سہولت پیدا کرے۔ برطانیہ، رنجیت سنگھ اور شجاع کی افواج فیروز پور میں جمع ہوگئیں۔ فوجی دستوں اور ہتھیاروں کی شاندار پریڈ ہوئی۔ وہاں آک لینڈ اور رنجیت سنگھ کی پہلی ملاقات ہوئی۔ رات کے کھانے پر ایملی رنجیت سنگھ کی سحر انگیز شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے اس کو اپنی وہسکی کشید کردہ شراب پلائی۔ اگلے دن سرخ وردیوں میں ملبوس انڈس آرمی کے نو ہزار سوار، پیادہ اور خچر سوار دستے بے شمار اونٹوں، ہاتھیوں، گھوڑوں، توپوں، گولہ بارود، اشیائے خورونوش کے ہمراہ شکارپور کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں انھوں نے دریا پر کشتیوں کا پل تعمیر کیا۔ فوج نے دریا کو پار کر کے بلوچستان کے راستے افغانستان کا سفر اختیار کیا۔ یہ ایک طاقتور اور مرعوب کن فوج تھی لیکن راستے کی بھوک، پیاس، بیماری اور بلوچی ڈاکوؤں کے حملوں نے اس کی مستعدی کو خطرات پیدا کر دیے۔ علاقہ بے آب و گیاہ پہاڑی صحرا کی مانند تھا۔ بہت سے سپاہی اور دوسرے ملازم موت کا شکار ہو گئے۔ خوراک کی بھی قلت ہو گئی۔ غرضیکہ انتہائی ناسازگار موسمی حالات، سفر کی صعوبتوں اور ڈاکوؤں کے خوف و ہراس نے فوجی جوانوں کو کمزور اور عاجز کر دیا۔ آخر کار وہ درہ بولان سے گزر کر کوئٹہ پہنچ گئے۔ کوئٹہ سے آگے وہ درہ کوژک سے گزرے اور طویل صبر آزما سفر کے بعد افغانستان میں داخل ہو گئے۔ راستے میں ان کا واسطہ اچکزئی قبیلے کے باوقار گھڑ سواروں سے ہوا۔ وہ ان سے پوچھتے تھے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ جنرل ناٹ ان کی وجاہت اور بے خوفی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے جواب دیا کہ شاہ شجاع دوست محمد سے اپنا حق واپس لینے آیا ہے۔ افغان نے جواب دیا کہ اگر تم دہلی اور ہندوستان پر حق رکھتے ہو تو دوست محمد کابل پر حق رکھتا ہے اور وہ اس کو قائم رکھے گا۔ جنرل ناٹ کو یقین ہو گیا کہ افغان لڑے بغیر میدان نہیں چھوڑیں گے۔

جب انڈس آرمی قندھار کے قریب پہنچی تو برنس کے مترجم، موہن لال کشمیری کو اطلاع ملی کہ دوست محمد کا قریبی ساتھی حاجی خان کاکڑ دو سو ساتھیوں سمیت شجاع کے ساتھ عہد وفاداری کے لیے تیار ہے۔ حاجی خان کاکڑ ایک حریص، بے ضمیر اور ناقابل اعتماد شخص تھا۔ اب وہ شاہ شجاع سے اقتدار میں حصہ اور مراعات چاہتا تھا۔ آئندہ چند دنوں میں مزید افغان امرا شجاع سے آملے۔ ۲۵ اپریل ۱۸۳۹ء کو شجاع فاتحانہ انداز میں قندھار میں داخل ہوا۔ برنس اور میک نیگٹن بھی اس کے ہمراہ تھے۔ راستے میں شہر کے لوگوں نے شاہ شجاع کا استقبال پھولوں کے ہاروں سے کیا۔ شجاع نے اپنے دادا احمد شاہ ابدالی کے مزار پر فاتحہ خوانی کی اور اس سے ملحق خانقاہ میں محمد ﷺ کے مقدس چغے کی بھی زیارت کی۔ تین سال پہلے برکت اور کامیابی کے حصول کے لیے دوست محمد بھی یہاں آیا تھا۔ قریب ڈیڑھ سو سال بعد امیر المومنین ملا عمر نے بھی یہاں حاضری دی۔ قندھار پہنچ کر انڈس آرمی کے افسر اور جوان سفر کے مصائب کو بھول گئے اور وہاں کے پرلطف موسم اور خوراک اور پھلوں کی بہتات پر خوشی سے جھوم اٹھے۔ یہ جگہ سفر کی درماندہ اور نیم فاقہ زدہ فوج کے لیے جنت سے کم نہیں تھی۔

انڈس آرمی نے بغیر کسی مزاحمت کے قندھار پر قبضہ کر لیا تھا۔ میک نیگٹن نے آک لینڈ کو خط لکھا اور اپنی کامیابی اور شاہ شجاع کی مقبولیت کی رپورٹ پیش کی۔ قندھار میں شجاع کو ایک دربار منعقد کر کے باقاعدہ تخت نشین کیا گیا۔ تقریب میں افغان سردار اور انڈس آرمی کے جرنیل شریک ہوئے۔ شاہ نے دو لاکھ روپے فقرا میں تقسیم کرائے۔ یہاں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جس میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں رعیت ایک برطانوی فوجی نے ایک افغان لڑکی کی آبرو ریزی کی۔ لوگوں نے سخت احتجاج کیا لیکن شجاع بھی ان کی داد رسی نہ کر سکا۔ لوگوں کو یہ تاثر ملا کہ شجاع صرف نام کا بادشاہ ہے اور حقیقی اقتدار انگریز افسروں کے پاس ہے۔ افغانوں کو دوسرا اعتراض یہ تھا کہ شجاع غیرملکی فوج کو افغانستان میں کیوں لایا ہے؟ چناں چہ برطانوی فوج کے خلاف مزاحمت شروع ہو گئی۔

جون ۱۸۳۹ء میں مہاراجا رنجیت سنگھ مختصر علالت کے بعد چل بسا۔ اس کی موت کے بعد پنجاب وراثتی لڑائیوں کے باعث انتشار کا شکار ہو گیا۔ فتح قندھار کے بعد انڈس آرمی غزنی پہنچی۔ غزنی کا مضبوط ترین قلعہ ۲ گھنٹوں کے اندر فتح ہو گیا۔ اس شکست نے دوست محمد کی کمر توڑ دی۔ نیز اس کا بہادر بیٹا اکبر خان زہر خورانی سے بیمار ہو گیا۔ جلد ہی پورے ملک میں افغان سردار بارک زئی حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوست محمد اپنے ساتھیوں کی بے وفائی سے دل برداشتہ ہو کر کابل سے فرار ہو گیا۔ تین دن بعد انڈس آرمی کابل پہنچ گئی اور شجاع تیس سال بعد اپنے کھوئے ہوئے تخت پر براجمان ہوا۔ برطانوی فوجی افسروں نے دوست محمد کا تعاقب کیا لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔

نومبر ۱۸۴۱ء میں اچانک کابل میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ ہزاروں مسلح افراد نے الیگزینڈر برنس کے گھر کو گھیرے میں لے کر اس کے بالمقابل واقع خزانے کو لوٹ لیا۔ برنس کی توقع کے خلاف کابل چھاؤنی سے کوئی مدد نہ پہنچی۔ مشتعل افراد نے اس کے گھر کو آگ لگا دی۔ جب برنس مجبوراً باہر نکلا تو ہجوم انگریز افسر پر ٹوٹ پڑا اور اس کے ٹکڑے کر ڈالے۔ لیکن میک نیگٹن اور جنرل ایلفنسٹن نے بغاوت فرو کرنے کے لیے کوئی فوجی کارروائی نہ کی۔ (اب آگے پڑھیے)

الیگزینڈر

برنس کی سربریدہ لاش ایک ہفتے تک گلی میں پڑی رہی اور شہر کے کتے اسے نوچتے رہے۔ کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ لاش کے مسخ شدہ ٹکڑے اٹھاتا۔ آخرکار برنس کے ایک قریبی دوست نائب شریف نے اپنے ایک ملازم کو بھیجا کہ گلے سڑے ٹکڑے دفن کر دے۔

برنس کے قتل کی خبر پھیلی تو دیہی علاقوں سے قبائلیوں نے شہر کا رخ کر لیا۔ غلزئی قبیلے کے پیادہ اور گھڑسوار بھی میدان جنگ میں کود پڑے۔ چاروں طرف سے قبائلی جوق در جوق کابل میں داخل ہونے لگے۔ دو تین ہفتوں کے اندر جنگجوؤں کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی جو مختلف اسباب کی بنا پر انگریزوں پر حملہ کرنے کے لیے جمع ہوئے۔

باغیوں کے اوّلین اہداف شہر اور چھاؤنی کے درمیان مضافاتی قلعے اور برج محمد تھے۔ برطانوی فوجی افسروں نے انھیں اسلحہ اور اشیائے خورونوش کے گوداموں میں تبدیل کر رکھا تھا۔ باغیوں کو اچھی طرح علم تھا کہ قلعوں میں سامان رسد کی حفاظت کا مناسب انتظام نہیں کیا گیا۔ اگر وہ قلعے تباہ کر دیتے یا ان پر قبضہ کر لیتے، تو انگریز یا تو بھوک سے مر جاتے یا اسلحہ اور گولہ بارود کی کمی کے سبب ہتھیار ڈال دیتے۔ چناں چہ شروع میں انھوں نے قلعہ جعفر خان گرایا اور اسے آگ لگا دی۔ پھر قلعہ محمد شریف فتح ہوا۔ اگلا نشانہ قلعہ نشان خان بنا جہاں شاہ شجاع کی فوج کا سامان جمع تھا۔ یہ برطانوی ہیڈکوارٹر سے صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا۔

بہت جلد یہ واضح ہو گیا کہ برطانوی فوج باغیوں کو موثر جواب دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ چناں چہ برطانیہ کے حامی سردار بھی باغیوں سے رابطے کرنے لگے۔ ایک انگریز فوجی افسر کے بقول "چھاؤنی سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک میل کے اندر اور بالا حصار کی دیواروں کے پیچھے ہمارے ہم وطنوں کو قتل کیا جانے لگا۔" برطانوی فوج کی کمزوری نے افغانوں کو دلیر بنا دیا۔ باغیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک عبوری حکومت بنا کر اپنا قائد منتخب کر لیں گے تاکہ جہاد کا باقاعدہ اعلان ہو سکے۔ پھر باغی شاہ شجاع کو اپنا قائد بنانا چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے شاہ کے پاس ایک وفد بھیجا جس نے اپنی معروضات پیش کیں۔ "آپ ہمارے شہنشاہ ہیں اور ہم غیر ملکی قبضے کے خلاف آپ کی حمایت چاہتے ہیں۔ براہ مہربانی اپنے آپ کو غیر ملکیوں کے اس گروہ سے الگ کر لیجیے۔"

بادشاہ سلامت نے جواب دیا:

"ہماری حکومت انگریزوں سے الگ نہیں ہو سکتی کیونکہ ہم نے تیس سال بطور ان کے معزز مہمان گزارے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے ملا شکور خان کو نظام الدولہ اور وزیر بنا کر ہمیں دکھ پہنچایا۔ پھر بھی ہم ان کے خلاف کوئی کینہ نہیں رکھتے۔ بے شک جو انجام ان کا ہونا ہے ہمارا بھی ہو جائے گا۔"

بادشاہ کو اپنی جدوجہد میں شریک کرنے میں ناکامی پر باغیوں نے اسے بھی کافر قرار دے دیا۔ کسی سدوزئی رہنما کی عدم موجودگی میں انھوں نے پھر بارک زئیوں سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ کئی ہفتوں سے افواہ گرم تھی کہ دوست محمد کا بیٹا اکبر خان بالآخر بخارا کے قید خانے سے بچ نکلا ہے۔ لیکن اس کی غیر حاضری میں باغیوں نے اس کے عم زاد محمد زمان خان کو اپنا قائد چن لیا۔

اس طرح ایک دیہاتی اور خانہ بدوش کابل کا طاقتور ترین شخص بن گیا۔ بغاوت کے حقیقی راہنما بھی نظر انداز نہیں ہوئے۔ امین اللہ خاں لوگاری اس کا نائب اور عبداللہ خان اچکزئی کمانڈر ان چیف مقرر ہوئے۔ باغیوں کی طرف سے اعلان کیا گیا: "لطف و کرم میں اپنے زمانے کے پھول اور مذہبی عقیدت میں اپنے عہد کے کامل رہنما نواب محمد زمان خان بارک زئی کو تمام قبائل نے امیر المومنین اور جہادی جنگجوؤں کا امام منتخب کر لیا ہے۔" اس کے فوراً بعد شہر کی گلیوں سے ملا اور ملنگ ڈھول بجاتے ہوئے باہر نکل آئے اور انھوں نے باقاعدہ جہاد کا اعلان کر دیا۔

اکبر خان

بالا حصار میں براجمان شاہ شجاع سمجھتا تھا کہ بغاوت کے زور پکڑنے سے پہلے فوری اقدام کرنا بے حد ضروری ہے۔ وہ میک نیگٹن کی طرف سے جوابی حملہ کرنے میں ناکامی پر دل گرفتہ تھا۔ یہ بات صرف میک نیگٹن کی شکست خوردگی ظاہر کرتی تھی۔ چھاؤنی میں برطانوی قیادت عجیب انداز میں خاموشی اختیار کیے ہوئے تھی جیسے خوف سے منجمد ہو گئی ہو۔ آخرکار بادشاہ نے اپنے چیف سیکرٹری کو یہ پیغام دے کر میک نیگٹن کے پاس بھیجا: "یہ وقت تساہل اور تاخیر کا نہیں، شہر کو بچانے کے لیے فوراً دستے بھیجو۔ فساد کو قابو سے باہر ہونے سے پہلے کچل دو۔ باغی راہنماؤں کو منظم ہونے سے پہلے گرفتار کرو۔ یہ کام اب بھی کیا جا سکتا ہے۔"

میک نیگٹن کا خیال تھا کہ بادشاہ ضرورت سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

زیادہ گھبراہٹ کا شکار ہے۔ اس نے صرف سپاہیوں کی ایک پلٹون بمع توپ خانے کے ساتھ بالا حصار بھیج دی تاکہ بادشاہ پرسکون ہو جائے۔ بادشاہ نے ایک مرتبہ پھر پیغام بھیجا کہ شہر میں امن و امان بحال کرنے کی فوری ضرورت ہے ورنہ سرکش افغان قابو میں نہیں آئیں گے۔ میک نیگٹن نے جواب دیا کہ اس جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟ افسوس! اس نے شاہ کے مشورے پر عمل نہ کیا اور شہر میں امن بحال کرنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا۔

میک نیگٹن نے برنس کے اندوہناک قتل کے باوجود صورت حال کی سنگینی کا ادراک نہیں کیا اور بغاوت کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ لیکن تلخ سچائی جلد ہی سامنے آگئی اور میک نیگٹن نے سول ہیڈکوارٹر چھوڑ کر پسپا ہوتے ہوئے چھاؤنی میں پناہ لی۔ اس اثنا میں جنرل الفنسٹن نے چھاؤنی کی چار دیواری کے حفاظتی دستے کو دگنا کر دیا۔ اس سے آگے برطانوی کمانڈروں نے کچھ نہ کیا اگرچہ ان کے پاس پانچ ہزار مسلح فوجی گھڑسوار، توپ خانہ اور ایک سال تک کا گولہ بارود موجود تھا۔ اس دوران بریگیڈیئر شیلٹن نے اپنے دستوں کے ساتھ شہر کے گرد مارچ کیا۔ لیکن شہر میں داخل ہونے اور باغیوں کا سامنا کرنے سے گریز کیا۔ ایسا لگتا تھا چھاؤنی میں برطانوی قیادت مکمل طور پر مفلوج ہو چکی تھی۔

تین نومبر کی صبح ایلڈرڈ پاٹنجر صرف ایک سو فوجیوں کے ساتھ چھوٹے سے قلعہ نما احاطے میں موجود تھا۔ قلعہ کابل کے شمال میں ساٹھ میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی چوٹی پر واقع تھا۔ اس نے دیکھا کہ بڑی تعداد میں مسلح کوہستانی برق گھر کے اردگرد جمع ہو رہے ہیں۔ جلد ہی ان کی تعداد میں خطرناک حد تک اضافہ ہو گیا۔ پاٹنجر کا نائب لیفٹیننٹ چارلس رٹرے ایک افغان فوجی دستے کا کمانڈر تھا۔ وہ نئے بھرتی کیے ہوئے افغان سپاہیوں کا معائنہ کرنے باہر نکلا۔ نئے رنگروٹوں نے اسے گھیرا اور گولی مار دی۔ اگلی رات پاٹنجر اور اس کا حفاظتی دستہ گولہ بارود کی ہونے پر باہر نکلے اور لڑتے ہوئے وادی میں برطانوی بیرکس تک پہنچ گئے۔ بیرکس کی تعمیر نامکمل تھی اور وہ بغیر دروازے کے تھیں۔ وہاں سات سو پچاس گورکھا سپاہی اور دو سو عورتیں اور بچے مقیم تھے۔ اب ایک نئے مسئلے نے سر اٹھا لیا۔

ان محصور فوجیوں کے پاس پانی ختم ہو گیا۔ جو بھی نہر یا چشمے سے پانی لینے باہر جاتا، باغی اسے گولی مار دیتے۔ چار دیواری کے اندر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا اور آدمی پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے۔ اڑتالیس گھنٹوں کے اندر بیس ہزار تاجک باغیوں نے پاٹنجر اور گورکھا فوجیوں کو محصور کر لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ملک کی ساری مردانہ آبادی وہاں اکٹھی ہو چکی ہے۔ اگلے دن محاصرین نے قریبی قلعے پر قبضہ کر لیا اور وہاں سے توپوں کے گولے احاطے کے اندر گرنے لگے۔

جلد ہی ایک گولی پاٹنجر کی ران میں لگی اور وہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ اس کا فوجی کمانڈر کیپٹن کرسٹوفر چھاتی میں گولی کھا کر مہلک طور پر زخمی ہوا۔ آئندہ دنوں میں آدھا کپ پانی صرف لڑنے والے سپاہیوں کو دیا جاتا تھا اور اس کا بھی زیادہ حصہ کیچڑ پر مشتمل ہوتا۔ لڑنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے لیکن پانی کے بغیر لڑنا تقریباً ناممکن ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اختتام ہفتہ پر سارے محصورین نفسیاتی مریض بن چکے تھے۔ شمالی افغانستان میں راتوں رات ہر گاؤں انگریزوں کا دشمن بن گیا۔

دروشمیر میں برطانوی چوکی چیتی بلاک پر حملہ کیا گیا اور فوجیوں کو مجبوراً پشاور تک پسپا ہونا پڑا۔ کابل کے جنوب میں کیپٹن کرافورڈ کی قیادت میں سپاہیوں کی ایک پارٹی قندھار سے باغی افغان سرداروں کے ایک گروہ کو غزنی لے جا رہی تھی۔ وہ ساری رات چلتے رہے اور صبح مولتی پہنچے۔ آٹھ بجے کے قریب مولتی میں تلواروں اور بندوقوں سے مسلح پانچ سو آدمیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ کئی مارے گئے۔ باقی بھاگ کر دوسرے قلعوں میں جا چھپے۔

جلد ہی غلوئی قبیلے کی ایک بڑی فوج نے غزنی کا محاصرہ کر لیا۔ صرف قندھار پر امن رہا کیونکہ وہاں جنرل ناٹ اپنی حقانی نظروں کے ساتھ موجود تھا۔ جنرل ناٹ لکھتا ہے ''مجھے دشمن سوتا ہوا نہیں پائے گا جس طرح میرے کابل کے دوست پائے گئے۔''

ادھر کابل میں اب صرف قلعہ نشان خان باقی بچا جہاں خوراک اور رسد کافی مقدار میں موجود تھی۔ اس قلعے کا کمانڈر کولن میکنزی لکھتا ہے: ''صورت حال اتنی خراب تھی کہ افغان حملہ آور ہمارے محافظوں کو گولیوں کا نشانہ بنانے لگے۔ انھوں نے ہمارے دروازے نذر آتش کرنے کی خاطر دیواروں کے پیچھے لکڑیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ ہمارے گھڑسوار تیم باغیانہ انداز میں بھاگ نکلنے کو تیار ہوئے لیکن میری شدید وارننگ پر اس اقدام سے باز رہے۔ لگتا تھا کہ ہمیں ہمارے ہی ہم وطنوں نے چھوڑ دیا۔

''جب گولہ بارود تقریباً ختم ہو گیا تو افغان دستے کا کمانڈر حسن خان میرے پاس آیا اور کہا ''میرا خیال ہے ہم اپنا فرض ادا کر چکے۔ اگر تم ضروری سمجھتے ہو کہ ہم یہاں مر جائیں تو ہم مر جائیں گے لیکن ہم اپنی پوری کوشش کر چکے ہیں۔'' میں نے اس کے ساتھ اتفاق کیا اور پسپائی کے انتظامات کرنے لگا۔ ہم نے منصوبہ بنایا کہ غروب آفتاب کے فوراً بعد نکل جائیں گے جب محاصرین اپنے افطار کھانے میں مصروف ہوں گے کیونکہ یہ رمضان کا مہینا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ تمام سامان اور خوراک وہیں چھوڑ دیں اور دیہات سے بچتے ہوئے نہر کے ساتھ ساتھ چھاؤنی تک پہنچیں۔

سر ولیم میک نیٹن

''مگر میرے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کئی غریب عورتوں نے اپنا سامان اپنے کندھوں اور سروں پر اٹھا لیا اور بچوں کو پیدل چلایا جن کی چیخوں سے ہمارا فرار ظاہر ہو گیا۔

''میکنزی رقمطراز ہے: ''رات کے وقت پسپائی نہایت تباہ کن ہوتی ہے۔ ہم ابھی نصف میل دور گئے تھے کہ فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں دو سواروں اور ایک چپراسی کے ساتھ افغان دستے سے الگ ہو گیا۔ میں چیختی چلاتی ہوئی عورتوں اور بچوں کے درمیان فائرنگ کی زد میں کھڑا تھا۔ جلد ہی باغیوں نے مجھے گھیر لیا اور ''یہ فرنگی ہے'' کا نعرہ لگاتے ہوئے تلواروں سے مجھ پر حملہ کیا۔

''میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، دائیں سے بائیں چکر کھاتے ہوئے ان کے حملوں کا جواب دیا اور سب

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے دلیر حملہ آور کا بازو کاٹ دیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد میرے سر کے پچھلے حصے پر اتنا زوردار وار ہوا کہ میں تقریباً گھوڑے سے گر گیا۔ ایک پاؤں پر لٹکتے ہوئے میں نے دشمن کے پہنچنے سے پہلے خود کو سیدھا کیا اور فائرنگ سے بچتا تیز رفتاری سے آگے نکل گیا۔"

آخر کار وہ چھاؤنی پہنچ گئے۔ رات کے وقت ان کی پارٹی کے مزید افراد آ گئے۔ اس ساری کارروائی میں درجن بھر آدمی مارے گئے۔ لیکن کولن میکنوٹی نے پچاس جوانوں کے ساتھ جو تاریخ رقم کی، وہ چھاؤنی میں موجود پانچ ہزار فوجی نہ کر سکے۔ ہر قابل ذکر انگلش ادارے نے اعتراف کیا ہے کہ اگر ایک دو رجمنٹ فوجی اس قلعے میں بھیج دیے جاتے تو انگریز شہر پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکتے تھے۔

یوں انگریز جرنیلوں کی بے عملی کے سبب نہ صرف خزانہ باغیوں کے ہاتھوں میں گیا بلکہ چار لاکھ روپے مالیت کی گندم، جو، شراب اور دوسری ضروریات زندگی دشمن پر وار کیے بغیر ان کے حوالے کر دی گئیں۔ یہ سب کچھ بغاوت رونما ہونے کے صرف چھتیس گھنٹے کے اندر رونما ہوا۔ یہ بات افغانوں کے لیے بھی حیران کن تھی کہ پانچ ہزار آدمیوں کی برطانوی فوج جس کے اعلیٰ نظم ونسق، بلند کردار، حوصلے اور قیادت کی دانائی کی کہانیاں انھوں نے سن رکھی تھیں، خاموشی سے بیٹھی باغیوں کو چھاؤنیوں کے دروازوں تک پہنچتے ہوئے دیکھتی رہی۔

تاہم افغان قوم کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ ہر شخص انگریزوں کا دشمن اور انھیں انتہائی قابل نفرت سمجھتا تھا۔ وہ پہر تک دور و نزدیک سے ہزاروں افغان جمع ہونے اور انگریزوں کا مال غنیمت لوٹ کر لے گئے۔ انگریز چھاؤنیوں میں بیٹھے بے بسی سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔

ان حالات میں کابل کی محصور چھاؤنی میں بھوک اور قحط کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ فوجیوں کو نصف راشن دیا جانے لگا۔ ادنیٰ ملازمین اور بار برداری والے جانوروں پر سب سے زیادہ آفت ٹوٹی اور قحط کا نشانہ سب سے پہلے وہی بنے۔ ہیوجانسن اپنی ڈائری میں لکھتا ہے: "ہمارے مویشی کئی دنوں سے فاقہ کشی کا شکار ہیں۔ ان کے لیے گھاس کا ایک پتا یا چارہ دستیاب نہیں۔ اسٹور میں موجود جو ملازمین کو ایک پاؤ روزانہ کے حساب سے دیا جاتا ہے۔ ہمارے مویشی درختوں کی شاخوں اور چھال پر زندہ ہیں۔ مشکل ہی سے کوئی جانور بوجھ اٹھانے کے قابل ہے۔"

ایک ہفتے بعد صورت حال مزید سنگین ہو گئی۔ "ہمارے ملازمین کو دو دن سے کھانے کو کچھ نہیں ملا سوائے بھوک سے مرنے والے اونٹوں اور گھوڑوں کی لاشوں کے۔ درختوں کی شاخیں اور چھال بھی دستیاب نہیں۔ چھاؤنی کے تمام درخت ٹنڈ منڈ ہو چکے۔" سرما کی آمد کے ساتھ ہی مصیبت دو چند ہو گئی۔ برفباری سے درجہ حرارت گر گیا۔ دراصل غلے اور چارے کی فراہمی علاقائی قبائل کی ذمہ داری تھی۔ جب میکنیٹن نے ان کی تنخواہ میں کٹوتی کر دی تو انھوں نے انتقاماً خوراک فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔

تقریباً اسی وقت باغی لوٹی ہوئی توپوں سے چھاؤنی پر بمباری کرنے لگے۔ اگرچہ افغانوں کے پاس تربیت یافتہ توپچی نہیں تھے، پھر بھی دیواروں کے اندر گرنے والے گولے محصور فوجیوں کے اعصاب شل کرنے لگے۔ اسی دوران قلعہ محمد شریف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ یوں وہ چھاؤنی سے باہر نکلنے والے برطانوی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فوجیوں کو نشانہ بنا سکتے تھے۔ چھٹے نومبر کو الفنسٹن نے فائرنگ کا جواب دینے سے منع کر دیا کہ یوں اسلحہ ختم ہو جائے گا۔ حالانکہ ان کے پاس اتنا اسلحہ تو تھا کہ ایک سال تک محاصرہ برداشت کر لیتے۔

اب یہ واضح ہو گیا کہ جنرل الفنسٹن انگریز فوج پر بوجھ بن چکا۔ لوگ کہنے لگے کہ اسے ہٹا دیا جائے۔ لیڈی سیل نے اپنی ڈائری میں لکھا: ''بیچارہ جنرل مختلف آرا کی روشنی میں منتشر الخیال ہو گیا۔ جسمانی بیماریوں نے اس کے حواس کمزور کر ڈالے۔ پسپائی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ہمارے فوجی قیادت کی نااہلی کی وجہ سے کم دل جھلکی اور بے اعتمادی کا شکار ہو چکے۔

چھاؤنی پر گولہ باری اور فائرنگ بڑھ رہی ہے۔ بہت سے انگریز افسر روتے ہوئے پائے گئے۔ وہ اپنی ذلت اور بےبسی کا الزام جرنیلوں پر لگاتے۔''

۱۹ نومبر کو میک نیگٹن نے بیمار، مایوس اور شکست خوردہ الفنسٹن کی جگہ شیلٹن کو بالاحصار سے چھاؤنی میں بلا لیا۔ یہ ایک بڑی غلطی تھی کیونکہ وہ بھی اتنا ہی نااہل اور بےعمل ثابت ہوا۔ وہ کھلے عام پسپائی کی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے زور دیا کہ انھیں فوراً پیچھے ہٹ کر جلال آباد چلے جانا چاہیے۔ اس سے فوجی قیادت اہم معاملات پر تقسیم ہو گئی۔ بالاحصار سے شیلٹن کی روانگی کے بعد شاہ شجاع قلعے میں بالکل تنہا رہ گیا۔ صرف اس کے ذاتی محافظ اور مٹھی بھر انگریز افسر وہاں رہ گئے۔ بادشاہ محاصرے کے دوران حرم سرائے کے دروازے کے پاس بیٹھا رہتا۔ شاہی دربار کے تکلفات معطل ہو گئے۔ اب افسر اس کے پاس کرسیوں پر بیٹھتے۔ وہ دوربین کی مدد سے چھاؤنیوں میں پیش آنے والے مناظر نہایت بےبسی اور افسردگی سے دیکھتا۔ اس کے ہوش و حواس تقریباً جواب دے چکے تھے۔

۱۰ نومبر کو ''بی بی مہرو'' پہاڑی کے اردگرد لڑائی زور پکڑ گئی کیونکہ برطانوی فوج کے لیے خوراک کی رسد کا یہی واحد ذریعہ تھا۔ ۱۰ نومبر کو باغیوں نے پہاڑی پر قبضہ کر لیا۔ تین دن بعد باغیوں نے دو توپوں کو چوٹیوں پر پہنچایا اور وہاں سے چھاؤنی پر گولے برسانے لگے۔ میک نیگٹن نے بریگیڈیئر شیلٹن کو حکم دیا کہ ان توپوں کے خلاف کارروائی کرے۔ شیلٹن نے پیادہ فوج کے ساتھ ایک بڑا زبردست حملہ کیا۔ لیکن افغان گھڑسواروں نے بلندی سے ان پر حملہ کیا اور سیکڑوں انگریزوں کو گھاس کی طرح کاٹ ڈالا۔

مرزا عطا کے مطابق برطانوی فوج نے اسی آدمیوں کی ہلاکت اور دو سو زخمیوں کے نقصان کے بعد ایک توپ کو ناکارہ بنایا اور دوسری کو گھسیٹ کر چھاؤنی لے آئے۔ پندرہ نومبر کو برطانوی فوجیوں کے حوصلے کو ایک کاری وار لگا جب چارِیکر کی ۷۵۰ افراد پر مشتمل فوج میں سے صرف دو آدمی یعنی ایلڈرڈ پاٹنگر اور جان ہاٹن محاصرین کا دائرہ توڑ اپنی جان بچا کر کابل پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔

دس روزہ محاصرے میں پیاس کی شدت اور محاصرین کی بڑھتی تعداد سے خوفزدہ پاٹنگر نے فیصلہ کیا تھا کہ رجمنٹ کے کچھ سپاہیوں کو بچانے کا واحد راستہ کابل کی طرف پسپائی ہے۔ جونہی پاٹنگر کے فوجی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دروازے سے باہر نکلے کوئی نظم و ضبط قائم نہ رہا۔ پانی کی تلاش میں دیوانہ وار بھاگتے فوجیوں کو باغیوں نے گولیوں سے بھون دیا۔ تین سو سپاہی زخمی ہو کر پیچھے رہ گئے۔ بہت سے سپاہیوں اور ان کی بیویوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں ازبک سرداروں نے آپس میں تقسیم کیا اور فوراً غلام بنا کر فروخت کر دیا۔ حوالدار موتی رام کو دشمنوں نے گرفتار کر لیا۔ وہ اسے مار ڈالنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا اور کلمہ سنایا جس پر اسے رہا کر دیا گیا۔

۲۳ نومبر کو میر مسجدی کی زیر قیادت کافی تعداد میں جنگجو بی بی مہرو پہاڑی پر جمع ہوئے اور توپوں سے چھاؤنی پر گولے برسانے لگے۔ بغاوت کا راہنما عبداللہ خان اچکزئی بھی لڑائی کی جگہ پہنچا۔ انھوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر حملہ شروع کیا۔ شیلٹن نے افغان گھڑسواروں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی پیادہ فوج کے دو دستے بھیجے۔ لیکن افغان فوراً پیچھے ہٹے اور پتھروں اور چٹانوں کے پیچھے چھپ کر گولیاں برسانے لگے۔ انگریز سپاہی ان کا آسان ہدف تھے۔ تاریخ سلطانی کے مطابق عبداللہ خان اچکزئی نے جو بہادری کے لیے مشہور تھا اور شہادت کی دعا مانگتا تھا، تیر کی طرح انگریز دستے پر حملہ کیا۔ انھوں نے ایک توپ چھین لی اور برطانوی پیادہ سپاہیوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ انگریز سپاہی اس حملے کا مقابلہ نہ کر سکے اور بھاگ گئے۔ لیڈی سیل لکھتی ہے: "دشمن نے حملہ کیا اور ہمارے سپاہیوں کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانک کر لے گئے۔"

بہرحال بعدازاں شیلٹن نے اپنے باقی پیادہ سپاہیوں کے ساتھ جوابی حملہ کیا اور اپنی توپ بازیاب کر والی۔ شیلٹن کی اس دست بدست لڑائی میں میر مسجدی اور عبداللہ خان اچکزئی دونوں شہید ہوئے۔ اگر غازی عبداللہ خان شہید نہ ہوتے تو ان کے ساتھی اسی روز چھاؤنی پر قبضہ کر لیتے۔ شیلٹن نے باقی ماندہ فوجیوں کو اکٹھا کیا اور ان کی صف بندی کی لیکن کسی نامعلوم سبب کی بنا پر دشمن پر حملہ نہ کیا۔ اس اثنا میں افغان شمشیر زنوں کی ایک اور پوشیدہ پارٹی نے آخری حملہ کیا۔ اس مرتبہ تمام برطانوی فوجی صفیں توڑ کر چھاؤنی کی طرف فرار ہو گئے۔ افغان گھڑسواروں نے ان کا تعاقب کیا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ تمام ترتیب اور نظم و ضبط ختم ہو چکا۔

بریگیڈیئر شیلٹن کی مکمل ناکامی نے سپاہیوں کے اعتماد کو متزلزل کر دیا۔ یہ واقعہ جنگ کا اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس دن گیارہ سو میں سے تین سو انگریز مارے گئے۔ پیچھے رہ جانے والے زخمیوں کے پیٹ چاک کر دیے گئے اور ان کے بے بس بیوی بچے یہ دلدوز منظر دیکھتے رہے۔

اسی رات برطانوی حکام کو ایک اور بری خبر ملی۔ دوست محمد کے جنگجو اور جنگی حکمت عملی میں انتہائی ماہر بیٹے اکبر خان کا شہر میں زبردست استقبال ہوا۔ وہ چھے ہزار ازبک گھڑسواروں کی قیادت کرتا ہوا بامیان سے کابل پہنچا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے آنے سے زندگی کے باغ میں بہار لوٹ آئی۔ مولانا کشمیری رقمطراز ہے۔ (ترجمہ)

کیا چشمِ تراں نقیبت تمام سرداروں اور امرا نے
دعائیں دیں اس کو مردوں، عورتوں، جوانوں اور ضعیفوں نے
اے ہم سب کے محافظ و ملجا و ماویٰ
بچاؤ اپنے ملک و قوم کو ظالم فرنگیوں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

چند دن کے اندر اکبر خان نے چھاؤنی کے تمام راستے موثر طور پر بند کر دیے۔ ملازوں کو دیہات میں بھیجا گیا کہ وہ کسانوں کو انگریزوں کے ہاتھ اشیائے خورونی فروخت کرنے سے منع کر دیں۔ چھاؤنی کے عقب میں دیہات پر قبضہ کر کے فوج متعین کر دی گئی۔ دریائے کابل پر لکڑی کا پل جلا دیا گیا۔ یہ پل چھاؤنی کو بالاحصار اور جلال آباد کی سڑک سے ملاتا تھا۔ عبداللہ خان اچکزئی اور میر مسجدی کی شہادت کے بعد باغیوں کی قیادت اکبر خان کے سر اور طاقتور غلزئی کی سردار محمد شاہ خان کے ہاتھ میں آ گئی۔ اب غلزئی اور بارک زئی قبائل میں مکمل اتحاد ہو گیا۔

ادھر چھاؤنی میں قیامت کا سماں تھا۔ یخ بستہ ہواؤں اور بھوک نے محصورین کے حوصلے اور ہمت کو پست کر دیا۔ گھوڑے اس حد تک بھوک کے ہاتھوں کہ خیمے کی چوبی کھونٹیاں چباتے اور اپنا ہی گوبر کھاتے پائے گئے۔ لیڈی سیل نے دیکھا کہ ایک گھوڑے نے دوسرے کی دم دانتوں سے کاٹی اور ہڑپ کر گیا۔ جب کہ اس کی گھوڑی ایک تختی کے پیچھے چبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

مرزا عطا لکھتا ہے: ''کابل میں اتنی زیادہ برفباری ہوئی کہ انگریز فوجی برفانی آدمی (Snowmen) بن گئے۔ کئی بھوک سے چل بسے۔ دوسروں نے باربردار اونٹوں اور ٹٹوؤں کو ذبح کیا تاکہ مسلمان فوجی گوشت کھا سکیں اور ہندو ان کی کھالیں۔ اس جہنم زار کے انتہائی ناسازگار حالات میں مذہبی اختلافات اور ممنوعات جاتی رہیں۔ کیمپ کے ملازمین جنھیں مردہ گھوڑوں اور اونٹوں کا گوشت بھی میسر نہ تھا، آوارہ کتوں کو بھون کر کھانے لگے۔

کابل کے سرداروں اور امرا کے مشورے سے اکبر خان نے میک نکٹن کو ملاقات کے لیے خط لکھا۔ فریقین کابل سے باہر مقررہ جگہ پر پہنچے۔ دونوں گرم جوشی سے ملے اور پھر انھوں نے تنہائی میں بات چیت کی۔ دونوں کے درمیان تحریری معاہدہ طے پایا کہ میک نکٹن اور اس کے فوجی ایک انگریز افسر کو بطور یرغمال کابل چھوڑ کر واپس ہندوستان چلے جائیں۔ جب اکبر خان کے والد امیر دوست محمد فرنگی حراست سے رہا

گھات لگائے افغان فوجی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے تو یرغمال افسر کو بھی باعزت چھوڑ دیا جائے گا۔ انگریز حکام کا خیال تھا کہ اس معاہدے کے بعد مزید تصادم پیش نہیں آئے گا۔

لیکن میک نیگٹن نے شاہ شجاع اور اس کے خاندان کو اکبر خان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی بنا پر دونوں کے درمیان سفارتی تعلقات ختم ہو گئے۔ اسی دوران میک نیگٹن کی یہ امید کہ جلال آباد، غزنی یا قندھار سے کمک مل سکتی ہے دم توڑ گئی کیونکہ تینوں مقامات پر برطانوی فوج کو محصور کر دیا گیا۔ کابل چھاؤنی میں صرف ایک دن کی خوراک باقی تھی۔ الفنسٹن اور شیلٹن مایوس اور مفلوج ہو چکے تھے۔ فاقہ زدہ اور شکست خوردہ فوجی بغاوت پر آمادہ تھے۔

ان گمبیر حالات میں ۸ دسمبر کو برطانوی کمانڈروں کا طوفانی اجلاس ہوا۔ تب الفنسٹن، میک نیگٹن اور شیلٹن آپس میں بول چال کے بھی روادار نہ تھے۔ الفنسٹن نے میک نیگٹن کا خط پڑھا جس میں ہتھیار ڈالنے کے لیے مذاکرات شروع کرنے کو کہا گیا تھا۔ فوجی کمانڈروں نے میک نیگٹن کو حکم دیا کہ وہ شاہ شجاع کا تحفظ نظر انداز کرتے ہوئے صرف برطانوی فوجی افسروں اور جوانوں کی افغانستان سے فوری اور بحفاظت واپسی کے لیے اکبر خان سے ضمانت حاصل کرے۔

دریائے کابل کے بیچ بستہ کنارے پر فریقین میں ملاقات ہوئی۔ دو گھنٹے مذاکرات کے بعد میک نیگٹن اور اکبر کے درمیان معاہدہ طے پا گیا جس کی رو سے:

۱۔ تمام برطانوی افسر اور جوان تین دن بعد ۱۴ دسمبر کو کابل سے چلے جائیں گے۔ انھیں حفاظت کی ضمانت دی جائے گی۔

۲۔ کیپٹن ٹریور (Cap. Trevor) بطور یرغمال کابل میں رہے گا۔

۳۔ جلال آباد، غزنی اور قندھار کو خالی کر دیا جائے گا۔

۴۔ ایک بڑی نقد رقم کے عوض انگریزوں کو راستے میں خوراک، اناج اور بار برداری کے جانور فراہم کیے جائیں گے۔

۵۔ شاہ شجاع کو موقع دیا جائے گا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ واپس چلا جائے یا کابل میں عام شہری کے طور پر قیام کرے۔

۶۔ دوست محمد کو لدھیانہ میں نظر بندی سے رہا کر کے افغانستان واپس آنے کی اجازت دی جائے گی۔

۷۔ افغان عہد کریں گے کہ وہ انگریزوں کی رضامندی کے بغیر کسی غیر ملکی طاقت کے ساتھ اتحاد نہیں کریں گے۔

۸۔ انگریز فوج افغان راہنماؤں کی درخواست کے بغیر کبھی افغانستان داخل نہیں ہوگی۔

اس معاہدے میں جس شخص سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا وہ شاہ شجاع تھا۔ حالانکہ اسی کی خاطر افغانستان پر چڑھائی کی گئی۔ سوانح نگار محمد حسین ہراتی کے مطابق شاہ نے اس معاہدے پر غم و غصے کا اظہار کیا۔ اس نے میک نیگٹن کو خط لکھا ''کیا تم ہمیں یہاں دشمنوں کے حوالے کرنے کے لیے لائے تھے؟ اس معاہدے کے ذریعے تم اپنی اور ہماری موت اور تباہی کو آواز دے رہے ہو۔'' میک نیگٹن نے جواب دیا کہ اب معاہدے میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ شاہ سخت اضطراب میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مٹھیاں بھینچتا ہوا دن رات ادھر سے اُدھر دوڑتا اور کہتا "میک نیگٹن کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ ہم دونوں کی موت ثابت ہوگا۔"

میک نیگٹن نے شاہ کے قلعے میں موجود برطانوی سپاہیوں کو فوراً بالا حصار چھوڑنے کا حکم دیا اور اکبر کو پیغام بھیجا کہ قلعہ خالی کیا جا چکا ہے۔ وہ اپنے آدمی وہاں بھیج کر قبضہ کر لے۔ اکبر خان نے فوری طور پر دو ہزار مسلح فوجی وہاں روانہ کر دیے لیکن قلعے کے قدیم اور شاہ کے وفادار ملازمین اکبر خان کی آمد سے خوفزدہ تھے۔ انھوں نے قلعہ کا دروازہ نہیں کھولا اور اکبر خان کے فوجیوں کو بھاری نقصان پہنچا کر پیچھے دھکیل دیا۔ یوں جب برطانوی افسر شاہ شجاع کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر روانگی کے لیے تیار ہو رہے تھے، اس کے گھریلو ملازمین نے سخت مزاحمت دکھائی۔ شاہ شجاع موسم بہار تک اپنے مضبوط قلعے میں کامیابی سے ڈٹا رہا۔ انگریز حکام کی بزدلی اور کمزوری کے مقابلے میں اس کا حوصلہ اور فوری اقدام قابل تعریف تھا۔

کابل میں تباہی کی خبریں وائسرائے ہند آک لینڈ کو پریشان کر رہی تھیں۔ اس دوران ٹوری پارٹی نے انتخابات جیت کر نئی برطانوی حکومت بنالی۔ تب لارڈ آک لینڈ نے گورنر جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دے ڈالا۔ اسے اپنی غلط افغان پالیسی اور حکومت ہندوستان کے دیوالیہ پن کا احساس ہو چکا تھا۔ لارڈ ایلن برو ہندوستان کے نئے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

دسمبر میں کابل میں اتنی سخت برفباری ہوئی کہ پہاڑیاں اور قلعوں کی فصیلیں برف سے ڈھک گئیں۔ انڈین آرمی کے جوان سردی سے مرنے لگے۔ میک نیگٹن کو پریشانی تھی کہ تمام قلعے خالی کرنے اور سرداروں کو بھاری رقوم کی نقد ادائی کے باوجود انھیں خوراک، چارہ اور باربرداری کے جانور فراہم نہیں کیے گئے۔ اسی لیے ان کی روانگی کی تاریخ ۱۴ دسمبر خاموشی سے گزر گئی۔ انگریزوں کی کمزوری اور بے بسی دیکھ کر اکبر خان نے مزید توپوں اور یرغمالیوں کے مطالبات پیش کر دیے۔ اب میک نیگٹن موہن لال کشمیری اور نظام الدولہ کے ساتھ مل کر "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی سازشی پالیسی کے مطابق بیک وقت کئی منصوبوں پر غور کرنے لگا۔

لیڈی سیل

مرزا عطا لکھتا ہے "میک نیگٹن نے اکبر خان کے مخالف باغی سرداروں کو خط لکھ دیا کہ جو کوئی اس کا سر کاٹ کر لایا، اسے دس ہزار روپے کا انعام ملے گا۔ سرداروں نے یہ خط اکبر خان کو دکھایا جس نے اسے میک نیگٹن کی دھوکا بازی پر محمول کیا۔ چناں چہ اکبر خان نے میک نیگٹن کی منافقت بے نقاب کرنے کے لیے ایک چال چلی۔ اس نے اسے پیشکش کی کہ انگریز موسم بہار تک وہاں ٹھہر سکتے ہیں نیز شاہ شجاع بدستور بادشاہ رہے گا اگر اکبر خان اس کا وزیر بن جائے اور سارے اختیارات اسی کے ہاتھ ہوں۔ نیز وہ امین اللہ خان لغاری کا سر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی ادا کردے گا' اگر اس کام کے لیے اسے تین لاکھ روپے ادا کیے جائیں۔

اگرچہ میک نیگٹن کو اس منصوبے پر شک تھا لیکن کسی فوجی کمک سے ناامید ہو کر اس نے انگریز قوم کی باعزت پسپائی کے لیے یہ منصوبہ قبول کر لیا۔ دراصل میک نیگٹن کی طرف سے یہ اقدام ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا۔ یہ تحریری معاہدہ میک نیگٹن کی دھوکا بازی کا کھلا ثبوت ثابت ہوا۔ اس نے یہ دستاویز امین اللہ خان لوگری کو دکھائی اور افغان سرداروں کو میک نیگٹن کی بے وفائی سے خبردار کیا۔ پھر معاہدے کی تفصیلات طے کرنے کے لیے میک نیگٹن کو ملاقات کی دعوت دی۔

میک نیگٹن اس جال میں پھنس گیا۔ وفادار افغان فوجی افسر حسن خان نے اُسے اس ملاقات کے مہلک نتائج سے خبردار کیا۔ لیکن تمام مشورے نظرانداز کرتے ہوئے وہ اپنی ذمے داری پر اکبر خان اور دوسرے افغان سرداروں سے ملاقات کرنے روانہ ہو گیا۔

میک نیگٹن کے ہمراہ محافظ دستے کے علاوہ صرف تین ساتھی' لارنس، ٹریور اور میکنزی تھے۔ جب کہ اکبر خان کے ساتھ اس کا سسر محمد خان غلزئی، سلطان جان بارک زئی اور امین اللہ خان لوگری کا چھوٹا بھائی آئے۔ جب یہ سب ایک پہاڑی ٹیلے کی چوٹی پر بیٹھ گئے، تو کافی تعداد میں مزید افغان وہاں پہنچ گئے۔ لارنس' میک نیگٹن کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے افغانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر اعتراض کیا۔ فوراً ہی محمد شاہ خان غلزئی اسے گھسیٹ کر لے گیا اور کہنے لگا: ''میرے ساتھ چلو اگر تمھیں زندگی عزیز ہے۔'' لارنس کہتا ہے کہ میں نے مڑ کر دیکھا تو میک نیگٹن کو زمین پر لیٹے ہوئے پایا۔ اکبر خان نے اس کے دونوں ہاتھ جکڑ رکھے تھے۔ پریشانی اور دہشت اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

افغان مورخ مرزا عطا بیان کرتا ہے: ''اکبر خان نے چلا کر میک نیگٹن سے کہا: تم ایک عظیم بادشاہ کے وزیر اور شاندار فوج کے سربراہ ہو۔ ممتاز غیرملکی شخصیات تمھارے علم اور کمالات کو خراج تحسین پیش کرتی ہیں۔ لیکن میں تمھیں ایک احمق سمجھتا ہوں جس کے وعدے پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ جس کی تحریر سے دھوکا اور فریب جھلکتا ہے۔ بے وفا، مکار شخص! تم اپنے معاہدے سے اتنی جلد پھر گئے؟ تم سمجھتے ہو، ہم تمھاری خاطر ایک دوسرے کو تباہ کریں گے۔ تجھے شرم آنی چاہیے۔ تم ایک مضحکہ خیز آدمی ہو۔ میرا ارادہ تھا تمھیں بحفاظت کابل سے ہندوستان روانہ کروں لیکن تمھارا منصوبہ مجھے قتل کرانے کا تھا۔ تمھارا دماغ سیاہ دھوکیں اور فضول تصورات سے بھرا ہوا ہے۔ اب بہتر ہے میرے ساتھ کابل شہر کے اندر چلو۔''

دہشت زدہ میک نیگٹن نے عقاب کی گرفت سے کبوتر کے مانند پھڑپھڑا کر بچ نکلنا چاہا لیکن اکبر خان نے اپنی پیاری تلوار نکالی اور اس کا سر کاٹ ڈالا۔ پھر باؤلے کتے کی طرح لاش کے اعضا کاٹ ڈالے۔ کیپٹن ٹریور کو سلطان جان نے قتل کر دیا۔ لارنس اور میکنزی کو گرفتار کر لیا گیا جونہی تشدد کا یہ سلسلہ شروع ہوا میک نیگٹن کے محافظ دستے کے سوار سپاہی دم دبا کر بھاگ گئے۔ انھوں نے اپنے افسروں کو بچانے کی کوشش تک نہ کی اور دور ہی چھاؤنی سے کمک بھیجی اگرچہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مقامِ واردات بالکل قریب تھا۔

بعدازاں میک نیگٹن اور ٹریور کے بھڑ، سر اور ہیٹ عام نمائش کے لیے لٹکا دیے گئے۔ افغان اپنی فتح کا جشن منانے لگے۔ لیڈی میک نیگٹن اپنے شوہر کی موت پوں ماتم کناں ہوئی: (ترجمہ)

دیارِ فرنگ کے محترم شہزادے
اس ملک میں رسوا کن موت منتظر تھی تمھاری
آ جاؤ تمھارے ساتھ خوش ہوں غربت میں
گداگری بہتر ہے ایسی بادشاہت سے
آج گلیوں کے کتے اور چوہے کھیل رہے ہیں
تمھارے سر کو گیند کی طرح ٹھوکریں لگا رہے ہیں
آج کابل میں تم خاک پر پڑے ہو
دھڑ بن سر اور سر بن تاج کے

۶ جنوری ۱۸۴۲ء کی صبح روانگی کا بگل بجا اور برطانوی فوج کی پسپائی شروع ہوئی۔ لارنس اور میکنزی کو برطانوی فوج کی واپسی میں مدد دینے کے لیے رہا کر دیا گیا۔ یہ مایوس، بے حوصلہ اور سہمے ہوئے فوجیوں کا ایک گروہ تھا جو محفوظ چھاؤنی سے نکل کر غیر یقینی انجام کی طرف روانہ ہوا۔ راستے ایک ایک فٹ برف میں دبے ہوئے تھے۔

پسپائی اختیار کرتی ہوئی فوج کو موتی مصائب، بھوک اور المناک حادثات کا سامنا رہا۔ انھیں خوراک اور بار برداری کے جانوروں کا انتظار تھا لیکن اکبر خان نے اس کے عوض باقی توپ خانے اور سارا خزانہ حوالے کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ لارنس کے بقول ''ایسا لگتا تھا کہ موت اور تباہی ہمارے انتظار میں ہے۔''

مولانا کشمیری رقم طراز ہے۔ (ترجمہ)

بدنصیبی کا مارا ہوا گروہ فرنگیاں
شدید ترین سردیاں میں برف کے طوفاں
نہ سورج میں گرمی نہ دریا میں آب
نہ کھانے کو روٹی نہ پینے کو آب
ٹھہرنا حماقت، بچ نکلنا ناممکن
نہ جنگ کا یارا، نہ امن کی امید

موہن لال کشمیری اور شاہ شجاع نے خبردار کیا کہ اس موسم میں انگریزوں کا چھاؤنی سے نکلنا اور سفر کرنا خودکشی کے مترادف ہے لیکن ان کے مشورے نظرانداز کر دیے گئے۔ برطانوی فوج کا پہلا کیمپ چھاؤنی سے سات میل دور بگرامی کے مقام پر تھا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے انگریز اپنے بیشتر سازوسامان، اسلحے اور خوراک سے محروم ہو گئے اور وہ سرد ترین رات انھوں نے بغیر خیموں کے گزاری۔ صبح تک بہت سے سپاہی منجمد ہو کر موت کا شکار ہو گئے۔ بہت سوں کے پاؤں اور ہاتھ کام کرنے سے جواب دے گئے۔ ہراول دستہ بغیر کسی بگل کے چل پڑا۔ نظم و ضبط بالکل ختم ہو چکا تھا۔

تبھی کئی افغان پہاڑوں سے اترے اور انھوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ اگلے دن وہ بغیر خوراک اور گولہ بارود کے درہ خورد کابل کے منہ پر پہنچے جہاں الفنسٹن نے فوج کو رکنے کا حکم دیا۔ اس طرح بدقسمت سپاہیوں اور ملازمین کو ایک رات بھوک، تھکان، شدید سردی اور برف سے مقابلہ کرنا پڑا۔ مسلح افغان اردگرد موجود تھے۔ وحشی بچانے پر قتل عام ناگزیر دکھائی دیتا تھا۔

اگلی صبح بڑی تعداد میں افغان جنگجو اور گھڑسوار کیمپ کے عقب میں جمع ہو گئے۔ لارنس اور میکنزی کو اکبر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

خان کے پاس مذاکرات کرنے بھیجا گیا ہے کہ وہ وعدے کے مطابق بحفاظت سفر کرنے کا موقع دے۔ اکبر خان نے اتفاق کیا کہ اگر الفنسٹن اور میکموری یرغمال بن جائیں تو وہ درے میں سفر کے دوران غلزئی قبائل سے تحفظ فراہم کرے گا۔ لیکن غلزئی قبائل نے شب خون مارنے کی پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔ جونہی ہراول دستہ درے کے اندر دور تک گیا اس پر بلندی سے شدید فائرنگ شروع ہو گئی۔ آدمی گرنے لگے۔ اس قتل میں تقریباً پانچ سو باقاعدہ فوجی اور دو ہزار پانچ سو ملازمین مارے گئے۔

صرف ڈاکٹر برائیڈن بچ کر جلال آباد پہنچ سکا...

پانچ میل کا راستہ مردہ اور زخمی آدمیوں سے اٹ گیا۔ پہاڑوں سے افغان نیچے اترے، مردوں اور عورتوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور لوٹ مار شروع کر دی۔ خونخوار غلزئی جنگجو خون آلود خنجر باقی ماندہ برطانوی فوجیوں کے سامنے لہراتے گویا یہ کہتے: ''اپنے اردگرد بکھرے لاشوں کے ڈھیر دیکھو، بہت جلد تم بھی ان میں شامل ہو جاؤ گے۔ تم پھل کھانے کابل آئے تھے، اب تمھیں یہ کیسا لگا؟''

انگریز افسروں، فوجیوں اور ملازموں نے تیسری رات بھی برفباری کے طوفان میں درے کی چوٹی پر گزاری۔ صبح تک بہت سے سردی سے مر گئے۔ بہت سی عورتوں اور بچوں کو اغوا کر لیا گیا۔ برفباری افغانوں کے لیے نعمت ثابت ہوئی اور اس نے تلواروں سے زیادہ مہلک زخم لگائے۔ پسپائی کی پانچویں رات کیمپ پر مکمل مایوسی چھا گئی۔ آدمیوں کے چہروں سے گوشت چھلکوں کی طرح اترنے لگا۔ اس شام الفنسٹن نے تسلیم کر لیا کہ موت اس کے سپاہیوں کا مقدر ہے۔ اس نے تمام برطانوی خواتین، مردوں اور آٹھ بچوں کو اکبر خان کی تحویل میں دے دیا۔ لیڈی میکناٹن، لیڈی سیل اور اس کی بیٹی الیگزینڈرینا بھی ان میں شامل تھیں۔

انگریزوں کے لیے یہ انتہائی ذلت کی بات تھی کہ انھیں اپنی عورتیں اور بچے افغانوں کے سپرد کرنے پڑے۔ اس کے برعکس برطانوی خواتین کی حفاظت افغانوں کے لیے عزت اور بہادری کی علامت تھی۔

اکبر خان نے انھیں گرم کپڑے مہیا کیے، حرارت والی جگہ پر رکھا اور انتہائی مہلک سردی سے انھیں بچا لیا۔ اس لحاظ سے افغانوں کا جذبۂ رحم اور مہمان نوازی قابل تعریف ہے۔ وہ سخت لڑائی کے بعد مصیبت میں مبتلا کمزور افراد کی اپنے افراد خانہ کے مانند مدد کرتے تھے۔

پسپائی کا سفر جاری رکھنے والوں کے لیے دہشت اور ہلاکت کا کھیل ختم نہیں ہوا۔ ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء تک کابل کی فوج کا کوئی سپاہی باقی نہیں بچا۔ سیوجانسن

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے مطابق: "ہم میں سے ہر کوئی سمجھتا تھا کہ وہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ سردی، بھوک یا دشمن کے ہاتھوں اس کی موت یقینی ہے۔" تاہم سردی کے ڈسے اور برفباری سے ادھ موئے لوگوں کے لیے درہ تیزین میں ایک اور شب خون تیار تھا۔ دشمن مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔ برطانوی فوج کے کمانڈر نے نہ جانے کس حکمت کے تحت فائر کا جواب نہ دینے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ اس طرح دشمن نے بغیر مزاحمت کے قتل عام جاری رکھا۔ درہ تیزین میں افغانوں نے ۵۰۰ افراد کو لوٹا، ان کے کپڑے اتارے اور انھیں فاقہ کشی اور سردی سے مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

اسی دن افغانوں نے جنرل ولیم کیتھ الفنسٹن کو قیدی بنا لیا۔ وہ افغانوں کی قید ہی میں تھا کہ ۲۳/ اپریل ۱۸۴۲ء کو چل بسا۔

۱۳/ جنوری ۱۸۴۲ء کی رات زندہ بچ جانے والے ۸۰ افسر اور جوان گندا ماک پہاڑی کی چوٹی پر افغان دشمنوں میں گھر گئے۔ ان کا تعلق شیلٹن کی ۴۴ پیادہ رجمنٹ سے تھا۔ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جب کہ ان کے پاس صرف تین بندوقیں اور بارود کے دو راؤنڈ تھے۔ پھر بھی انھوں نے اپنی آن کی خاطر آخری مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ مربع شکل میں منظم ہوئے اور کئی مرتبہ افغانوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ گولیاں ختم ہونے کے بعد سنگینوں سے لڑائی جاری رکھی۔

آخر سب ایک ایک کر کے ذبح ہوئے۔ افغان صرف نو آدمیوں کو قیدی بنا سکے۔ کابل سے پسپا ہونے والی فوج سے صرف ڈاکٹر برائیڈن جان بچا کر جلال آباد پہنچ سکا۔ خوفزدہ اور بدحواس ڈاکٹر جلال آباد قلعے کے نزدیک اپنے زخمی گھوڑے سے گرنے ہی والا تھا جب قلعے کے برج سے ایک افسر نے اسے دیکھ لیا۔ فوراً اس کی مدد کے واسطے آدمی پہنچ گئے۔

برطانوی انڈین آرمی کی شکست اور تباہی ایک غیر معمولی واقعہ تھا اور افغان مزاحمت کاروں کے لیے ایک معجزانہ فتح۔ ایک نوآبادیاتی طاقت کے عروج پر اس طرح کی ذلت آمیز شکست انوکھا اور سبق آموز تاریخی سانحہ ثابت ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ۲۱ ہزار برطانوی فوجی افغانستان گئے اور ان میں سے گنتی کے چند افراد ہی واپس ہندوستان آ سکے۔

افغانستان سے انگریزوں کے جانے کے بعد شاہ شجاع نے تبدیل شدہ صورت حال میں افغان سیاست اور قبائلی کشمکش کو بڑی مہارت اور بصیرت سے اپنے حق میں موڑ لیا اور امین اللہ خان لغاری اور نواب زمان خان بارک زئی کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ ممکن تھا کہ وہ طویل عرصے تک افغانستان پر حکومت کرتا لیکن اس کے منہ بولے بیٹے اور نواب زمان خان بارک زئی کے حقیقی بیٹے شجاع الدولہ بارک زئی نے اچانک مشتعل ہو کر شاہ شجاع کو قتل کر دیا۔

اس کے بعد امیر دوست محمد کو ہندوستان سے رہا کر دیا گیا۔ اس نے اپریل ۱۸۴۳ء میں افغانستان کی حکومت دوبارہ سنبھالی۔ ۱۸۶۳ء میں اپنی موت تک افغانستان کا طاقتور ترین حکمران رہا۔ غیرملکی طاقتوں کی طرف سے افغانستان پر قبضے اور حکومت کی تاریخ بار بار دہرائی جا رہی ہے لیکن تاریخ ہر بار وہی سبق سکھا رہی ہے کہ افغانستان پر قبضہ یا حکومت کرنا آسان کام نہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تازہ افسانہ

انسان کے مقدر میں لکھا جا چکا

پہلا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھلنے والی کھڑکیوں پر ادھر پردے پڑے تھے۔

"میں تو کانفرنس ہال سے نکل اپنے کمرے میں ایک فائل لینے گیا جب شعلے بلند ہوتے دیکھے۔ الٹے پاؤں جا کر بتایا تو بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ سیڑھیوں کی طرف بھاگے اور کوئی لفٹ کی طرف۔ دو منزلیں نیچے شعلے خوفناک اژدھوں کی طرح زبانیں لہراتے اوپر اٹھ رہے تھے۔ واپسی کا تو کہیں راستہ ہی نہ تھا۔ نیچے سڑک پر لوگوں کے ٹھٹھ کھڑے آگ کا طوفان دیکھ رہے تھے۔ ہاں فریدہ، ابا جی کو ابھی کچھ مت بتانا" اور فون کٹ گیا۔

ابا جی کو تو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ فریدہ دو جملوں سے سہمی بیٹھی پاگلوں کی طرح آنگن میں دوڑی۔ ۸۰ سالہ بزرگ جو عمر کے مطابق قدرے صحت مند اور ذہنی طور پر مستعد بھی تھے، کمرے میں اونگھ کی سی کیفیت میں بہو کے کرلانے پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور باہر نکل آئے۔

بہو نے شوہر کی ہدایت کے برعکس سب کچھ پل بھر میں ہی اگل دیا۔ "خدا رحم کرے۔" انھوں نے گہری آہ بھری اور سر جھکا لیا۔

فریدہ کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا کرے! دونوں بیٹوں کو کیسے فون کرتی کہ نمبر بار بار بھول جاتی۔ پھر گاڑی میں بیٹھی۔ ہاتھ کانپتے اور گاڑی اسٹارٹ ہو کر بند ہو ہو جاتی۔

موبائل کی بیپ نے پھر متوجہ کیا۔ اضطراری حالت میں کان سے لگایا تو شور اور گھبرائی ہوئی واضح آوازوں کے ساتھ اب وہ پھر بول رہا تھا۔

"فائر بریگیڈ ابھی تک نہیں پہنچا۔ فریدہ مجھے امید نہیں کہ میں زندہ بچوں گا اور تم لوگوں کو دیکھوں گا۔" اور فون بند ہو گیا۔

اس نے چیخ ماری۔ حواس باختہ پہلے گاڑی سے نکلی پھر اس میں بیٹھی، پھر اتری، پھر بیٹھی۔ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کرے کیا؟ اور پھر کار گولی کی طرح اڑاتی جائے وقوعہ پہنچ گئی۔

عمارت کے باہر خلقت امڈ آئی تھی۔ شعلے پھنکاریں مارتے بلند ہوتے جا رہے تھے۔ نویں منزل پر وہ چکر کاٹ رہا تھا۔ کبھی برآمدے اور کبھی اپنے کمرے میں۔ لوگ ماہی بے آب کی طرح بھاگتے پھر رہے تھے۔ آگ کیسے لگی؟ سوکھے کانپتے ہونٹوں پر یہی سوال تھا۔ ہراساں اور موت کے خوف سے پھٹی آنکھوں میں جواب بھی عیاں تھے کہ شارٹ سرکٹ ہونے سے وہ چند تفصیل اور بھی بھاری آوازیں بھی تھیں۔ "ارے اپنے کرتوتوں پر پردے نہیں ڈالنے ان حکمرانوں نے، جہاں ریکارڈ دھرا تھا وہاں ہیرا پھیریوں کے پلندے بھی تھے۔"

اس نے کھڑکی سے باہر سڑک کی طرف دیکھا سروں کا جیسے سمندر موجزن تھا۔ یہ تو محشر کا سا سماں لگتا تھا۔ آوازوں کا واویلا تھا اور بیچ بیچ میں کوئی کرتے ہاتھ۔ اس نے پھر نیچے نگاہ کی اور سوچا "اگر یہاں سے چھلانگ ماروں تو؟" کاش سرکس والوں کی طرح کوئی جال بچھا ہوتا۔ اس نے چیخ کر کہنا چاہا۔

"ارے ہے کوئی جو مجھے بچائے!" مگر وہاں تو قیامت کا سماں تھا، کسی کو دوسرے کا ہوش نہ تھا۔ اس نے ہجوم میں اپنے بیٹوں بیوی کو دیکھنا چاہا مگر نہ دیکھ سکا۔ آنکھوں کے سامنے ترمرے سے ناچنے لگے۔ سر چکرانے سے لگا لیا۔

آج صبح کا منظر جھماکے سے آنکھوں کے سامنے تیرنے لگا۔ کئی دنوں سے وہ رضائی خریدنے کے لیے ضد کر رہا تھا۔

"ارے اب کون سا زمانہ ہے رضائی والا! بیڈروم گندہ لگتا ہے۔ آج اسٹور سے اچھی کا موٹا کمبل لے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

آؤں گی۔"

بیوی کے اس اعتراض پر اُس نے نرمی سے کہا تھا "فریدہ مجھے کمبل میں ٹھنڈ لگتی ہے۔"

اس کی ضد پر رضائی بنی اور اُس پر چڑھانے کے لیے کور وہ خود خرید لایا۔ بالکل سفید! بیوی نے دیکھا تو ناک بھوں چڑھائی اور کہا "اسے لانے کی کیا تُک تھی؟" وہ جھنجلا رہی تھی۔

"ارے کچھ سنا بھی کرو۔ ہولے چلی جاتی ہو۔ سفید کور سے رضائی جلد گندی نہیں ہوتی۔"

وہ پھر جتا کر بولا "شہدوں جیسی حرکتیں چھوڑ دو اب! دولت کے انبار لگا لیے تم نے۔ گندی ہوئی تو اگلے سال نئی بن جائے گی۔ اور اگر کور لانا بھی تھا تو کوئی رنگدار لاتے۔"

آج صبح ناشتے کی میز پر وہ دوٹوک لہجے میں بولی تھی "میں نے منحوس ماری رضائی تو کام والی کو دے دی ہے۔ زہر لگتی ہے مجھے! خدا کی قسم سوتے میں لگتا تھا جیسے کفن پہنے لیٹے ہو۔ میں آج ہی اپنے اسٹور سے ویلوٹین کا کمبل لائی ہوں۔"

یکدم اُسے محسوس ہوا جیسے سانس سینے میں رکنے لگی ہے۔ آنکھوں کے سامنے ننھے پتلے سے رقص کرنے لگے۔ پھر اللہ اکبر کے اور درود کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا نظر آتا ہے۔ اس نے بھی فی النور آیات کا ورد شروع کر دیا۔ شاید کہیں کوئی معجزہ یا کوئی انہونی ہو جائے۔ ایسا ممکن ہے؟ خدا کے ہاں تو سبھی امکانات ہیں۔ آگ کو گل و گلزار بنانے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ لیکن کس کے لیے؟ اندر سے جیسے طنزاً پوچھا گیا۔

اس نے نگاہوں کا رُخ اندر کے مناظر کی طرف پھیرا۔ اُسے لگا جیسے پنجروں میں جیسے پرندے پھڑپھڑاتے اور لوہے کی سلاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنے سر زخمی کر لیتے ہیں، کچھ ایسی ہی کیفیت وہاں بھی تھی.... رونا پیٹنا، بھگدڑ، شور۔ فائر بریگیڈ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔

"وہ پہنچے گا بھی نہیں۔" قریشی صاحب کی آواز جیسے کہیں کسی کنوئیں سے آئی۔ "یہاں تو سب چور ہیں، کوئی بڑا چور کوئی چھوٹا چور۔ ارے کیا پتا یہ آگ بھی خود لگائی ہو کسی ریکارڈ کو تلف کرنا ہو۔ کیا بجلی کا پھڑوں کا یہاں چھت پر آنا مشکل تھا۔ دیکھو والے کہاں ہیں؟ ارے غریب کوئی انسان تھوڑی ہیں، کیڑے مکوڑے ہیں، ابھی مسل دیے جائیں گے۔"

اس کا دل گھڑی کے پنڈولم کی طرح ڈولتا۔ اس نے باہر دیکھا سورج کی روشنی میں تابانی تھی۔ آسمان صاف تھا جس پر کہیں کہیں اڑتے پرندے اس قیامت سے بے خبر تھے جو یہاں اس بلند و بالا عمارت میں انسانوں پر ٹوٹ پڑی تھی۔

اس نے کمرے میں موجود ان لوگوں کو دیکھا جو یہاں بیٹھے دن کے نو دس گھنٹے گزارتے تھے۔ مستقبل کے منصوبوں پر باتیں کرتے۔ دکھ سکھ کی کتھا کہہ ایک دوسرے کو سناتے۔ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کا عمل بھی جاری رہتا۔ چغلیوں اور حسد جیسے جذبوں کی بھی فراوانی تھی۔ ہمدردی اور محبتیں بھی تھیں۔ اور اب سب بھسم ہونے جا رہا تھا۔

اچانک کونے میں رکھی اس کی الماری کے شیشے والا پٹ دھڑ سے کھلا۔ اس میں سے ایک فائل نکل فرش پر آ گری۔ یہ اُس کی ذاتی فائل تھی جس میں پلاٹ کے کاغذات تھے۔ وہ اسے ایک آدھ دن میں گھر لے جانے والا تھا۔ دو کنال کے اس پلاٹ کے حصول کے لیے اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے اپنی جان لڑا دی تھی۔ ہر جھنیاسے گھٹیا حربہ استعمال کیا تھا۔ دفتر کے ساتھیوں سے بھی پردہ رکھا۔ جب سے یہ معاملہ نپٹا وہ بہت خوش تھا۔ ہواؤں میں اڑتا پھرتا تھا۔

ابا جی ابھی دنوں بیٹے کے لیے آئے تو لاکھ انہیں کچھ نہ بتانے کی حکمت عملی کے باوجود اس کی زبان سے بہت کچھ نکل گیا۔ خوشی سنبھالے میں نہ آ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح ابا جی نے اس بار بھی بیٹے سے گریز کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔ ''جہنم کا ایندھن اکٹھا ہو رہا ہے۔'' وہ بس اتنا ہی بولے۔

اس یاد اور منظر نے گویا سارا ماضی سامنے لا کھڑا کیا۔ اپنے والد توصیف احمد کا ماضی! اپنا ماضی! پاکستان بننے کی کہانی جو اس کے گھر میں ہر دوسرے دن دہرائی جاتی۔ جب بھی وہ اس کا بڑا بھائی قاسم اور بہنیں یہ کہانی سنانے کا کہتیں والد اسے نئے رنگ اور انداز میں سنانے لگتے۔ وہی کہانی اس وقت کانوں میں گونجنے لگی۔

توصیف احمد جب چاندنی چوک دہلی کی تنگ گلی والے گھر سے بے سروسامانی کی حالت میں گھر والوں کے ساتھ نکلے تب ان کی عمر یہی کوئی تیرہ چودہ سال ہو گی۔ خاندان نچلے متوسط طبقے سے تعلق کے باوجود علم دوست اور سیاست میں متحرک تھا۔ تحریک خلافت کے دوران توصیف احمد کی دادی نے کلائی میں پہنی ہوئی دو طلائی چوڑیاں چندے میں دی تھیں۔ ہجرت میں خاندان جن صعوبتوں اور کٹھنائیوں سے گزرا، وہ ان کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ ان سب کو بتاتے بھی!

گھر، گلیاں، دوست، ساتھی سب کچھ چھٹنے کے باوجود ایک نئی دنیا میں داخل ہونے کا تجربہ اگرچہ بہت تکلیف دہ تھا تاہم اس کے ساتھ خوابوں اور آرزوؤں کی تمام ڈوریاں تھیں جن کے خواب ان کے گھر والے دیکھتے اور دکھاتے تھے۔

ادھر ادھر چھوٹے موٹے شہروں میں سال بتاتے بیتے رہتے رہتے وہ بالآخر منٹگمری (ساہیوال) جا بسے۔ جسے تیسے میٹرک کرنے کے بعد وہ ملازمت کرنے لگے۔

نئے ملک سے ان کی محبت بڑی والہانہ تھی۔ جب پہلا بیٹا پیدا ہوا تو شہد اس کے تالو سے چپکاتے ہوئے اقبال کے اشعار کا ورد کیا۔ ساتھ ہی اذان دی تو کیا اپنے آپ اور گھر والوں کو سناتے ہوئے کہا'' جانتے ہو محمد قاسم

ڈرائونا نتیجہ

چچا کی وجہ سے کمال اور ان کی اہلیہ کی ازدواجی زندگی ہمیشہ الجھنوں اور بدمزگی کا شکار رہی۔ چچا ہر بات میں ٹانگ اڑاتے، مہمانوں کے سامنے بدتمیزیاں کرتے، برے حلیے میں رہتے اور کھانے کی میز پر سب سے پہلے پہنچتے۔ ان کی فرمائشوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ ان کی وجہ سے کئی بار میاں بیوی میں طلاق ہوتے ہوتے رہ گئی۔

کئی برس بیتنے کے بعد آخرکار چچا کو ڈبل نمونیا ہو گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ سوئم ہو چکا تو کمال نے گہری سانس لے کر بیوی سے کہا: ''اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی، تو میں بیس سال تک تمھارے چچا کو اس گھر میں ہرگز برداشت نہیں کرتا۔''

''میرے چچا......؟'' بیوی پھٹی پھٹی آنکھوں سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''خدا کی پناہ! میں تو آج تک یہی سمجھتی رہی کہ وہ آپ کے چچا ہیں۔''

(حافظ اذان محی الدین۔ لاہور)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تم نے جس دھرتی پر جنم لیا ہے اس شاعر کا خواب
تھی۔ بڑے ہو کر اسے پڑھو گے تو جان لو گے کہ وہ کتنے
اونچے آدرشوں کا انسان تھا اور جس نے اس خواب کو تعبیر
دی۔ وہ بڑا باکمال انسان تھا، جس کو محسن بنانے والا۔ مگر
افسوس کہ خواب دیکھنے والے کو مہلت نصیب نہ ہوئی کہ وہ
تعبیر دیکھتا۔ نہ تعبیر دینے والے کو اتنی زندگی ملی کہ وہ اسے
سنوارتا اور رعنائی دیتا۔"

قناعت پسند، ایماندار، فرض شناس اور ملک کی محبت
میں چور چور والد توصیف احمد کے ہاں جب دوسرا بیٹا
ہوا تو انھوں نے اسے گود لیتے ہوئے دکھ بھرے لہجے
میں گویا اپنا کتھارسس کرتے ہوئے اسے کہا:

"میں جو کچھ دیکھتا اور پڑھتا ہوں، میرا کتنا مقدر ہوتا
ہے۔ پرانی نسل جس نے اسے جانوں سے بنایا تھا، اس
کی حفاظت کی صورت گری کرتے کرتے رزقِ خاک ہو
گئی۔ میری نسل اس کا تار و پود بکھرتے دیکھتی ہوئی
ہے۔ مجھے لگتا ہے ہم مہیب اندھیروں میں گھرے
ہیں۔ خون اور شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس کشتی
کے ناخداؤں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ میرے
بیٹے تم نے اسے سنوارنا ہے۔ اسے اپنانا ہے۔ اسی لیے
میں تیرا نام محافظ رکھ رہا ہوں۔"

گھر میں مزید بچوں کا اضافہ ہوا۔ ساتھ میں غربت کا
بھی۔ بڑا بیٹا قاسم حالات پر جھنجھلانے والا نوجوان
تھا۔ صالح باپ کی باتوں پر اکثر تذبذب ہوتا مگر ساتھ ہی
باپ کی اچھی تربیت کا رنگ بھی جھلکنے لگتا۔

وہ ذہین اور حساس تھا۔ اسکول جاتا، شام کو مزدوری
کرتا۔ جو کماتا ماں باپ کی ہتھیلی پر لا کر رکھتا۔ یوں شب
و روز کی جان ماری چھوٹے چھوٹے انعام اس کی جھولی
میں ڈالنے لگی۔ ایف اے کیا۔ پھر بی اے بھی کر لیا۔ البتہ

محافظ نے ایف اے کے بعد آگے پڑھنے سے انکار
کرتے ہوئے شہر کی راہ لی۔ ہوشیار تھا۔ تھوڑا عرصہ دھکے
کھانے کے بعد لاہور میں نوکری مل گئی۔ قاسم نے تعلیم
کے ساتھ ساتھ رئیل اسٹیٹ میں کسی کی شراکت داری
سے اپنی کاروباری ساکھ قائم کی۔ غربت کی دلدل سے ذرا
باہر نکلا تو کرائے کے گھر سے اپنے مکان میں منتقل ہوا۔

چونکہ غربت جھیل چکا تھا، اس کے سب رنگوں سے
آشنا تھا۔ لہٰذا اپنے جیسے لوگوں کے مسائل سمجھتا اور ان
کے ازالے کے لیے ہر ممکن حد تک وہ بھی کرتا۔ نیک نام
شہرت کا حامل تھا۔ باپ کی طرح گو صبر والا تو نہ تھا مگر
چیزوں کے روشن پہلو دیکھنے کا بھی تھوڑا بہت شعور رکھتا
تھا۔ ملک کے حالات پر جلنے اور کڑھنے کے ساتھ ساتھ
بیٹھے یہ بھی کہتا "دیکھو نوجوانوں کو عزم و حوصلے سے آگے
بڑھتے رہنا ہے۔ ابھی بہت اندھیرا ہے مگر کہیں روشنی بھی
انتظار میں ہے۔"

شہر بھر کا ایک تعلیم یافتہ شخص سیاست میں داخل ہوا
تھا۔ اس نے دیکھا وہ ایماندار اور پرعزم تھا۔ خواب
دیکھنے اور دکھانے والا تھا۔ قاسم اور دیگر جیالے اٹھے اور
انقلاب انقلاب کا نعرہ لگاتے اس راہنما کے گھر پہنچے۔
اور کہا "ہم آپ کے ساتھ ہیں اپنی پوری توانائیوں کے
ساتھ۔ آپ کے پیغام کو گلی گلی پہنچانے میں آپ کے
دست راست ہیں۔"

راہنما کی کرشماتی شخصیت نے قاسم کا دل موہ لیا۔
اس نے نوجوانوں کی پیٹھ تھپکی۔ ان کے جوشیلے خون کو
مزید گرما دیا اور کہا "آپ نوجوان ہی میرا سرمایہ ہیں۔
آپ نے ہی اس نظام کہن کو بدلنا ہے۔ آؤ میرے ہاتھ
مضبوط کرو۔ ان وڈیروں، جاگیرداروں، امیرزادوں
چوہدریوں، ہماری ہڈیاں چوسنے والوں کے خلاف ہم جہاد

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کریں گے۔"

ہواؤں کے دوش پر لہراتا وہ گھر آیا۔ توصیف احمد نے اس کی للکارتے ہارٹی آوازوں کو سنا تو اپنے ماضی میں جھانکا۔ اس ارض خدا کا جو حشر ہو رہا تھا، وہ دیکھ رہا تھا۔ جلنے کڑھنے، تڑپنے کے سوا اور پاس کیا تھا؟ گلی کی کیسے دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی بنے تھے وہ جانتا تھا۔

رسان سے بیٹے کو سمجھایا۔ "آپے میں رہو۔ میں بہت پڑھا لکھا تو نہیں، دانشور بھی نہیں مگر زمانہ شناس تو ہوں۔ بیٹے! سیاست کرنا بڑے لوگوں کا کھیل ہے۔ ہم جیسے غریب تو چیونٹیوں کی طرح ہیں جنھیں یہ استعمال کرنے کے بعد مسل ڈالتے ہیں۔ بہت مشکل سے اپنی چھت کے نیچے بیٹھے ہیں۔ ہمارے پیروں کو طویل فاصلہ پیدل چلنے کے بعد اب تھوڑی سی راحت نصیب ہوئی ہے۔ تم اب الٹے چکروں میں پڑ کر اسے ہم سے چھین لینا چاہتے ہو۔"

نوجوان خون زور سے جوش مارا اور بولا "پاکستان سے آپ کی محبت اتنی جلد دم توڑ گئی۔ اصل میں آپ سمجھ گئے ہیں کہ پیسا تو اوپر ایوانوں میں جاتا ہے۔ آپ کیوں گھبراتے ہیں؟ اگر یوں ہی مصلحتیں دامن گیر رہیں تو بارش نہیں برسے گی۔ ہمیں بارش کا پہلا قطرہ بننے دو۔"

باپ نے پھر سمجھایا "میرے بچے! میری محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مگر میں کیا کروں یہاں آپا دھاپی پڑی ہوئی ہے۔ کوئی اس زمین کے ساتھ مخلص نہیں۔ تم نے رزق حلال سے جو کمایا ہے، اسے مت گنواؤ۔ شاباش نے اچھا کیا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ ترقی ہو جائے گی۔ بیٹے رزق حلال کماؤ اور نیک نامی سے کام کرو۔"

لیکن قاسم پر جنون سوار تھا۔ اب توجہ ہٹ گئی تھی۔ کاروبار متاثر ہوا۔ دن رات کی بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ جس لیڈر کو شہر بلایا جا رہا ہے۔ پورے شہر کو اُس کی فلیکس سے سجایا جاتا۔ اس کے شایانِ شان انتظامات ہوتے۔ جلسے اور ریلیاں نکلتیں۔ گھر گھر اُس کا پیغام اور انقلاب کا مژدہ سنایا جا رہا تھا۔

پہلے مرحلے میں گاڑی گئی اور دوسرے میں گھر۔ ماں نے شور مچایا۔ باپ چپ تھا مگر اس کے پاس بہت دلاسے تھے۔ "فکر مت کریں۔ الیکشن ہونے کی دیر ہے۔ مجھے ٹکٹ مل جائے گا۔ مجھے وزارت ملے گی۔ گھر اور گاڑی بھی مل جائے گی۔"

"تو بھی ان کی طرح لوٹ کھسوٹ کے عزائم رکھتا ہے۔" باپ چیخا۔

"ہرگز نہیں ابا! ہماری حکومت بے گھروں کو گھر دے گی تو مجھ جیسا بے گھر ابھی چھت کے نیچے چلا جائے گا۔"

ملک میں انتخابات کی ہوائیں چلنے لگیں۔ ان ہواؤں کے جھکڑوں میں اس نے دیکھا، بہت سے چہرے جو پارٹیاں بدلتے اور کبھی ادھر لڑھکتے کبھی ادھر لڑھکنے میں کمال رکھتے تھے، وہ اس کی انقلابی ووٹ رکھنے والی پارٹی میں شامل ہوئے اور لیڈر کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر آئینی کارکن جیسے گم سم ہو گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے سے کہا:

"ہماری پارٹی بھی ایسی روایتی سی ہو گئی ہے۔ اس کی کسی سے نظریاتی وابستگی نہیں۔ جو پرانے لوگ تھے جنھوں نے اس کے ساتھ بہت سے خواب دیکھے تھے، وہ تو پیچھے دھکیل دیے گئے ہیں۔"

مخلص کارکنوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ گھر جاتا تو بیوی اور والدین کے طعنے سنتا۔ مگر باہر آتا تو نئی جان سے انتخابی مہم میں جت جاتا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھر ٹکٹوں کا مرحلہ آ گیا۔ اب پھر وہ دم بخود رہ گیا۔ وہ جس نے اپنا تن من دھن سب کچھ پارٹی کی نذر کیا تھا۔ جس نے لیڈر کی نوزائیدہ پارٹی کو اپنے علاقے میں اپنی محنت کے بوتے سے چلنے کے قابل بنایا تھا۔ جس نے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر اپنے لیڈر کا پیغام مکینوں تک پہنچایا تھا۔ دھوپ نہیں دیکھی اور نہ گرد آلود دن۔ جس نے اپنا کل اثاثہ داؤ پر لگا دیا۔ وہ کہیں بہت پیچھے کھڑا تھا اور ٹکٹ علاقے کے امیر آدمی کے ہاتھ میں رکھ دیا گیا۔

اس کے گالوں پر آنسو تھے، چہرے پر شرمندگی اور اشتعال۔ وہ گھر داخل ہوا۔ باپ نے کاٹ دار لہجے میں کہا تھا۔

"تو لے آئے ہو ٹکٹ؟"

اس نے چیختے ہوئے کہا تھا "میں اسے دیکھ لوں گا۔ وہ کیسے یہاں سے کامیاب ہوتا ہے؟ یہ میرا حلقہ ہے۔ یہاں میں نے کام کیا ہے۔ میں اسے عبرت ناک شکست دلواؤں گا تب لیڈر کو پتا چلے گا کہ ٹکٹ کسے دینا چاہیے تھا۔"

باپ نے تلخی سے کہا "خاموش رہو۔ وہ پیسہ پھینک کر ووٹ خریدے گا اور تم نے دیکھتے رہ جانا ہے۔ یہی المیہ ہے ہمارا۔"

معاذ ان دنوں گھر آیا ہوا تھا اور سب کچھ اس کے سامنے تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا "قاسم بھائی آپ بھی نرے احمق نکلے۔ میری طرف دیکھیے، مجھ سے سبق سیکھیے۔"

توصیف احمد نے ملامتی نظروں سے بیٹے کو گھورا اور کہا "میں کیسا بدقسمت ہوں۔ تم نے جو یہ حرام کھانا شروع کیا ہوا ہے، یہ تمہیں ہضم ہو جائے گا؟"

معاذ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ کہنے لگا "ابا جی ہم تو مینڈکیاں ہیں مگر مچھوں کی کہانیاں سنتی ہیں آپ نے۔"

ایک آہ توصیف احمد کے حلق سے نکل گئی۔

اور آج کچھ مینڈکیاں اور مینڈک تو گرفت میں آ گئے تھے۔ معاذ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسے ایک اور منظر یاد آ رہا تھا۔

ایک دن کھانے کی میز پر سب چاروں بچے بیوی سمیت بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے رب کریم کا شکر ادا کیا اور کہا "میں تو ایک فقیر تھا جو پچیس سال قبل ایف اے کی سند اور جیب میں چند سکوں کے ساتھ اس بڑے شہر میں آیا۔ تب ایک جونیئر کلرک کی سیٹ اور کرائے کا ایک کمرے والا گھر تھا۔ فریدہ بھاگوان تھی۔ میں نے پانچ مرلے کا پلاٹ اس کے نام پر لیا۔ پھر دوسرا لیا۔ اسے بیچا اور گھر بنایا۔ فوزیہ دنیا میں آئی تو اس جگہ کالونی میں دو کمرشل پلاٹ لیے۔ یہ بڑے مقدر والے نکلے۔ جو بھی دنیا میں آیا اسے میں نے دو دو تین پلاٹوں کا مالک بنا دیا۔ کچھ جعلی ناموں پر لیے، شکر ہے انتقال میں کوئی جھگڑا نہیں پڑا۔ دراصل پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ اسے پھینکو اور چیزوں کو پہیے لگوا دو۔"

اچانک شور مچا۔ ٹن ٹن گھنٹیاں بجیں۔ فائر بریگیڈ آ گیا ہے۔ شاید آگ بجھ جائے۔ شاید میں بچ جاؤں۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے آسمان کی طرف نگاہ ڈالی۔ یقیناً کہیں نا سپاسی بھی سامنے تھی۔ خدایا اگر تو مجھے مہلت دے تو میں تائب ہو جاؤں گا۔ وہ روہانسا ہو گیا تھا۔

ڈگر ڈگر قدموں کے شور میں آوازوں نے بتایا کہ آگ آٹھویں فلور تک پہنچ گئی ہے۔ فضا میں کہیں کلے کے ساتھ ساتھ ذہن کی آوازوں کا شور اتنا زیادہ تھا کہ کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ آخر وہ کمرے سے باہر نکلا۔ آگ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کسی آدم خور دیو کی طرح آدم بو آدم بو کی کہانی چہرتی چلی آرہی تھی۔

اُسے محسوس ہوا تھا جیسے چند فائلیں اپنی پوری طاقت سے کہیں ہواؤں میں اڑتی اُس کے منہ پر آ کر گری تھیں۔

"تم نے فلاں کی حق تلفی کی۔ اتنے زیادہ چکر چلائے۔ اور پلاٹ اپنے بیٹے کے نام کروایا۔ تم نے فلاں وقت فلاں کا حق مارا۔ جھوٹ بولے۔ غلط اندراج کیے۔ آوازیں تھیں کہ صورِ اسرافیل! کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔

"کیا کہیں معافی کی گنجائش ہے؟" اس نے دل کو ٹٹولا۔ توبہ کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ جہنم کی آگ تمہاری پیشوائی کے لیے بڑھ رہی ہے۔"

"میرے خدایا!" اضطراری کیفیت میں اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ بند آنکھوں نے ایک اور خوفناک منظر دکھایا تھا۔۔۔ موت کے بعد کا منظر۔

بوٹیاں کھاتے حاسد اور بدخواہ رشتے دار جو اس میٹرک پاس سینئر کلرک کی چغلیاں کھانے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ اس کا لالچی داماد جو ہمہ وقت جہیز سمیٹ کر اپنے گھر لے جانے کے چکر میں رہتا تھا۔ اب وہ اس کے سوئم پر بیٹھا اوا سے بیٹھا تھا کہ مارکیٹ کی فلاں دکان اسے ملنی چاہیے۔ بڑی بہو جو اسی خصلت اور قماش کی ہے۔ اس نے بھی آسمان سر پہ اٹھا رکھا تھا۔

"فلاں دکان ہماری ہے۔ فلاں پلاٹ میں نے لینا ہے۔ فلاں گھر مجھے ملنا چاہیے۔ یہ میرا ہے، وہ تیرا ہے۔ اندر باہر شور مچا ہوا تھا۔

وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔ کب آگ کے شعلے آئے کب پانی کا منہ زور ریلا آیا۔ کون اس کے دائیں ہاتھ تھا کون بائیں ہاتھ۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا

رات ڈھلے اس کی بیوی بیٹے اور اس کا باپ امدادی پارٹیوں کے ساتھ اوپر پہنچے۔ انہوں نے اودھ جلی، پانی سے تر اس کی لاش اٹھائی۔ توصیف احمد آنسوؤں کے آگے بند باندھتے ہوئے دل گیر آواز میں بولے:

"انسان بلاشبہ بہت خسارے میں ہے۔" ◆◆◆

بڑے لوگوں کی باتیں

☆۔ ذاتی لائبریری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور ذاتی لائبریری بے بہا نعمت۔ (ایجن)

☆۔ آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مذہب و اخلاق کی پابندی نہ کی جائے۔ (پوپ الیگزینڈر)

☆۔ ہر ناکامی کے بعد کامیابی حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ مایوس نہ ہوا جائے۔ (والٹیئر)

☆۔ دنیا میں استاد کا احترام کرنے والوں کی ہی عزت ہوتی ہے۔ (لیونا السانی)

☆۔ کتابیں انسان کی بہترین رفیق اور مونس ہیں۔ (ایمرسن)

☆۔ کامیابی کا سب سے بڑا راز خود اعتمادی ہے۔ (ایمرسن)

☆۔ اعتماد زندگی کی متحرک قوت ہے۔ (لیونا السانی)

(انس زاہد، لاہور)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیدل چلیے اور جوان رہیے

جوڑوں کے درد، سانس پھولنے اور موٹاپے سے نجات پانے کے تیر بہدف مشورے

چند

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اکثر افراد لڑکھڑاتی چال، کچھ چھوٹے چھوٹے قدموں سے اور کچھ اکڑ کر بے ڈھنگی سی چال چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ پروقار طریقے سے چلنا آسان بات نہیں۔ کیونکہ ہر قدم کے شروع اور اختتام پر رکنے اور آگے بڑھنے کا عمل جنم لیتا ہے اور اس عمل میں ''سو مختلف عضلات'' کام کرتے ہیں۔

انسانی چال میں بنیادی طور پر یکسانیت نہیں ہوتی۔ وجہ یہی ہے کہ چلنے میں توازن کے بدلتے تال میل کو برقرار رکھنا خاصا مشکل کام ہے۔ چلنے کے دوران ہمارا پانچ فٹ یا اس سے لمبا ڈھانچا اپنی بنیاد مستقل طور پر تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اس باعث چلنا معرکہ۔ بالکل اسی طرح مشکل ہوتا ہے جیسے بازی گر چھے فٹ اونچے پول پر ٹھوڑی کے بل کھڑا ہو۔

اس قسم کا کرتب سیکھنے اور انجام دینے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ بچہ کئی مہینوں میں چلنا سیکھتا ہے۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ مناسب انداز میں چلنا سیکھ نہیں پاتے اور بدلے میں اپنی پوری عمر خواہ مخواہ تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں۔

بہرحال چلنے کی میکانیت پر کافی سائنسی تحقیق ہو چکی۔ اسی لیے پچھلے چند عشروں کے دوران کسی معذوری کے سبب نہ چلنے والے افراد کے لیے ایسی ٹانگیں تیار کی جا چکی جن کی مدد سے وہ بآسانی چل سکتے ہیں۔ ایسے افراد مصنوعی ٹانگ سے بھی اپنی چال پُروقار اور رواں بنا سکتے ہیں۔ رواں اور مناسب چال کے لیے چند باتیں غور طلب ہیں اور اس میں بنیادی بات پاؤں پر وزن کی تقسیم ہے۔

ہر قدم پر یہ ضروری ہے کہ وزن پہلے ایڑی کی طرف آئے اور اس کے بعد اسی لمحے اسے پچھلے پاؤں کی انگلی جانب منتقل کیا جائے۔ اس طرح وزن پاؤں کے پنجوں سے ہوتا ہوا انگوٹھے تک جائے گا۔ اس عمل سے پاؤں کے زمین سے اٹھنے میں دھکیل ملتی ہے اور وہ جھولا کرسی کے مانند کام کرتا ہے۔ لہٰذا یوں پاؤں کے کسی حصے پر جسم کا پورا بوجھ نہیں پڑتا۔ چپٹے اور بڑے پاؤں والی چال کے مقابلے میں کم سے کم دباؤ اور جھٹکے لگتے ہیں۔

چلنے کے دوران گھٹنوں کی چپنیاں بالکل سامنے کے رخ ہونی چاہئیں۔ اس طرح گھٹنا اور ٹخنا ایک سیدھ میں ہونے سے ان کے جوڑ چلنے کے دوران آسانی سے حرکت کرتے ہیں۔ آپ نے بعض افراد کو سیدھا چلنے کے لیے ٹانگیں کھول کر چلتے دیکھا ہوگا۔ ایسی بے ڈھنگی چال گھٹنوں اور ٹخنوں کے جوڑوں پر بے جا بوجھ ڈالتی ہے۔

ٹخنے کا جوڑ کچھ ٹیڑھے زاویے پر ہوتا ہے' یعنی یہ کہ جب گھٹنے کا رخ سامنے کی طرف ہو تو پاؤں قدرے باہر کی طرف مڑتا ہے۔ اس قدرتی چال میں جوتوں کے بغیر پاؤں ۱۵ ڈگری کے زاویے اور اونچی ایڑی والا جوتا پہنے ہوئے اس سے قدرے کم زاویے پر ہوتا ہے۔ چنانچہ زیادہ اونچی ایڑی والے جوتے سے چلنے میں دقت ہوتی ہے۔

اگر پاؤں اس سے زیادہ مڑیں تو چپٹے پاؤں والی بے ڈھنگی چال بنتی ہے۔ نتیجے میں پیروں اور ٹخنوں کے اندرونی رخ والے رباط (Ligaments) پر غیر ضروری بوجھ پڑتا ہے۔ رباط عضلات بدن کو ہڈیوں کے ساتھ مضبوطی سے جوڑ کر رکھتے ہیں۔ انہی کی بدولت جسم کے عضلات اپنے صحیح مقام پر رہتے ہیں۔

چلنے کے دوران سر، کمر اور پیڑو سب ایک سیدھ میں ہونے چاہئیں۔ اس سے توازن قائم ہوتا ہے اور کھڑے ہونے میں دشواری نہیں ہوتی۔ یوں جسمانی یا ذہنی تناؤ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی جنم نہیں لیتا۔ چلتے ہوئے سر کو نہ تو زیادہ آگے اور نہ ہی پیچھے کی جانب جھکائیں۔ اس انداز سے چلنے کی کوشش کریں کہ آپ قد آور دکھائی دیں۔ خود کو ایک پتلی تصور کریں جسے ایک مرکزی تار کی مدد سے حرکت دی جا رہی ہو۔

اچھی چال کا ایک حتمی اور اہم راز یہ ہے کہ چلتے ہوئے خود کو قدرتی انداز میں اور پرسکون محسوس کریں۔
کھڑے ہونے کے بعد چلنا شروع کرتے وقت اپنے دھڑ کو مضبوط کر کے چلیے۔ کھڑے ہونے کی حالت سے آگے بڑھنے کے لیے اپنے دھڑ کو کولھوں سے تھوڑا سا آگے کی طرف جھکائیں تاکہ جسمانی وزن کا مرکز ثقل آگے پیروں کے بالکل سامنے ہو۔

اس غیر مستحکم وضع میں ہم منہ کے بل گر سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم پہلے اپنی ایک ٹانگ اور پھر دوسری کو حرکت دیتے ہیں۔ اس سے دوسرے جسم کے جھول ہوتے مرکز ثقل کو عارضی طور پر سہارا ملتا ہے۔ یکے بعد دیگرے اس عمل کو ایک پاؤں سے دوسرے پر منتقل کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ چلنے کے لیے جسم کو اوپر نیچے اچھالنے یا دبانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چلنا دراصل جسم کو توازن میں رکھتے ہوئے لڑکھڑانے کا دوسرا نام ہے۔

چلنے سے نہ صرف ہم ایک سے دوسرے مقام تک پہنچنے کے فوائد حاصل کرتے ہیں بلکہ اس سے جسمانی فائدے بھی ملتے ہیں۔ یہ صحت کے لیے بھی مفید ہے۔ مثال کے طور پر چلنے سے دوران خون میں اضافہ ہوتا ہے۔ چناںچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ چلنا دوران خون کو تیز کرنے کا بہترین محرک ہے۔

دور جدید میں خون کی سست رفتار گردش، معمولی مشقت سے سانس پھولنا، جوڑوں میں اکڑاؤ اور پٹھے تحلیل کرتے ڈھلتی عمر میں انسان کی علامات نہیں بلکہ ان کی وجہ ورزش کا فقدان ہے۔ چناںچہ چلنے کی روزانہ ورزش جوانی برقرار رکھنے اور تندرست و توانا رہنے کا سرچشمہ ہے۔

◆◆◆

سیاسی گداگر

بھکاریوں کی لغت میں جو شخص پانچ دس روپے مانگے، وہ بھکاری اور جو پانچ دس کروڑ مانگے، وہ زرداری کہلاتا ہے۔ سیاست دان غریبوں کو یہ کہہ کر کہ تمھیں امیروں سے بچائیں گے اور امیروں کو یہ کہہ کر، تمھیں غریبوں سے بچائیں گے، ووٹ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کولمبس جب سفر پر نکلا تو اس کے پلے کچھ نہ تھا۔ لوگ اس کے ساتھ تھے مگر کسی کو پتا نہ تھا کہ وہ انھیں کدھر لے جا رہا ہے۔ رقم وہ لوگوں سے مانگ کر لگا تھا۔ آج ایسے کولمبس کو انتخابی امیدوار کہتے ہیں۔

صاحب! الیکشن، پڑھائی اور ہاکی میں کامیابی کے لیے فل بیک ہونا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں راہنما مینڈکی کی طرح بڑھ رہے ہیں۔ ایک پشتو حکایت ہے: "ایک بزرگ کسی گاؤں سے گزرے۔ گاؤں والوں نے اچھا سلوک کیا تو انھوں نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ہاں ایک راہنما پیدا کر دے۔" اگلے گاؤں والوں نے برا سلوک کیا، تو بددعا دی کہ خدا آپ کے گھر گھر میں راہنما پیدا کرے۔" (ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی کتاب "جوک در جوک" سے)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دورانِ مطالعہ کچھ ایسی چونکا دینے والی مثبت اور منفی تہذیبی رویوں کی عکاسی کرتی، تاریخ کے ان چھپے گوشوں سے پردہ ہٹاتی دلچسپ معلومات کی حامل اور سبق آموز باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ ان میں سے بہت سی عام قارئین کی نظروں سے نہیں گزرتیں۔ جناب محسن فارانی نے قارئین اردو ڈائجسٹ کے لیے ان سوغاتوں کا انتخاب کیا ہے۔ پڑھیے اور داد دیجیے۔

جب بے نظیر بھٹو نے ایماندار جج کو چیف جسٹس نہ بنایا

حکمرانوں کے ذاتی مفاد عیاں کرتا تاریخِ پاکستان کا ایک تلخ واقعہ

محسن فارانی

جسٹس سعود جان

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جسٹس سعد سعود جان بہت ہی نفیس انسان اور جج تھے۔ جب جسٹس نسیم حسن شاہ سبکدوش ہوئے تو اس وقت سینئر ترین جج نامیاً سعد سعود جان تھے۔ بے نظیر انھیں ہی چیف جسٹس بنانا چاہتی تھیں۔ سعد سعود جان مجھے سپریم کورٹ میں جسٹس نسیم حسن شاہ کی الوداعی تقریب میں مل گئے۔ میں نے ان سے پنجابی میں پوچھا "پھر تیرا کی بن رہیا اے۔" (آپ کا کیا بنے گا؟)

کہنے لگے: میں نے وزیراعظم سے پوچھا ہے کہ اگر آپ مجھے چیف جسٹس بنا رہی ہیں تو میں اپنے اہل خانہ کو لاہور سے بلا لوں؟ کہنے لگیں: ہاں بلا لیں۔ میں نے سعد سے کہا اگر تمھاری تقریب ہے تو میں آج ٹھہر جاتا ہوں، کل شرکت کے بعد چلا جاؤں گا۔ وہ کہنے لگے کہ کچھ پتا نہیں، تم چلے ہی جاؤ۔ مگر میری ٹیم سے رابطہ رکھنا۔ اگر وہ جج آ رہی ہیں تو آ جانا۔ میں احتیاطاً کئی دن تک رک گیا۔ وہاں پہنچا تو پتا چلا سجاد علی شاہ چیف جسٹس بن رہے ہیں اور وہ گھر سے روانہ بھی ہو چکے۔

ہوا یہ کہ سعد جان حلف لینے کو بالکل تیار تھے، تبھی ان کے سامنے ایک فائل بھیج دی گئی کہ فلاں فلاں صاحب کو آپ سپریم کورٹ کے لیے بطور جج نامزد کر دیں۔ ان کے سامنے پہلے بھی فائل بھیجی گئی تھی جس پر انھوں نے لکھا تھا: My judges in line are doing well. (ہماری ترتیب سے میرے جج ٹھیک کام کر رہے ہیں۔)

سعد سعود جان نے اس پر ایسا ہی نوٹ لکھ کر فائل واپس بھیج دی جس پر بے نظیر نے انھیں چیف جسٹس نہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ (وہ اپنے احکامات بلا تامل ماننے والے جج کو لانا چاہتی تھیں) پھر اگلے جج نامیاً جسٹس عبدالقدیر چودھری تھے۔ ان سے کہا گیا تو انھوں نے بھی معذرت کر لی کہ میں سینئر نہیں ہوں۔ پھر اجمل میاں سے کہا گیا تو انھوں نے بھی کہا: "اگر میرے دو سینئر نہیں تو میں بھی نہیں۔" گویا انھوں نے بھی معذرت کر لی۔ اسی دوران پی پی پی کے شاہ صاحبان نے بی بی پر زور ڈال کر وہ جسٹس سجاد علی شاہ کو ترجیح دیں۔ چنانچہ انھیں چیف جسٹس بنا دیا گیا۔

جسٹس سجاد علی شاہ

بعد میں سعد سعود جان نے مجھے بتایا: "ایک دفعہ کسی تقریب میں بے نظیر بھٹو مجھے اتفاقاً ملیں تو ہاتھ جوڑ کر سندھی انداز سے سلام کیا اور کہنے لگیں: "جج صاحب! مجھ سے گناہ ہو گیا۔ مجھے معاف کر دو۔ میں سیدوں کے چکر میں آ گئی۔""

درحقیقت جنرل ضیاء الحق کے دور ہی میں ان کے ذہن میں یہ ڈال دیا گیا کہ عدلیہ اپنی ہونی چاہیے۔ لہٰذا بے نظیر بھٹو کے دور میں جب لاہور ہائی کورٹ میں تقرریاں ہونا شروع ہوئیں تو امیدوار کی واحد قابلیت پارٹی کا مخلص کارکن ہونا ٹھہری۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

(جسٹس آفتاب فرخ، لاہور ہائی کورٹ۔ "نئی بات" ۱۸ تا ۲۲ مئی ۲۰۱۲ء)

امریکا سے دوستی کا خواہشمند وزیراعظم

راقم ایک عالمی سراغرساں ادارے میں دو دہائیوں تک اہم عہدے پر فائز رہا۔ یہی وجہ تھی کہ شہید محترمہ بے نظیر بھٹو نے ۱۹۹۸ء میں لندن میں پی پی پی کے ایک اجلاس میں میرا تعارف یوں کروایا "مطلوب وڑائچ کسی بھی وکٹ سے کاجل اڑا لیتا ہے اور پتا بھی نہیں چلتا۔" انتخابات ۲۰۰۲ء کے بعد پاپا پا پیٹریاٹ وجود میں آئی تو محترمہ نے مجھے ایک خفیہ سیل کا انچارج بنا کر اسے تشکیل دینے کی ذمے داری سونپی۔

میں نے محترمہ کے ساتھ امریکی وزارت دفاع (پینٹاگون) اور وزارت خارجہ کے دورے کیے۔ پھر ان کی خواہش پر کے بعد دیگرے راجا پرویز اشرف اور مخدوم امین فہیم کو بھی امریکی عہدے داروں سے ملوانے امریکا لے گیا۔ ایک ملاقات میں پی پی پی کے اعلیٰ عہدیدار نے مدمقابل امریکی کو پیشکش کی کہ وہ امریکا کے لیے باقاعدہ کام کرنے کو تیار ہیں۔ بعدازاں متعلقہ امریکی عہدیدار نے مجھ سے کہا "مطلوب پاکستانی سیاست دان ہر وقت بکنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔"

ایک دفعہ مجھے راجا پرویز اشرف کو لے کر امریکی وزارت خارجہ جانے کا پروگرام بنا مگر موصوف کے پاس ویزا نہ تھا۔ میں نے وزارت خارجہ سے دعوت نامہ منگوایا اور راجا صاحب کے لیے ویزا حاصل کیا۔ تب راجا صاحب مجھ سے کہنے لگے "مطلوب! ہماری بھی لاٹری نکلوا دو۔" آج وہی سابق وزیراعظم پیپلز پارٹی کی جاسوسی کرنے پر امریکا محکمہ خارجہ کو احتجاجی مراسلہ ارسال کر رہے ہیں۔"

("کالم بعنوان "مطلوب وڑائچ"۔ "نوائے وقت" ۱۲ جولائی ۲۰۱۲ء)

قارئین! خود فیصلہ کریں کہ امریکی ایجنٹ پاپا پی پی کی اعلیٰ قیادت تھی یا ضیا الحق؟ پھر پی پی پی کے صحافتی کارندے کس منہ سے ضیا الحق پر امریکی ایجنٹ ہونے کا مسٹر بھٹو کو پھانسی لگانے کا الزام دھرتے ہیں! اگر امریکا نے ان کے سیاسی گرو کو پھانسی لگوائی تو پھر پی پی پی لیڈر شپ کی امریکی اعلیٰ حکام سے خفیہ ملاقاتیں اپنی آرا جیسے خفیہ معاہدے اور امریکی ایجنسی کیا ان کی سیاسی بدکرداری نہیں؟

جسٹس کارنیلیس

مسیحی چیف جسٹس کا اظہارِ حق

ایلون رابرٹ کارنیلیس ۱۹۶۰ء تک پاکستان کے چیف جسٹس رہے۔ اس سے پہلے ۱۹۵۰-۵۱ء میں وفاقی سیکرٹری قانون و محنت رہے تھے۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۹۱ء کو دنیا سے رخصت ہوئے۔ انھوں نے ایک مذاکرے میں اجتہاد کے حوالے سے محو گفتگو کی جس میں کہا "پاکستان نے قرارداد مقاصد منظور کر کے تاریخ اسلام میں عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا۔ جس آئین ساز اسمبلی نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

قرارداد مقاصد پاس کی وہ علامہ اقبال اور قائداعظم کی تعلیمات کے بہت قریب اور زیر اثر تھی۔ علامہ اقبال کے اجتہادات، نظریات، تصورات اور خیالات ابھی ذہنوں میں تازہ تھے۔ آئین ساز اسمبلی خود قائداعظم کی مرہون منت تھی جس کی راہنمائی کے لیے انھوں نے گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے خطاب میں راہنما اصول دیے۔ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی نے یہ قرارداد پاس کر کے عہد رسالت کے میثاق مدینہ کی یاد تازہ کر دی جو دنیا کی تاریخ میں پہلا تحریری آئین ہے۔ یہ آئین ریاست مدینہ کے تمام شہریوں مسلم و غیر مسلم کے اتفاق رائے سے بنا تھا۔"

("یادیں" تنویر ظہور۔ نوائے وقت ۲۵ ستمبر ۲۰۱۳ء)

مول استھان سے ملتان تک

ملتان کا قدیم نام یہاں بتایا جاتا ہے۔ ہندو راجاؤں کے ادوار میں یہ نام بھی بدلتا رہا مثلاً کشپ پور، ہنس پور، بھاگ پور، سانب پور، جس پور، تھاگ پور اور مول استھان کہلایا۔ جبکہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہاں ملی مانی یا مول نامی قوم آباد تھی جس سے یہ مول استھان اور پھر ملتان بن گیا۔ سرزمین ملتان کو تین عظیم بادشاہوں... سلطان محمود تغلق، سلطان بہلول لودھی اور احمد شاہ ابدالی کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ علاوہ ازیں اکبر کے نورتنوں میں سے ابوالفضل اور فیضی کا تعلق بھی ملتان کے مضافات سے تھا غالباً موجودہ رحیم یار خان سے۔

مغل شہزادہ جہاندار شاہ ۱۷۱۱ء میں ملتان کا گورنر بنا۔ یہاں وہ ایک مشہور طوائف، کنور لال مراثن کے عشق میں گرفتار ہوا۔ ایک سال بعد مارچ ۱۷۱۲ء میں شہنشاہ ہند بن گیا۔ بادشاہ سلامت نے پہلا کارنامہ یہ کیا کہ واقف کار طوائف کو دلی بلا کر شادی کر لی اور اس کے بھائی نعمت خاں مراثی کو ملتان کی گورنری بخش دی۔

۱۸۱۸ء میں سکھوں نے ملتان فتح کیا تو انھوں نے نواب مظفر خاں سدوزئی شہید کے ادنیٰ ملازم [illegible] کو ملتان کا حاکم بنا دیا جو اپنے باپ کی طرح نواب شہید کی جوتیاں اٹھاتا اور چلمیں بھرتا تھا۔

ملتان میں شاہ رکن عالم کا مقبرہ

مسلمانوں کی ملتان آمد سے پہلے یہاں سب سے مقدس "سورج مندر" اور "پرہلاد مندر" تھے جہاں سورج دیوتا اور آدیتہ دیوتا کے طلائی بت رکھے تھے۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ شہر "سونے کا گھر" (بیت الذہب) کہلانے لگا۔ جب محمد بن قاسم نے ملتان فتح کیا تو آدیتہ دیوتا کے توشہ خانے سے ۱۳۲۰۰ من سونا ملا۔ ہیرے جواہرات اس کے علاوہ تھے۔ ("ضرب سکندری" سکندر خان بلوچ۔ "نوائے وقت" ۲۵ ستمبر ۲۰۱۳ء)

شہباز شریف کی ذہانت

کراچی کی ایک عدالت میں نواز شریف کو پیش کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

گیا۔ نوجوان صحافی رفعت سعید دروازے بند ہونے سے پہلے اندر جانے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک بکتر بند گاڑی اندر داخل ہوئی۔ اس کا دروازہ کھلا نواز شریف باہر نکلے۔ ان کے رویے و کیفیت سے صاف پتا چلتا تھا کہ انھیں کچھ اندازہ نہیں وہ کہاں ہیں۔ ہکا بکا سے تھے۔ کبھی ادھر دیکھتے کبھی ادھر۔ انھیں طویل قید کے بعد دن کی روشنی اور کھلی ہوا ملی تھی۔

رفعت سعید نے اپنا مائیک ان کے سامنے کر دیا "میاں صاحب بولیے۔ میاں صاحب کچھ بولیے...." مگر وہ اس کیفیت میں نہ تھے کہ کچھ بول پاتے۔ مائیک ان کے سامنے ہی رہا پھر پولیس والے انھیں عدالت میں لے گئے۔ یہ ان کی پہلی پیشی تھی۔ اسی عدالت میں چند دن بعد شہباز شریف کو پیش کیا گیا۔ اب صحافیوں کو اندر جانے کی اجازت تھی۔ دیوار کے ساتھ کرسیوں پر شہباز شریف اور ان کے ساتھ سیف الرحمن بیٹھے تھے۔ سیف الرحمن رو رہا تھا زار و قطار۔ شہباز شریف ہمارے قریب ہی تھے ان سے کہا اسے سمجھائیے مرد بنے۔

شہباز شریف نے اسے ڈانٹا "آرام سے بیٹھو۔ چپ رہو۔" سیف الرحمن تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر جیسے ہی جج نے کرسی سنبھالی وہ کھڑا ہو گیا اور بولا "میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میرا کوئی قصور نہیں۔"

ایک بے حوصلہ آدمی کو جج نے تسلی دی: "آپ بیٹھیں آپ کو موقع دیا جائے گا۔" اس کی تکرار جاری رہی جج بار بار ٹوکتے بھی رہے۔

سیف الرحمن

انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت میں جہاز اغوا کرنے کا مقدمہ شروع ہوا۔ یہ عدالت گوجرانوالہ کی عمارتی گراؤنڈ کے قریب ایک عمارت میں قائم کی گئی۔ پہلی پیشی پر بی بی سی نے نواز شریف کی سیاسی زندگی کو ایک خاکہ میں نشر کیا اور باتوں کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ انسداد دہشت گردی کی عدالتیں قائم کرتے ہوئے کیا نواز شریف نے کبھی سوچا تھا کہ ایک دن انھیں بھی اس عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا؟ انسداد دہشت گردی کی عدالت کے جج رحمت حسین جعفری تھے۔ ان پر بڑا دباؤ تھا کہ نواز شریف کو پھانسی کی سزا دی جائے مگر وہ نہیں مانے۔ عمر قید البتہ دے دی تھی جسے چند سال بعد سپریم کورٹ نے کالعدم قرار دے دیا۔

("شورش دل" ادریس بختیار۔ "جنگ" ۹ جولائی ۲۰۱۳ء)

مغرب کے چار شیطان

"وہی زندگی قابل قدر ہے جو دوسروں کے کام آئے۔" یہ سنہرا مقولہ پچھلی صدی کے سب سے بڑے شیطان آئن اسٹائن کا ہے جس نے ایٹمی توانائی سے تباہ کاری کا طریقہ نکالا۔ یہ شیطان جرمن یہودی تھا۔ اتفاق دیکھیے کیمیائی ہتھیاروں کا موجد بھی جرمن یہودی فرٹز ہابر تھا۔ اس شیطان کو بھی نوبل انعام ملا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نوبل انعام شیطانوں کے لیے خاص ہے۔ نوبل انعام کا بانی الفریڈ نوبل خود ایک شیطان تھا جس نے ڈائنامائٹ ایجاد کیا۔ اس کا تعلق سویڈن سے تھا۔ فرٹز ہابر نے کیمیائی ہتھیاروں کا دفاع جن الفاظ میں کیا وہ بجائے خود "سنہرا مقولہ"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں۔ کہا: ”موت تو موت ہے چاہے کیمیائی ہتھیاروں سے ہو یا کسی اور سبب سے۔“

روس کے ایک شیطان میخائل کلاشنکوف نے اے کے ۴۷ رائفل بنائی جو اسی کے نام سے جانی گئی۔ یہ ایک سیکنڈ میں درجنوں افراد ہلاک کر سکتی ہے اور ۱۹۴۷ء میں اپنی ایجاد کے بعد سے کروڑوں انسانوں کو ہلاک کر چکی۔ اتفاق دیکھیے یہ تینوں مرد آگے پیچھے آئے۔ فرٹز ۱۸۶۸ء میں، البرٹ آئن اسٹائن ۱۸۷۹ء میں اور میخائل کلاشنکوف ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوا۔ ان کا پیشرو الفریڈ نوبل ۱۸۳۳ء میں نازل ہو چکا تھا۔ ان چار شیطانوں کی بدولت مرنے والوں کی گنتی ۵۰ کروڑ سے زیادہ ہی رہی ہو گی۔

(”وغیرہ وغیرہ“ عبداللہ طارق سہیل۔ ”نئی بات“ ۲۲ اگست ۲۰۱۴ء)

شاہی ضمیر جاگ اٹھا

ایک خلیجی عرب ملک کے حکمران کی نوعمر بیٹی کا ضمیر سچ کی آواز سن کر پکار اٹھا! فیس بک پر اس نے اپنے باپ کے نام جو پیغام بھیجا وہ ساری دنیا کے ذرائع ابلاغ میں شائع ہو چکا۔ وہ یہ تھا:

Sorry father! Our money is the cause of Egypts bloodshed.

(ابا جان معذرت! ہمارا سرمایہ مصر میں خونریزی کا سبب بن رہا ہے۔)

یہود کل مظلوم آج کے ظالم

۱۹۳۹ء تک دنیا میں سب سے زیادہ یہودی پولینڈ میں بستے تھے جہاں ان کی تعداد ۳۵ لاکھ تھی۔ وارسا شہر کی آبادی اس وقت گیارہ لاکھ تھی اور ان میں ساڑھے تین لاکھ یہودی تھے۔ ہٹلر کے دور میں پولینڈ کے ۳۵ لاکھ یہودیوں میں سے تیس لاکھ (بقول اسرائیلیوں کے) مار دیے گئے۔ ۱۹۴۴ء میں ہٹلر کی فوجیں پسپا ہونے لگیں تو انھوں نے وارسا شہر تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ پولینڈ میں ان کے خلاف بغاوت ہو گئی تھی۔ جرمنوں نے پورے شہر میں ڈائنامائٹ لگایا۔ شہر کے باہر توپیں گاڑیں۔ اپنے طیارے اڑائے اور

نظر بندی کیمپ میں مقید یہود

وارسا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ شہر کا ۸۰ فیصد حصہ زمین بوس ہو گیا۔ آٹھ لاکھ لوگ مارے گئے۔ صرف دو لاکھ زندہ بچے وہ بھی زخمی اور معذور تھے۔

جرمنوں کے حکم پر وارسا اور کراکوف کے یہودی اپنے گھروں، دکانوں اور ٹھیلوں پر ستارہ داؤد (سائن آف ڈیوڈ) لگانے کے پابند تھے۔ انھیں بازوؤں اور کپڑوں پر بھی یہ نشان لگانے کا حکم ملا۔ ہٹلر نے اس کے بعد انہی یہودیوں کی مدد سے وارسا شہر میں ۹ فٹ اونچا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

وقت چوڑی اور چودہ گز اونچی دیوار بنائی۔ اس دیوار پر شیشے کے ٹکڑے لگوا کر اسے ناقابلِ عبور بنا دیا گیا۔ پھر وارسا کے ساڑھے تین لاکھ یہودی اسی دیوار کے پیچھے دھکیلے گئے۔ یہ لوگ اپنے ہی شہر میں قیدی بنا کر تیزی سے مرنے لگے۔ انسان کو زندہ رہنے کے لیے روزانہ ۲۰۰۰ حرارے درکار ہوتے ہیں۔ جرمن انھیں صرف ۲۰۰ حرارے والی خوراک دینے لگے۔ یوں ایک لاکھ یہودی خوراک کی کمی سے ہلاک ہو گئے۔

یہودیوں کے لیے خصوصی کیمپ بھی بنائے گئے جہاں گیس چیمبر اور بجلی کی بھٹیاں نصب تھیں۔ یہودیوں کو دو دو ہزار کی تعداد میں ان گیس چیمبروں میں کھڑا کیا جاتا۔ جب گیس انھیں مار ڈالتی تو بعدازاں ان کی لاشیں بھٹیوں میں جلا دی جاتیں۔ کیمپوں میں ان لوگوں کو خصوصی پاجامے اور قمیصیں پہنائی گئیں۔ یہی وجہ ہے یہودی اب تک پاجاموں کے اس رنگ اور ڈیزائن سے نفرت کرتے ہیں۔ پولینڈ، آسٹریا اور جرمنی میں آج بھی وہ خصوصی کیمپ موجود ہیں۔ اسی لیے دنیا بھر کے یہودی زندگی میں کم از کم ایک بار پولینڈ ضرور آتے ہیں۔

۲۲ جولائی ۱۹۴۴ء کو پولینڈ نازیوں کے قبضے سے آزاد ہوا۔ وارسا کے صرف دس یہودی زندہ بچے جو یورپ کے دور دراز علاقوں میں پناہ گزین ہوئے یا انھیں کسی عیسائی یا مسلمان نے پناہ دی۔ وہ تہ خانوں میں چھپے رہے۔ انھیں چوہے بلیاں کھانے اور اپنے مردہ بہن بھائیوں کا گوشت بھی کھانا پڑا۔ وہ چار چار سال تہ خانوں، گٹروں اور زیرزمین سیوریج کے پائپوں میں چھپے رہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۴ء میں ہٹلر کی فوجیں پسپا ہونے لگیں اور پولش عوام بھی ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

("زیرو پوائنٹ" جاوید چودھری۔ "ایکسپریس" ۱۹ جولائی ۲۰۱۳ء)

بے نظیر قتل، یو این او مشن اور قاتلوں کے لمبے ہاتھ

ہیرالڈو موینوز ۲۰۰۹ء میں اقوامِ متحدہ کی طرف سے چلی کے سفیر تھے۔ حکومتِ پاکستان کی دعوت اور درخواست پر بے نظیر کے قتل کے ذمہ داروں کا کھوج لگانے پر مامور ہوئے۔ یہ وفد تین ارکان پر مشتمل تھا۔ دوسرے دو ارکان یہ تھے: پیٹر فٹزجیرالڈ (آئرلینڈ پولیس کے سابق سینئر افسر) اور مرزوقی دارسمن (انڈونیشیا کے سابق اٹارنی جنرل)۔ ہیرالڈو موینوز اپنی کتاب Getting Away with Murder (ایسا قتل جس میں قاتل صاف بچ گئے) کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"ابھی ہمارا وفد پاکستان کی سرزمین پر پہنچا بھی نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا کہ اسے دھمکیاں ملنے لگیں۔ یہ پتا نہ چل سکا کہ دھمکیاں کون اور کیوں دے رہا ہے۔ پہلے دن وزیرداخلہ رحمٰن ملک سے ملے تو انھوں نے فخریہ انداز میں بتایا وہ شبے میں چار افراد کو گرفتار کر چکے۔ انھوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ وفد کو ۳۰ صفحات پر پھیلی رپورٹ بھی پیش کر دی جس میں درج تھا کہ وفد کی آمد تک کن کن باتوں کا پتا چلایا جا چکا۔ حیرت کی بات ہے جو حکومت تفتیش کے اتنے مراحل سے گزر چکی اسے باہر سے تفتیش کے لیے ایک بین الاقوامی ٹیم منگوانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ارکان وفد کے ذہن میں یہ سوال بجا طور پر ابھرا کہ حکومت قاتلوں کو پکڑنے کی متمنی ہے یا اسے سنگین جرم پر پردہ ڈالنا چاہتی ہے؟"

مصنف نے لکھا کہ جب وفد نے سرکاری رپورٹ پر تکیہ کرنے کے بجائے اپنی تفتیش شروع کی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کوئی خفیہ آنکھ نہ صرف ان کی نقل و حرکت دیکھ رہی ہے بلکہ اس کی تفصیل دوسروں کو بھی بتاتی ہے۔ باورچی تک ان کے ایجنڈے سے واقف تھا۔ آخری لمحے ان کی پروازیں منسوخ کر دی جاتیں تاکہ وہ جن لوگوں سے ملنا چاہتے تھے ان سے نہ مل سکیں۔ ان پراسرار مشکلات کے باوجود وفد ۲۵۰ افراد کا انٹرویو لینے میں کامیاب رہا۔ ظاہر ہے وفد کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ مصنف نے یہ بھی لکھا کہ اگر وفد کے ذہن میں پہلے شک تھا کہ کوئی خفیہ ہاتھ حقائق کو چھپانا چاہتا ہے تو تفتیش نے اسے یقین میں بدل دیا۔ اسپتال کے ارباب بست و کشاد نے وفد کو قبر کشائی کا مشورہ دیا تو وفد نے رد کر دیا کیونکہ اس کی رائے میں پولیس نے جان بوجھ کر تفتیش کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

کتاب کی اشاعت پر کرسٹینا ولیم تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہے "اس کی اشاعت پاکستان میں جنرل مشرف پر مقدمہ چلانے میں استغاثہ کی مدد کرے گی۔"

کتاب ہمہ رنگ سوالوں سے بھری ہوئی ہے۔ جب قاتلانہ حملہ ہوا تو بی بی کی دوسری (Back-up) کار کیوں بہ سرعت جائے واردات سے بھاگ گئی؟ جب بے نظیر تقریر کر رہی تھیں تو ان کا ایک محافظ اسٹیج سے عجیب اشارے کیوں کرتا رہا؟ بے نظیر کے قتل کے چند روز بعد اسی محافظ کو کیوں قتل کر دیا گیا؟ مصنف نے وثوق سے لکھا کہ جن لوگوں نے ان کے سامنے گواہی دی، انھوں نے متضاد بیانات دیے اور وہ جھوٹ بولتے وقت گھبراہٹ کا شکار ہو جاتے۔ وفد نے جنرل مشرف کا یہ موقف ماننے سے انکار کر دیا کہ حکومت بیت اللہ محسود کی فون پر گفتگو کا ٹیپ رکھتی ہے جس میں قتل کرنے کا دعویٰ کیا گیا۔

مصنف نے کتاب کے آخر میں ایک ہسپانوی ڈرامے کا ذکر کیا جس میں ایک غیر مقبول آمر مطلق قتل ہوا تو ہر دیہاتی کہنے لگا کہ اسے گاؤں والوں نے مار ڈالا۔ مصنف کی رائے میں بے نظیر کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ تبصرہ نگاروں نے بجا طور پر بھاری توجہ اس بے اصول سمجھوتے این آر او کی طرف دلائی جس کے ذریعے امریکی و برطانوی حکومتوں نے مشرف اور بے نظیر کے درمیان صلح کروائی اور انھیں اقتدار میں برابر کا شریک بننے پر رضامند کر لیا۔ اس معاہدے پر دستخط کر کے گویا بے نظیر نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے۔ ("یورپ کی ڈائری" نسیم احمد باجوہ "دنیا" ۲۵ مارچ ۲۰۱۴ء)

◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مشورہ حاضر ہے

تندرستی فراہم کرنے والے تیر بہدف طبی مشورے

حکیم عبدالوحید سلیمانی

دو منٹ میں ہچکی دور

میں مانسہرہ کے نواحی علاقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے والد جن کی عمر لگ بھگ ستر سال ہے، پچھلے ۱۲ماہ سے ہچکی کا شکار ہیں۔ ہچکی ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ بہت سے ٹوٹکے اور علاج کرنے کی کوشش کی لیکن شفا نہ مل سکی۔ براہ مہربانی اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ہماری مدد کریں۔

(عبدالستار خان۔ بفہ)

ہچکی کا علاج بتانے سے پہلے اس کی وجوہ پیش ہیں تاکہ آپ کے ساتھ ساتھ دیگر قارئین بھی ان ہدایات پر عمل پیرا ہوں اور اس کیفیت تک نوبت ہی نہ پہنچے۔ تیز گرم، تیز ٹھنڈی یا تیز مرچ مصالحہ دار غذاؤں سے حتی الامکان اجتناب کیجیے۔ اسی طرح بعض اوقات زیادہ پیٹ بھر کر کھانا بھی باعث ہے۔ لہٰذا ان چند بے اعتدالیوں سے اجتناب کر کے اس آفت سے بچا جا سکتا ہے۔

ہچکی کے علاج کے سلسلے میں میرے والد محترم حکیم محمد عبداللہ نے ایک واقعہ اپنی کتاب خواص ہلدی میں لکھا ہے۔ وہ من و عن یہاں نقل کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے پوری امید ہے کہ آپ کے والد کو اس نسخے سے شفا ملے گی۔

ہلدی کا طلسمی ٹوٹکہ

یہ طلسمی ٹوٹکہ میرے ایک جواں مرگ عزیز دوست پنڈت کرشن کودت شرما کا عطا کردہ ہے۔ موصوف کے والد محترم بھی اپنے علاقے کے مشہور ویدوں میں سے تھے۔ ایک روز ان کے ہاں ایک مریض آیا جسے تین روز سے ہچکی لگ رہی تھی اور وہ شدت مرض سے نہایت بے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جیسن تھا۔ پنڈت کرشن صاحب کی والدہ محترمہ بھی آیورویدک سائنس کی عالمہ تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اشارتاً اپنے پتی کو سمجھایا کہ اس مریض کو بھی موٹی ہلدی چلم میں رکھ کر پلا دیں۔ وید جی نے ایسا ہی کیا اور دیکھتے دیکھتے مریض کی ہچکی کش والے دھوئیں کے ساتھ ہی اڑ گئی۔

پنڈت کرشن جی نے اس کے بعد بھی متعدد مرتبہ یہ ٹوٹکا آزمایا اور ہمیشہ کامیاب پایا۔ خود ہمارے چند احباب نے ٹوٹکا کو آزمایا ہے۔ انہوں نے بھی اسے مفید الاثر دیکھا۔ پورا نسخہ درج ذیل ہے:

ھوالشافی: پسی موٹی ہلدی دو ماشے کے قریب چلم میں رکھ کر پلائیں۔ یا سگریٹ کی طرح کاغذ میں لپیٹ کر اس کا دھواں کشید کرائیں۔ ان شاء اللہ شدید سے شدید ہچکی کا دورہ دو چار کش میں دور ہو جائے گا۔ سگریٹ بنا کر پلانے کی صورت میں بعض اوقات ہلدی آسانی سے نہیں جل سکتی۔ صرف کاغذ ہی جلتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں اگر ہلدی کے چھٹے حصے کے برابر قلمی شورہ بھی ملا لیا جائے تو ہلدی جلانے میں مدد ثابت ہوگا۔ چلم میں رکھ کر پلانا ہو تو قلمی شورہ ملانے کی ضرورت نہیں۔

کالنچ کا شکار بچہ

میرا بیٹا جس کی عمر ۹ سال ہے، کالنچ نکلنے کے مسئلے سے دوچار ہے۔ میں بلوچستان کے ایک پسماندہ علاقے میں رہتی ہوں اور یہاں علاج کی موثر سہولیات نہ ہونے کے باعث اس کا کوئی مستقل علاج نہیں کروا سکتی۔ اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ (آمنہ خالد۔ لسبیلہ)

آمنہ بیٹی یہ مرض عام طور پر بچوں میں ملتا ہے۔ بعض اوقات بڑی عمر میں بھی ہو جاتا ہے۔ شدید قبض یا مستقل پیچش رہنے سے مقعد کے عضلات ڈھیلے ہو جاتے ہیں وہ پھر خروج مقعد کا باعث بنتے ہیں۔ شروع میں تو کانچ اجابت کے وقت ہی نکلا کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ نوبت یہاں پہنچتی ہے کہ زور سے کھانسنے یا چھینکنے سے بھی نکل جاتی ہے۔ ذیل میں ایک دو آسان نسخے درج کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات شفا عطا کرنے والی ہے۔

☆..... پھٹکری اور مائیں (مازو سے مشابہ پھل جو بطور دوا استعمال ہوتا ہے) کو پانی میں جوش دے کر استنجا کروائیں۔ پھٹکری اور توتے کی راکھ کانچ پر لگا کر اندر داخل کر دیں۔

☆..... پھٹکری ۱ تولہ دو سیر پانی میں حل کر کے کسی کھلے برتن یا ٹب کے اندر ڈال مریض کو دس منٹ اس میں بٹھا دیں۔ ان شاء اللہ چند دنوں میں کانچ نکلنا بند ہو جائے گا۔

گرم غذاؤں اور زیادہ زور اور محنت کے کام سے بچیے۔ مریض کو نرم غذا کا استعمال کرنا چاہیے۔

چہرے پر چھائیاں

محترم حکیم صاحب! میری عمر ۲۲ سال ہے۔ اگلے چند ماہ میں شادی ہونے والی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر چھائیاں اور سیاہ داغ ہیں۔ وقتاً فوقتاً کیل مہاسے بھی نکلتے رہتے ہیں۔ رنگت صاف ہونے کے باوجود ان داغوں اور چھائیوں نے میرے چہرے کو بدنما بنا دیا ہے۔ کئی اقسام کی کریمیں استعمال کر چکی ہوں لیکن کامیابی نہیں ملی۔ براہ مہربانی کوئی آسان نسخہ بتا دیجیے۔

(بشریٰ صدیقی۔ کراچی)

بیٹی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات نہایت کریم ہے۔ آج کل آم کا موسم ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور آملوں کی فراوانی ہے۔ آم سے بننے والا ایک آسان چٹکلہ درج کر رہا ہوں۔ آپ آزمائیے۔ ان شاء اللہ آپ بھی اس کی صداقت کی قائل ہو جائیں گی۔

رات کے وقت آم اور جامن کی گٹھلی کا مغز پانی میں گھس کر لیپ بنائیں اور چہرہ پر لگا لیا کریں۔ صبح کے وقت نیم گرم پانی اور نیم کے صابن سے منہ دھولیں۔ چہرہ خشک ہو جانے پر عرق گلاب، لیموں اور گلیسرین کا محلول لگائیں۔ ان شاء اللہ چند دنوں میں تمام چھائیاں اور سیاہ داغ دور ہو جائیں گے۔

آنکھوں سے پانی آنا

میں درس نظامی کا طالب علم ہوں۔ دوران مطالعہ اکثر آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ اس باعث مطالعہ میں بہت دقت کا سامنا رہتا ہے۔ بار بار آنکھیں صاف کرنی پڑتی ہیں۔ مدرسے کا طالب علم ہونے کی وجہ سے مہنگا علاج نہیں کروا سکتا۔ کوئی آسان نسخہ بتائیے اللہ تعالیٰ روز محشر آپ کو اس کا اجر دے گا۔

(سلمان اقبال۔ لاہور)

سلمان! اللہ تعالیٰ آپ کے علمی ذوق و شوق اور علم میں اضافہ کرے۔ آنکھوں سے پانی بہنا ایک بڑا مرض ہے۔ عام طور پر لوگ اس کے لیے مختلف سرمے وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ مگر دراصل اس کا علاج دماغ کو تقویت دینے میں پوشیدہ ہے۔ یہ پانی دراصل دماغی کمزوری کے سبب ہی جاری ہوتا ہے۔ ازالے کے لیے ایک آسان سا نسخہ درج ہے۔ بنائیے، استعمال کیجیے اور دعاؤں میں یاد رکھیے۔

ھوالشافی: روزانہ بوقت صبح ۲۱ بادام کی گریاں پانی میں بھگو کر چبا لیں۔ مربہ آملہ و مربہ ہڑ ایک ایک دانہ صبح شام خالی پیٹ پانی یا دودھ سے کھائیے۔ ان شاء اللہ چند دنوں میں پانی آنا بند ہو جائے گا۔

گرمی سے سر درد

میں ایک راج مستری ہوں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ جیسے ہی موسم گرما شروع ہو کام کرنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے میرے سر میں شدید قسم کا درد ہونے لگتا ہے۔ آنکھوں سے حدت نکلنے لگتی ہے اور دل گھبراتا ہے۔ جسم بے جان سا ہو جاتا ہے۔ براہ مہربانی اس بیماری کا علاج بتائیں تاکہ بیوی بچوں کی خاطر روزی کمانے کے قابل ہو سکوں۔ (نعیم غوری۔ ننکانہ صاحب)

اکثر حساس طبیعت کے لوگ گرمیوں میں اس درد سر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گرمی کی علامت معلوم کرنے کے لیے آسان ترکیب یہ ہے۔ مریض کے سر پر ہاتھ لگانے سے وہ گرم معلوم ہو یا دھوپ میں چلنے پھرنے یا آگ کے نزدیک بیٹھنے سے سر درد کی شکایت ہو تو یہ گرمی سے ہونے والا سر درد ہوگا۔

گرمی کے سر درد سے نجات پانے کا ایک آسان سا نسخہ پیش ہے۔ امید ہے استعمال کرنے کے بعد درست بحال ہوں گے۔

ھوالشافی: تربوز کے بیج یا مغز لے کر انھیں کھرل میں ڈالیے اور پانی شامل کر کے خوب گھوٹیں۔ یہاں تک کہ مکھن کی طرح نرم ہو کر ملائم لیپ بن جائے۔ اس کو پیشانی پر لیپ کر لیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے چند منٹ میں سر درد دور ہو جائے گا۔

دوسرا نسخہ یہ ہے: تربوز کا گودا ململ کے کپڑے سے نچوڑ لیں اس میں قدرے مصری یا چینی ملا کر روزانہ صبح و شام پی لیں۔ ان شاء اللہ مستقل طور پر مرض سے جان چھوٹ جائے گی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک برطانوی کھلاڑی کا اعترافِ حقیقت

اہلِ کراچی محبت کرنے والے ہیں

دنیائے کرکٹ میں جنم لینے والی دلچسپ کہانی مایہ ناز پاکستانی بالر عبدالقادر کی زبانی

رانا محمد شاہد

۱۹۸۷ء میں برطانیہ کی کرکٹ ٹیم نے پاکستان کا دورہ کیا۔ فیصل آباد ٹیسٹ میں انگریز کپتان مائیک گیٹنگ اور پاکستانی امپائر شکور رانا کے درمیان ایک زبردست تنازع نے جنم لیا۔ اس کے بعد میرے بہت غیر دوستانہ ماحول میں کھیلا جانے لگا۔ ہم سب پاکستانی کھلاڑی انتہائی دباؤ میں آ گئے۔ حریف برطانوی کھلاڑیوں کے رویے سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ پاکستان کو نہایت اجڈ و گنوار لوگوں کا ملک سمجھتے ہیں جہاں اخلاقیات نامی کوئی شے نہیں پائی جاتی۔

انگریز کھلاڑی ہر دم پاکستانی عوام سے دور دور رہتے تھے۔ وہ میچ کے بعد شام کو اپنے ہوٹل کے کمروں میں مقید ہو جاتے۔ جب کراچی میں آخری ٹیسٹ شروع ہونے والا تھا تو شاید ایک یا دو دن قبل میں نے انگلستان کے اسپنر جان ایمبوری کو جن کے ساتھ میری اچھی خاصی گپ شپ تھی، دعوت دی کہ آج وہ میرے ساتھ شہر گھومنے چلیں۔

پہلے تو ایمبوری مسکرا دیے اور معذرت کر لی لیکن چونکہ فطرتاً وہ سیر سپاٹے کے شوقین تھے، اس لیے اگلے دن مجھ سے ملاقات میں ہامی بھر لی کہ وہ کراچی کی سیر کرنے کو تیار ہیں۔ وہ کپتان اور منیجر سے اس امر کی اجازت بھی لے چکے تھے۔ میں نے پاکستانی روایت کو مدِنظر رکھتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے انتہائی مہمان نوازی کا سلوک کیا اور جنگ کی گاڑی میں انھیں پورا کراچی گھمایا۔ شہر کی خوبصورتی دیکھ کر جان ایمبوری حیران رہ گئے۔ خاص طور پر ساحل سمندر انھیں بہت پسند آیا۔

پاکستانیوں نے ہر جگہ ہمارا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ ان کی محبت اور خلوص دیکھ کر جان کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا "پاکستان کے لوگ بہت محبت کرنے والے ہیں۔"

میں انھیں کلفٹن کے علاقے میں واقع ایک تجارتی مرکز لے گیا۔ وہاں ہمارے مداحوں نے ہمیں گھیر لیا اور بہت عزت دی۔ اس کی داستان تو الگ ہے۔ بہرحال وہاں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ بازار میں قالینوں کی ایک دکان تھی۔ وہاں جان ایمبوری کو کھڑکی پر رکھا ایک قالین بے حد پسند آیا۔ جب اس کی قیمت پوچھی گئی تو وہ اس قدر زیادہ تھی کہ میرے پاس تو اتنے روپے نہیں تھے کہ قالین خریدا جا سکتا۔ جب کہ جان ایمبوری کے ذہن میں تو یہ تصور تھا کہ کراچی کے ہر موڑ پر ڈاکو اور مجرم کھڑے ہیں، سو وہ اپنا بٹوہ ہوٹل چھوڑ آئے تھے۔

لیکن جان کو قالین بے حد پسند آیا اور وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ہماری پریشانی دکاندار بھانپ گیا۔ وہ ایک بڑی خوبصورت اور لگژری قسم کی دکان تھی۔ سیلز مین نے مالک سے پوچھا تو انھوں نے کہا جناب! آپ قالین لے جائیے، پیسے بعد میں آ جائیں گے۔ آپ بھاگ کر تو جائیں گے نہیں اور پھر آپ کو کون نہیں جانتا؟ آپ بے فکر ہو کر لے جائیے۔"

اس وقت جو کچھ روپے میری جیب میں تھے، وہ ہم نے دکاندار کو دیے اور اس وعدے کے ساتھ قالین لے کر آ گئے کہ دوسرے دن بقیہ رقم ادا کر دیں گے۔ اگلے دن ٹیسٹ شروع ہو گیا۔ ہم کھیل میں کچھ ایسے مگن ہوئے کہ دکاندار کو ادائی کا موقع ہی نہ مل سکا۔

میں نے اس میچ میں ۱۰ وکٹیں حاصل کیں۔ جان ایمبوری ہی واحد بلے باز تھے جو میری بالنگ کے سامنے ٹک سکے۔ انھوں نے دونوں اننگز میں ۷۰ اور ۳۷ رنز کی اننگیں کھیلیں اور میچ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہو گیا۔ آخری دن ہم نے سوچا ہوا تھا کہ آج ہر حالت میں دکاندار کو رقم دے آئیں گے۔

لیکن اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہوٹل کے استقبالیے پر ہمیں ایک لفافہ دیا گیا جس میں ایک پرچہ موجود تھا۔ اس میں جلی حروف میں اسی دکان کے مالک کی جانب سے لکھا ہوا تھا: "ایمبوری کی بلے بازی اور قادر کی بالنگ نے قالین کا بل ادا کر دیا۔" ساتھ ایک چیک بھی تھا جس میں وہ رقم واپس کر دی گئی تھی، جو ہم نے دکاندار کو ادا کی تھی۔ اس دن دکاندار کی طرف سے محبت اور خلوص دیکھ کر جان ایمبوری کے منہ سے پھر بے اختیار نکلا کہ پاکستان کے لوگ بہت محبت کرنے والے ہیں۔

◆◆◆

نین عابدی کا منفرد اعزاز

آپ ایک روزہ کرکٹ میں سنچری بنانے والی پہلی پاکستانی خاتون ہیں۔ آپ نے یہ کارنامہ ۲۲ اگست ۲۰۱۲ء کو آئرلینڈ کے خلاف میچ میں انجام دیا۔ اس سے پہلے پاکستان کی طرف سے سب سے بڑی انفرادی اننگز کھیلنے کا اعزاز مہوش خان کے پاس تھا جنھوں نے ۲۰۰۱ء میں ہالینڈ کے خلاف ۲۹ رنز کی اننگز کھیلی تھی۔ کراچی سے تعلق رکھنے والی ۲۹ سالہ نین عابدی پاکستان کی جانب سے ۵۵ ایک روزہ میچ کھیل چکی ہیں۔ آپ نے اب تک ۲۰۹۰ رنز بنائے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

موت سے ہوئی دو بدو جنگ

اور تیندوا مجھ پر جھپٹ پڑا

ایک خطرناک حیوان اور انسان کے درمیان جب دست بدست لڑائی ہوئی

حسن شفیق

میں نے بندوق سے کئی جانور شکار کیے تھے، اس بار ارادہ کیا کہ تیر کمان سے تیندوے کا شکار ہونا چاہیے۔ سو ارجنٹائن میں دریائے پارانا کے قریب پہلے دن ہی دیہات پہنچ گیا۔ جب جنگل کے نزدیک آباد ایک قصبے پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ لوگوں سے پوچھتا پاچھتا ایک سرائے پہنچا۔ عزم تھا کہ رات آرام کر کے صبح شکار پر نکلا جائے۔ مالک سرائے سے مقامی شکاری یا گائیڈ کے متعلق استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی بھی دستیاب نہیں، سب اپنی مہمات پر روانہ ہو چکے تھے۔

یہ بھی پتا چلا کہ مقامی لوگ ایک تیندوے سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ سو کوئی گائیڈ دستیاب بھی ہوا تو وہ جنگل کے باہر رک کر میرا انتظار کرے گا اور وہ صرف مجھے راستہ دکھائے اور میرے تیر زہر آلود کرے گا۔ بہرحال میں نے مالک سرائے سے کہا کہ وہ مقامی گائیڈ کا بندوبست کر دے۔

اگلے روز سویرا ہوا تو لاجو نامی ایک مقامی گائیڈ منتظر تھا۔ تعارف کے بعد اس نے میرا سامان اٹھایا، اپنے ساتھ لائے گھوڑے پر رکھا اور ہم جنگل کی طرف چل

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پڑے۔ جب سورج بلند ہوا، ہم جنگل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ لامینہ نے خاموشی سے میرا سامان نیچے رکھا اور ساتھ لائی مقامی جڑی بوٹیوں کا زہر میرے تیروں پر پوتنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ شام تک کہیں میری واپسی کا انتظار کر سکتا ہے؟ اس نے مراثبات میں ہلایا اور میرے تیر پھر زہر میں ڈبونے لگی۔

میں پوری طرح مسلح ہو کر جنگل میں داخل ہوا۔ جنگل بہت گھنا تھا۔ اس میں بلند و بالا درخت پھیلے ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ وہ وقت ہے جب تیندوے رات بھر شکار کرنے کے بعد کوئی جگہ ڈھونڈتے ہیں تاکہ آرام کر سکیں۔ وہ عموماً کسی غار کا انتخاب کرتے ہیں۔ میں جنگل میں ایسی کسی غار سے واقف نہیں تھا۔ مجھے تو پورا جنگل ہی ایک غار کے مانند لگ رہا تھا۔ تاریک، غار کی طرح سیلن زدہ اور بدبو لیے ہوئے۔

میں اپنے ساتھ تین دن کا کھانا لایا تھا مگر مجھے امید تھی کہ میں جلد کامیاب ہو کر لوٹ جاؤں گا۔ مجھے اپنی ہمت اور دلیری پر اعتماد تھا۔ اکثر تیندوے کسی درخت کی مضبوط شاخوں پر لیٹ کر بھی آرام کرتے ہیں۔ یوں وہ اردگرد پر نظر رکھتے اور نیچے سے گزرتے شکار یا شکاری پر باآسانی حملہ کر سکتے ہیں۔ پنجوں کے نشانات سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ جنگل میں کئی تیندوے موجود ہیں۔ یعنی کسی بھی درخت پر موت میرا انتظار کر رہی تھی۔

بہرحال میں خود کو حوصلہ دیتا بڑھتا گیا۔ جلد راستہ تنگ اور جنگل مزید گھنا ہو گیا۔ میں پوری طرح مستعد تھا۔ آنکھیں اوپر نیچے، دائیں بائیں، ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ڈر رہا تھا۔ تنہا ہونے کے باعث بھی خوفزدہ تھا۔ کہتے ہیں، تنہائی تو خود ہی جان لیوا ہوتی ہے۔ پھر بھی اپنی ہمت بڑھاتا چلتا رہا۔

کافی دیر بے مقصد ادھر ادھر گھومنے کے بعد مجھے خیال آیا، اپنی جان مسلسل خطرے میں ڈالنے کے بجائے کیوں نہ میں کوئی ندی یا تالاب ڈھونڈ لوں جہاں جانور پانی پینے آتے ہیں۔ وہیں کہیں گھات لگا کر بیٹھ جاؤں گا۔

میں نے جیب سے جنگل کا نقشہ نکالا اور اس کے مطابق ایک قریبی ندی کی طرف چل دیا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ اس کے کناروں پر قد آور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ ان میں باآسانی چھپ کر بیٹھنا ممکن تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کیونکہ مجھے ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی۔ مگر ایک خطرہ بھی تھا، اکثر تیندوے بھی ایسی ہی کسی جگہ گھات لگا کر بیٹھتے ہیں۔ بہرحال میں دیکھ بھال کر جھاڑیوں میں ایک جگہ چھپ گیا جہاں سے ندی صاف نظر آتی تھی۔

سب سے پہلے میں نے سرخ بارہ سنگھے دیکھے جو پانی پینے آئے تھے۔ وہ میرے اتنے قریب سے گزرے کہ مجھے کھال کے گھنے بال بھی صاف نظر آئے۔ انھوں نے پانی پیا اور پھر دریا کھدلا کرتے دوسری طرف نکل گئے۔

میں نے آہستگی سے اپنی کمان کو دائیں سے بائیں کندھے پر منتقل کیا کہ وہ کندھا سن ہو گیا تھا۔ اسی لمحے میری نظر بائیں طرف واقع جھاڑیوں پر پڑی اور میں خوف کے مارے اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ وہاں ایک بڑا سا تیندوا گھات لگائے بیٹھا تھا۔

میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا، تو افشا ہوا کہ اس کا شکار ایک بارہ سنگھا تھا۔ وہ چند لمحے قبل ہی ندی پر پانی پینے آیا تھا۔ وہ اسی پر نظر رکھے ہوئے تھا تاکہ موقع پاتے ہی جھپٹ سکے۔ چونکہ ہوا بالکل بند تھی، اسی لیے تیندوے تک میری بو نہیں پہنچی۔ اس کی محویت کے باعث مجھے مناسب وقت مل گیا۔ میں نے تسلی سے نشانہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

باندھا اور پھر پوری قوت سے تیر چلا دیا۔ جواب میں ایک دل دہلا دینے والی چیخ نے مجھے ہلا دیا..... تیر عین نشانے پر گردن میں کھب گیا تھا۔

اب حیوان نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ فوراً ہی مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس کی رفتار اتنی ہی تھی جتنی اسے لگنے والے تیر کی! میں سمجھ ہی نہ پایا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے! پھر غیر اختیاری طور پر میرا ہاتھ کمر سے بندھے شکاری چاقو کی طرف گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں چاقو نکال کر حملے کا جواب دیتا، تیندوے نے اپنے خوفناک پنجے کے ایک ہی وار سے میری کھوپڑی ادھیڑ ڈالی۔ میرے سر سے خون بہنے لگا۔ اپنے ہی خون سے اندھا ہونے کے باعث میں دیکھ ہی نہیں پایا کہ میرا شکاری چاقو اس کے دوسرے خونخوار پنجے نے میرا ہاتھ ادھیڑ کے کہاں پھینک دیا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ یقیناً میرا پیٹ پھاڑ ڈالے گا۔ میں نے جلدی سے لیٹ کر گھٹنے پیٹ کے ساتھ لگائے اور ہاتھوں سے اپنی گردن اور چہرے کا دفاع کرنے لگا۔ جلد ہی اس کے سانسوں کی گندی بدبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور مجھے ابکائی آ گئی۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اندھوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ تیر پر لگے زہر نے تیندوے کی آدھی طاقت ختم کر دی تھی۔ اب زہر کا مکمل اثر ہونے تک مجھے اپنی گردن اور پیٹ اس کے خونخوار پنجوں سے بچانے رکھنے تھے۔

تیندوے کے پنجے میرے ہاتھ، بازو اور ٹانگیں ادھیڑنے لگے۔ میرے گھٹنے اس کی پسلیوں کے ساتھ لگے ہوئے تھے..... گویا وہ میرے اوپر براجمان تھا۔ اسی دوران میرے ہاتھ اس کی گردن پر جا پڑے۔ میں اب سانس کی نالی ڈھونڈنے لگا۔ چاہا کہ اس کا گلا گھونٹ دوں مگر مسلسل خون بہنے سے میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ ادھر تیندوے کی طاقت بھی کم ہونے لگی، زہر اپنا کام کر رہا تھا۔ وہ بہت بڑا اور جاندار تیندوا تھا۔ اسی باعث اب تک مجھے کسی گڈے کی طرح پنجوں سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ جب مجھے لگا کہ اب میں مزید ہوش میں نہیں رہ سکتا، تو اچانک مجھے اپنے قریب لامینہ کی موجودگی محسوس ہوئی۔ پھر میرا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆

ہوش آیا تو میں نے خود کو قصباتی ہسپتال میں پایا۔ میری خوش قسمتی کہ لامینہ کو خیال آ گیا کہ اسے جنگل میں میرے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ چناں چہ وہ گھوڑا بھگاتا جنگل میں چلا آیا۔ لامینہ نے تیندوے کی غراہٹیں سنیں تو ندی کی طرف آیا۔ جب وہ ہم تک پہنچا، تو دیکھا کہ تیندوا میرے اوپر مردہ پڑا تھا۔ لامینہ نے میری نبض دیکھی، تو اسے معلوم ہوا کہ میں خون میں لت پت مگر زندہ ہوں۔

اس نے پہلے تو جنگلی بوٹیوں سے بنا مرہم میرے زخموں پر رکھا، پھر مجھے گھوڑے پہ ڈال قصباتی ہسپتال لے آیا جہاں ڈاکٹروں نے فوری آپریشن کر کے میری جان بچائی۔ مجھے ہسپتال چھوڑنے کے بعد وہ گاؤں کے دو اور جوانوں کو ساتھ لیے جنگل گیا اور تیندوے کی کھال اتار لایا جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

میری ٹانگیں تیندوے نے بری طرح چبائی اور پنجوں سے ادھیڑ ڈالی تھیں۔ میں پریشان تھا کہ شاید میں کبھی چل نہیں پاؤں یا لنگڑا ہی نہ ہو جاؤں مگر آج میں بالکل ٹھیک کسی لنگڑاہٹ کے بغیر چلتا ہوں۔ لامینہ اور اس کی جڑی بوٹیوں نے مسیحا جیسا کردار ادا کیا تھا۔ مگر میری ٹانگوں اور سر پر تیندوے کے پنجوں کے نشان آج بھی مجھے یاد دلاتے ہیں کہ شکاری کو خود شکار بنتے لمحہ بھی دیر نہیں لگتی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

یادیں جب چین سے جینے نہ دیں

خلش

اپنے پیاروں سے کٹ جانے والے کی المناک کتھا، زندگی اس کے لیے عذاب بن گئی تھی

سجاد قادر

فیروز خان کو شہر آئے چالیس برس بیت چکے تھے۔ اب تو وہ پوتے پوتیوں کی اردو زبان میں بولنے سنتا تھا۔ بڑا گھر، گاڑی، بچے اعلیٰ عہدوں پر فائز، طبقہ بالا میں اٹھنا بیٹھنا، ٹھاٹ کی رہائش اور معاشرے میں ارفع مقام..... کسی شے کی کمی نہ تھی۔ پھر بھی وہ اپنی زندگی میں کھوکھلا پن سا محسوس کرتا۔ جانے کیا غم یا خلش تھی جو اس کا اندرونی سکون چھینے جا رہی تھی۔ اکثر وہ صبح اور شام اپنے بنگلے کی بالکونی میں بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ جیسے کسی چیز کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو اور اضطراب کی حالت میں پہلو پہ پہلو بدلتا۔

وہ اعلیٰ عہدے سے سبکدوش ہو کر بظاہر پرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ سب بچے بیاہ کر خوش و خرم اپنی زندگی میں مگن تھے۔ ایسے میں فیروز خان کا [illegible] کتابوں اور "ٹاک شوز" کے علاوہ اور کوئی مصروفیت نہ رکھتا۔ بظاہر اسے ہر آسائش اور سکون میسر تھا۔ مگر وہ اکثر پریشان اور عجیب کیفیت میں نظر آتا۔ پڑوسی ہونے کے ناتے میں نے بارہا کوشش کی کہ اس سے پوچھوں دنیا جہان کی ہر آسائش میسر ہونے کے باوجود وہ مضطرب

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیوں بکھائی دیتا ہے؟ مگر ہمت نہ ہوئی۔ یوں لگتا تھا اس کے دکھ اور غم جاننے والا کوئی نہیں۔ کوئی ہے بھی تو شاید اس کے دکھوں کا مداوا نہیں کر پاتا۔

ایک صبح میں چہل قدمی کرتا بنگلے کے سامنے سے گزرا تو فیروز خان سوچوں میں گم بالکونی میں بیٹھا تھا۔ میں نے سلام کیا تو وہ چونک سا گیا۔ پھر مسکرا کر سلام کا جواب دیا تو میں نے باغ میں چلنے کی دعوت دی۔ فیروز خان نے ہامی بھرلی۔ جھٹ ٹریک سوٹ پہنا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ کچھ دیر ہم موسم کے حوالے سے بات چیت کرتے رہے۔ پھر ملکی حالات پر بات چل نکلی۔ اتنے میں باغ آگیا اور ہم کچھ دیر سستانے ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

مرد وزن بچے اور بوڑھے ورزش کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے گردوپیش کا جائزہ لیتے رہے۔ بالآخر فیروز خان نے سکوت توڑا اور پوچھنے لگا کہ میں کہاں سے تعلق رکھتا ہوں؟ بچپن کہاں اور کیسے گزرا؟ شہر میں آئے کتنا عرصہ ہوگیا؟ وغیرہ۔ اس بات سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ ضرور فیروز خان کی بچپن سے جڑی کچھ یادیں ہیں جن سے چھٹکارا نہیں مل رہا اور وہی اس کی بے سکونی کا سبب ہیں۔

ذرا توقف کے بعد میں نے پوچھا کہ آپ کا تعلق کہاں سے ہے اور ساتھ ہی یہ سوال بھی کر دیا کہ وہ اکثر پریشان کیوں رہتے ہیں؟ ایسی کون سی بات ہے جو انہیں ہر وقت بے قرار رکھتی ہے؟ یہ سنتے ہی فیروز خان دور خلاؤں میں گھورنے لگا اور یکدم چہرے پر اداسی چھا گئی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے اپنی آپ بیتی سنائی۔

وہ گاؤں سے ہجرت کر کے آنے والے ایک مہاجر کی کرب ناک داستان تھی۔ آپ بھی فیروز خان کی کہانی اسی کی زبانی سنیے:

☆

پنجاب کے ایک پس ماندہ گاؤں سے میرا تعلق ہے جو دریائے ستلج کے قریب آباد ہے۔ گاؤں کے اسکول میں پانچویں تک تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک مسجد تھی جہاں بستی کے بچے بچیاں دینی تعلیم حاصل کرتے۔ ہمارا گھرانا چار بھائیوں اور دو بہنوں پر مشتمل تھا۔ گاؤں میں بہت سکون رہتا۔ شام کو بستی کے بچے دریا کنارے کھیلنے جاتے اور تھک ہار کر رات گئے گھر لوٹتے۔ کبھی کوئی پریشانی ہوتی اور نہ ہی کوئی لڑائی یا کسی قسم کا دنگا فساد۔ لوگ سال میں ایک مرتبہ نئے کپڑے خریدتے وہ بھی چھوٹی یا بڑی عید پر۔ بچے اکثر اسکول سے آنے کے بعد مویشی چرانے جاتے اور خوب اٹکھیلیاں کرتے۔

میرے تمام بہن بھائی گھر کے کام میں خوب دل لگاتے۔ لیکن ان میں سے کسی نے تعلیم حاصل نہ کی۔ مگر مجھے پڑھنے اور سند حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ چناں چہ گھر کے کام کی طرف توجہ کم دیتا اور اسکول میں وقت زیادہ گزارنے لگا۔ شروع میں تو گھر والوں نے زدوکوب کیا کہ تمہارا خاندانی پیشہ کھیتی باڑی ہے۔ تم نے پڑھ لکھ کے کون سا پٹواری لگ جانا ہے؟ چھوڑو ان کتابوں کے چکر کو اور مال مویشی چرایا کرو۔ لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہا۔

بالآخر میری ضد کے سامنے سارے ہار مان گئے۔ مجھے باؤلا کا خطاب دے کر چھوڑ دیا کہ یہ تو پاگل ہوگیا ہے۔ سو میں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ البتہ کبھی کبھی مویشی چرانے چلا جاتا۔ عصر کے وقت واپسی ہوتی۔ گاؤں کی مسجد ایک ٹیلے پر واقع تھی۔ موذن جب

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہاں کھڑا ہو کے اذان دیتا تو اس کی آواز پورے گاؤں میں گونجتی۔ آج بھی میرے کانوں میں اس موذن کی آواز گونجتی رہتی ہے۔ مجھے اس کی اذان خصر سے عشق تھا۔ دراصل ایک تو اس کی آواز بہت سریلی تھی۔ دوسرے وہ سورج ڈھلنے کا وقت ہوتا۔

آپ کبھی شام کے وقت دریا کنارے سورج ڈھلنے کا منظر دیکھیں تو آپ پر ایسا روحانی اور دنیا کے فانی ہونے کا احساس جاگزیں ہوگا کہ بیان سے باہر ہے۔ مجھے بھی اذان سن کر میدان حشر یاد آنے لگتا۔ سورج ڈھل رہا ہوتا۔ مویشی باڑوں کو واپس جا رہے ہوتے۔ ان کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں اور پیروں میں پڑے گھنگھرو عجیب سُر میں موسیقی پیدا کرتے۔ ادھر ہوا دریا کنارے لگے درختوں سے ٹکرا کر گزرتی تو سائیں سائیں کی آواز جادو کا سا سماں پیدا کر دیتی۔ وہ ماحول مجھے سحر زدہ کر دیتا۔

وقت چٹکی بجاتے گزر گیا۔ میں نے گاؤں کے پرائمری اسکول سے پانچویں جماعت پاس کر لی۔ اب چھٹی میں داخلے کے لیے شہر جانا ضروری تھا۔ وہاں ابو کے ایک دوست رہتے تھے۔ ابو مجھے ان کے گھر چھوڑ آئے۔ میں ان کے گھر کا چھوٹا موٹا کام کر دیتا۔ مثلاً بازار سے سودا سلف لا دیتا۔ بدلے میں مجھے دو وقت کی روٹی رہنے کے لیے چھت اور پڑھنے کے لیے کتابیں مل جاتیں۔

میرے لیے یہ سہولت بیش قیمت تحفے سے کم نہ تھی۔ وہاں سے میٹرک کے بعد میں لاہور آ گیا۔ جز وقتی ملازمت کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ لاہور آیا تو دنیا ہی نئی تھی۔ سڑکوں پر دوڑتی گاڑیاں وسیع و عریض اسکول و کالج، غرض زندگی ہی نئی تھی۔ رفتہ رفتہ میں بھی اس زندگی میں شامل ہوا اور اپنی دیسی معصومیت کو شہر کی مصنوعی قدروں کے سپرد کر دیا۔ جب شہری زندگی میں رنگا تو گھر جانا بہت کم ہو گیا۔ گھر سے اکثر پیغام آتا کہ تمہارے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں امی بھی بیمار رہتی ہے۔ ان سے مل جاؤ مگر میں کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے نہ جاتا۔

ایک دن گاؤں سے پیغام آیا کہ بڑے بھائی کی شادی ہے جلد گھر آ جاؤ۔ گھر جانے یا نہ جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دو چار دوست آ ٹپکے۔ مژدہ سنایا کہ اگلے اتوار سینما میں نئی فلم آ رہی ہے۔ ہم بلیک میں ٹکٹ خرید چکے لہٰذا لازمی جانا ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ بڑے بھائی کی شادی ہے گاؤں جانا ہے۔ مگر سب دوستوں نے گاؤں کا مذاق اڑاتے ہوئے میری تیاری کو بھی ہوا میں اڑا دیا۔ چناں چہ جب میرے بڑے بھائی کی شادی ہوئی تو میں سینما گھر میں بیٹھا نئی فلم دیکھ رہا تھا۔ گھر ویسے ہی کافی عرصے سے نہیں گیا تھا اب شرمندگی کے مارے ماں باپ کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہا۔

وقت کو جیسے پر لگ گئے۔ جھٹ سے میں نے ماسٹر کر لیا اور ملازمت بھی مل گئی۔ آخر چار سال بعد میں بن ٹھن کر گھر والوں سے ملنے پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ جیسے ہمارے گاؤں میں نئی نئی ٹیلی ویژن آیا تھا تو اسے دیکھنے لوگ جمع ہو گئے تھے کہ ایسا ریڈیو آیا ہے جس میں آواز کے ساتھ تصویر بھی نظر آتی ہے۔ خیر گھر میں دو چار دن رہا تو محسوس ہوا کہ سب لوگ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس رہتے ہیں۔ یہی بات ہے مجھے ان سے بڑی گھن آئی۔ جہاں مویشی باندھتے وہیں سو جاتے۔ جس کمرے میں کھانا پکاتا اسی میں لیٹ جاتے۔ نہانے کے لیے غسل خانہ بھی نہیں تھا۔ غرض اس کے بعد میں گاؤں اور گاؤں والوں کو آخری سلام کر کے ہمیشہ کے لیے شہر چلا آیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کچھ عرصے بعد دوستوں نے میرے لیے نہ صرف لڑکی پسند کر لی بلکہ فوری طور پر اُس کے گھر والوں کو راضی بھی کر لیا۔ جب لڑکی والوں نے میرے والدین کا پوچھا تو انھوں نے جھوٹ بولا کہ وہ بچپن ہی میں راہیِ ملکِ عدم ہو چکے۔ بیچارا یتیم ہے اور بڑی مشکل سے محنت کر کے اس مقام تک پہنچا ہے۔ میں نے جب یہ سنا تو بہت سیخ پا ہوا کہ میرے زندہ والدین کو آپ لوگوں نے مار ڈالا۔ مگر انھوں نے میری بات ہنسی مذاق میں اُڑا دی۔

کہنے لگے اوّل تو تمہارے والدین شہر میں رشتہ ہونے نہیں دیں گے۔ دوسرے اگر وہ شہر آ گئے تو دیوانے ہو جائیں گے اور پاگلوں جیسی حرکتیں کریں گے۔ شادی والے دن والدین کے ہاتھوں اپنا مذاق اڑوانے سے بہتر ہے کہ وہ نہ ہی آئیں۔ یوں زندہ والدین کی عدم موجودگی میں انھیں اطلاع دیے بغیر میں نے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کیا اور شادی رچا لی۔

نئی زندگی اپنی روش پہ تیزی سے دوڑنے لگی۔ ایک دن پیغام آیا کہ والدہ طویل علالت کے بعد دارِ فانی سے کوچ کر گئی ہیں۔ اُسی دن ایک ضروری میٹنگ کے سلسلے میں مجھے کراچی جانا تھا۔ بہت پریشان ہوا۔ بیگم کو بتایا تو اس نے کہا ''آپ ویسے بھی جنازے میں شریک نہیں ہو سکتے۔ بہتر ہے کہ میٹنگ نمٹا لیں اور دو چار روز بعد والدہ کی قبر پہ فاتحہ پڑھ لیجیے گا۔ اس طرح گھر والوں اور آپ کو سکون ہو جائے گا۔'' ناچار یہ دنیادار والدہ کا آخری دیدار کرنے بھی نہ جا سکا۔ میٹنگ کے بعد آج جاتا ہوں اور کل جاتا ہوں کرتے کرتے کئی برس گزر گئے۔ رفتہ رفتہ حرص و ہوا نے ضمیر کو اس قدر لپیٹ میں لیا کہ انسانی ہمدردی اور اپنوں سے محبت کے جذبات ناپید ہوتے چلے گئے۔ والدہ کے بعد والد، بڑا بھائی پھر بڑی بہن پھر چچا، ماموں ایک ایک کر کے سب مجھے چھوڑتے گئے اور میں تنہا ہوتا چلا گیا۔ یوں گاؤں سے میرا رشتہ بالکل ختم ہو گیا۔

آج شاید میرے بھائیوں اور بہنوں کے بچے جوان ہوں۔ جانے وہ کیسے ہوں گے۔ میرے بارے میں اپنے والدین سے کہانیاں سنتے ہوں گے مگر مجھے کبھی دیکھ نہیں سکے۔ میں شہر میں اعلیٰ عہدے حاصل کرتا رہا مگر مصنوعی ترقی کی دوڑ میں حقیقی خوشیاں، رشتے اور زندگی کی اصل متاع گنوا بیٹھا۔ اب میری زندگی ایک مصنوعی مشین بن چکی۔ بچپن، دریا کا کنارا، موذن کی اذان، عصر، مویشیوں کے گلے کی گھنٹیاں اور بچوں کی شائیں شائیں کے ساتھ سورج کا دلفریب منظر میری یادوں کے سفر میں ریل کے مانند چلتا ہے مگر میں اُن تمام مناظر میں کہیں موجود نہیں ہوتا۔

گاؤں میں شاید اب بھی نیلے والی پکی مسجد ہو، وہاں موذن اذان دیتا ہو، لوگ مویشیوں کے باڑے میں سوتے ہوں، سال میں ایک بار عید کے موقع پر نئے کپڑے خریدتے ہوں اور گوشت بھی سال میں ایک بار عید قربان پر کھاتے ہوں۔ مگر وہ خوشیاں روزانہ خریدتے ہیں اور پیار بانٹتے ہیں۔ اُن میں اپنا پن اور خلوص و محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ وہ اپنی ماؤں اور پیاروں کے جنازوں کو کندھا دیتے، اُن کا آخری دیدار کرتے ہوں گے۔ بھائیوں کی شادیوں میں ناچ گانا بھی کرتے ہوں گے۔ اُن کے بچے اور رشتہ داروں سے متعلق صرف قصے اور کہانیاں نہیں سنتے بلکہ اُن سے بذاتِ خود گلے ملتے اور دریا کنارے کھیلتے ہوں گے۔

اور ہم اس شہر نما خوفناک جنگل میں سسکیوں اور آہوں کے درمیان لنگڑاتے اور جذبات سے عاری زندگی کا پہیہ چلائے چلے جا رہے ہیں کہ کبھی تو زندگی اختتام کو پہنچے گی۔

◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

محترمی و مکرمی جناب ....

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کیا آپ کے پاس ایک قرآن مجید ہے؟

تمام مسلمان بہن بھائیوں اور خصوصاً آپ سے التجا ہے کہ آپ کے پاس اگر ایک سے زیادہ مترجم قرآن مجید، قاعدے، سپارے، بخاری شریف یا حدیث کی کوئی کتاب یا دیگر اسلامی کتابیں موجود ہوں تو ضائع نہ کریں بلکہ ادارہ آمنہ جنت کی لائبریری کو عطیہ کریں۔ جب تک طالبات ان کو پڑھتی رہیں گی ثواب بھی آپ کو ملتا رہے گا اور یہ صدقہ جاریہ ہے۔

اپنے والدین اور مرحومین کے بلند درجات کے لیے؟

ادارہ کو تفاسیر قرآن کریم، کتب حدیث اور دیگر اسلامی کتابیں خود تشریف لا کر پہنچا دیں یا ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بنام ادارہ ارسال فرمادیں۔ ہم تفسیر قرآن کریم بازار سے لے کر رسید آپ کو بھجوا دیں گے۔ ان شاء اللہ

دعوت

آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ماسوائے اتوار کے کسی بھی دن کسی بھی وقت جب آپ کو آسانی ہو، ادارے کا وزٹ فرمائیں، ہمارے کام تعلیم القرآن وعصری تعلیم کو چیک کریں۔ اگر دل گواہی دے کہ کام بطریق احسن سے ہو رہا ہے تو پھر تفاسیر قرآن کریم وکتب حدیث عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نوٹ

منی آرڈر یا کتابیں بنام ادارہ ارسال فرمائیں۔ وتی دیتے وقت ادارے کی رسید وصول کریں۔ شخصی نام پر ہرگز ارسال نہ فرمائیں۔ شکریہ

بغیر نمود و نمائش

تعلیم القرآن، دین کی نشر و اشاعت اور انسانیت کی فلاح کے لیے، بغیر نمود و نمائش دیے گئے عطیات کا ادارہ خیر مقدم کرتا ہے۔ اپنے عطیات بذریعہ چیک یا ڈرافٹ ارسال کرنا چاہیں تو ڈرافٹ یا چیک آمنہ جنت فاؤنڈیشن اکاؤنٹ نمبر 02745 ایم سی بی چونیاں برانچ نمبر 0240 کے نام بھجوائیں۔ آن لائن بھی جمع کرا سکتے ہیں۔

اس صورت میں مطلع ضرور کریں۔

آن لائن اکاؤنٹ ایم سی بی PK86MUCB0673440401002745 ٹائٹل اکاؤنٹ آمنہ جنت ویلفیئر فاؤنڈیشن ایم سی بی چونیاں برانچ

نوٹ: ادارہ گورنمنٹ سے منظور شدہ ہے۔ ادارے کو دیے جانے والے تمام عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں، مزید رابطے کے لیے:

پرنسپل رضیہ پروین آمنہ جنت فاؤنڈیشن
ماڈل اسکول چونیاں ضلع قصور
فون نمبر: 0322-7614497 -0300-4735932

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مرغن اور فاسٹ فوڈ
کھانے کے بجائے

چھلکے کھا کر صحت پائیے

ہماری تندرستی کے ضامن ان غذائی اجزا کا
اچھوتا بیان جو چھلکوں میں پوشیدہ ہیں

ڈاکٹر رخسانہ نبیل

عامر گھر پہنچا تو دیکھا کہ اماں صحن میں چارپائی پر بیٹھی آلو چھیل رہی ہیں۔ عامر طب کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور آج ہی اس نے غذائیات پر ایک اہم سبق پڑھا تھا۔ تبھی اپنی والدہ کو آلو چھیلتے دیکھا تو چیخ پڑا "اماں! آلو مت چھیلیے انھیں ایسے ہی پکائیے۔"

اماں تعجب سے بولیں "ارے! یا اللہ تو نہیں ہوگیا۔ بغیر چھیلے آلو کون کھاتا ہے؟"

عامر بولا "اماں! آلو کا چھلکا بھی بڑا غذائیت بخش ہوتا ہے۔ اس میں ریشہ، فولاد، پوٹاشیم اور وٹامن بی پایا جاتا ہے۔ پھر چھلکے میں ضد تکسیدی (Antioxidants) مادے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ ہمیں بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔"

اماں آلو کے چھلکے کی اتنی زیادہ خصوصیات جان کر حیران رہ گئیں۔ بیٹا ڈاکٹری پڑھ رہا تھا اس لیے انھیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کی باتوں پر اعتبار آ گیا۔ انھوں نے طے کر لیا کہ اب وہ آلو چھلکوں سمیت پکایا کریں گی۔

ہمارے ہاں کئی پھل اور سبزیاں چھلکے اتار کر کھائی پکائی جاتی ہیں اور کوڑے کی ٹوکری ان چھلکوں کا ٹھکانا بنتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کئی پھلوں اور سبزیوں کے چھلکے غذائیت بخش اجزا (Nutriens) رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان چھلکوں کو بھی کام میں لائیے۔

چھلکوں کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پھل سے "تین چار گنا" زیادہ "ریشہ" رکھتے ہیں۔ ہمارے بدن کو یہ ریشہ (Fibre) بہت درکار ہوتا ہے تاکہ بدن سے زہریلے مادوں کو خارج کر سکے۔

دوسری خاصیت ان میں ضد تکسیدی مادوں کی موجودگی ہے۔ یہ مادے جسمانی خلیوں کو تندرست و توانا بناتے ہیں۔ چونکہ انسان انھی خلیوں کا مرکب ہے لہٰذا ان کی تندرستی کے باعث وہ دیر سے بوڑھا ہوتا اور طویل عمر پاتا ہے۔

تیسری خاصیت یہ ہے کہ چھلکوں میں شکر، چکنائی اور حراروں (calories) کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔ یوں انسان ان غذائی مادوں سے محفوظ رہتا ہے جن کی زیادتی ہماری صحت خراب کر سکتی ہے۔ ذیل میں ان پھلوں اور سبزیوں کا تذکرہ پیش ہے جن کے چھلکے بہت کارآمد ہیں۔

پیاز

عام استعمال ہونے والی اس سبزی کا چھلکا کئی اقسام کے ضد تکسیدی مادے رکھتا ہے۔ یہ خصوصاً کوئیرسیٹن (Quercetin) نامی کیمیائی مادے کا خزانہ ہے۔ یہ مادہ ہمارے خون کا دباؤ کم کرتا ہے اور ہماری شریانوں میں چکنائی نہیں جمنے دیتا۔

اجوائن

یہ سبزی اجمود یا کرفس (Celery) بھی کہلاتی ہے۔ اس کے ڈنٹھل پکا کر کھائے جاتے ہیں۔ بیج مسالا جات میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے پتے عموماً کوڑے کی زینت بنتے ہیں تاہم ان کی اہمیت بھی زیادہ ہے۔

وجہ یہ کہ یہ پتے ڈنٹھلوں سے پانچ گنا زیادہ میگنیشیم اور کیلشیم رکھتے ہیں۔ ان میں وٹامن سی اور سوزش جسم پیدا کرنے والے کیمیائی مادے بھی بکثرت ملتے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ اجوائن کھانے کے شوقین ہیں تو اس سبزی کو پتوں سمیت پکائیے۔

کنو اور مالٹا

جنس ترش سے تعلق رکھنے والے پھلوں مثلاً کنو، مالٹے، لیموں اور گریپ فروٹ وغیرہ کا موسم جلد آنے والا ہے۔ ان پھلوں کے چھلکے بھی کوڑے میں ڈالے جاتے ہیں حالانکہ ان کی غذائی افادیت بہت زیادہ ہے۔

دراصل ترش پھلوں کے چھلکوں میں بھی وافر مقدار میں وٹامن سی ملتا ہے۔ نیز تازہ کنو اور مالٹے کا چھلکا وٹامن اے، بی اور اہم معدنیات مثلاً جست، کیلشیم، پوٹاشیم اور میگنیز بھی رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان چھلکوں کو کیونکر کھایا جائے؟

آسان طریقہ یہ ہے کہ دھوپ میں چھلکے سکھا کر ان کا سفوف بنا لیجیے۔ یہ سفوف پھر مسالے میں ملا کر کھانے میں استعمال کیجیے یا سلاد پہ چھڑکیے۔ اسے چٹنی یا اچار میں بھی ملایا جا سکتا ہے۔

کیلا

کیلے کا چھلکا بھی غذائیت سے پُر ہے۔ اس میں پوٹاشیم معدن بکثرت ہوتا ہے۔ یہ معدن ہمارا بلند فشار خون (بلڈ پریشر) کم کرتا اور موڈ بہتر بناتا ہے۔ اس میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

حل پذیر ریشہ بھی خوب ملتا ہے۔ یہ ریشہ ہم میں سیری کا احساس پیدا کرتا اور خراب کولیسٹرول (ایل ڈی ایل) سے نجات دلاتا ہے۔

مزید برآں یہ چھلکا غیر حل پذیر ریشہ بھی رکھتا ہے۔ یہ ریشہ ہماری آنتوں کی صفائی کر کے ہمارا نظام ہضم ٹھیک کرتا ہے۔

کیلے کے چھلکے کی خصوصیات کے باعث بھارت سمیت کئی ایشیائی ممالک میں یہ بطور سبزی پکایا جاتا ہے۔ نیز اس کی یخنی (سوپ) بھی بنتی ہے۔ لہٰذا آئندہ بے پروائی سے کیلے کا چھلکا مت پھینکیے بلکہ اسے کام میں لائیے۔

تربوز

عام لوگ اس پھل کا چھلکا بھی کوڑے کی نذر کرتے یا بھیڑ بکریوں کے آگے ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ گودے کے نیچے واقع سفید حصہ بھی غذائیت رکھتا ہے۔ ماہرین طب کے مطابق یہ سفید حصہ وٹامن سی اور وٹامن بی 6 کا حامل ہے۔

مزید برآں سفید حصے میں سائٹرولین (Citrulline) نامی کیمیائی مادہ بھی ملتا ہے۔ وہ ایک امائنو ایسڈ یا تیزاب ہے جو ہمارے بدن میں خون کی نالیوں کو صاف کرتا ہے۔ یوں ان میں خون روانی سے دوڑتا اور ہمیں تندرست رکھتا ہے۔

تربوز کے سفید حصے کو بلینڈر میں سرخ گودے کے ساتھ پیس لیجیے۔ تھوڑی سی چینی ملا لیں تاکہ رس میٹھا ہو سکے۔ جی چاہے تو سفید حصہ یونہی کھا لیجیے۔ سبز حصہ جو قدرے سخت ہوتا ہے، اتار پھینکیے اس میں غذائیت نہیں ہوتی۔

سیب

شاید آپ کے لیے یہ بات تعجب خیز ہو کہ سیب میں موجود بیشتر وٹامن معدنیات اور دیگر غذائی عناصر اس کے چھلکے میں پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے ہمیشہ سیب کو چھلکے سمیت کھائیے۔

سیب کا چھلکا وٹامن اے وافر رکھتا ہے۔ جب کہ کیلشیم، پوٹاشیم، فاسفورس اور فولاد جیسی معدنیات چھلکے میں پائی جاتی ہیں۔ یہ چھلکا پیکٹن (Pectin) نامی حل پذیر ریشہ بھی بکثرت رکھتا ہے۔ پیکٹن ہمارے خون میں کولیسٹرول کی سطح کم کرتا ہے نیز سطح شکر کو بھی قابو سے باہر نہیں ہونے دیتا۔

آم

اللہ تعالیٰ نے پھلوں کے بادشاہ کی جلد میں غذائی اجزا رکھے ہیں۔ ان میں نمایاں ضد تکسیدی مادے ہیں جن کی مختلف اقسام ہیں۔ ان مادوں میں سے پولی فینول (Polyphenol)، انتھو سائنینز (Anthocyanins)، کاروٹینوئڈز (Carotenodis) آم کے چھلکے میں ملتے ہیں۔

درج بالا تینوں ضد تکسیدی مادے بہت طاقتور ہیں۔ یہ بڑھاپا روکتے اور ہمیں مختلف خطرناک امراض مثلاً سرطان (کینسر)، ذیابیطس اور گٹھیا سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر ضد تکسیدی اور کیمیائی مادے بھی آم کے چھلکے میں ملتے ہیں۔

لہٰذا کوشش کیجیے کہ آم چھلکے سمیت کھائیے۔ آم کھانے سے پہلے پانی سے اچھی طرح دھو لیا جائے تو چھلکے کی کثافت دور ہو جاتی ہے۔

اب ذیل میں دنیائے طب سے آنے والی تین اہم طبی خبریں پیش ہیں۔ یہ تندرستی پانے میں آپ کی معاون ثابت ہوں گی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

صرف ۱۰ منٹ میں تندرستی پائیے

چودہ سال پہلے کی بات ہے، امریکی طبی ادارے جان اوشنر ہارٹ اینڈ ویسکولر انسٹی ٹیوٹ نیو اورلینز نے "۵۵ ہزار" مرد و زن پر ایک تحقیق کا آغاز کیا۔ ان زیرِ تحقیق مرد و زن کی عمر ۱۸ تا ۱۰۰ سال تھی۔

یہ ۵۵ ہزار انسان ہفتے میں کم یا زیادہ ورزش کرتے تھے۔ تحقیق کا مقصد یہ جاننا تھا کہ کم ورزش کرنے سے انسان کو کیا طبی فوائد حاصل ہوتے ہیں؟ چودہ برس قبل تحقیق انجام پذیر ہوئی تو اس کے حیرت انگیز نتائج سامنے آئے۔ یہ تحقیق ڈاکٹر کارل لاوی کی قیادت میں انجام پائی۔

تحقیق سے معلوم ہوا کہ انسان روزانہ ۵ تا ۱۰ منٹ بھی دوڑ لے تو وہ حملہ قلب (ہارٹ اٹیک) اور فالج کے خطرے سے خاصی حد تک محفوظ رہتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ تیز بھاگا جائے، انسان آہستہ بھاگ کر بھی درج بالا طبی فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ گویا روزانہ پانچ دس منٹ دوڑنے سے بھی ہمارے قلب کو صحت ملتی ہے۔

یاد رہے، ماہرین طب کو یہ تو معلوم ہو چکا کہ ورزش کرنے سے عمر بڑھتی اور انسان بیماریوں سے بچا رہتا ہے مگر ان کا خیال تھا کہ فوائد پانے کی خاطر ضروری ہے، انسان ہر ہفتے کم از کم ۷۵ منٹ کی سخت ورزش کرے۔ مگر نئی تحقیق کے نتائج شہریوں کے لیے خوش خبری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وجہ یہ کہ آج کل کی مصروف زندگی میں کم ہی مرد و زن ورزش کرنے کا وقت نکال پاتے ہیں۔ مگر اب وہ روزانہ پانچ دس منٹ بھی دوڑ لیں تو خود کو تندرست رکھ سکتے ہیں۔

ایک ممتاز امریکی ماہر طب ڈاکٹر ہیٹر رابرٹ کہتا ہے "اس تحقیق نے ثابت کر دیا کہ معمولی سی جسمانی سرگرمی بھی ہمارے جسم کا انداز کار بدل ڈالتی ہے۔ گویا اب تندرست رہنے کے لیے میراتھن دوڑنا ضروری نہیں بلکہ روزانہ صرف پانچ دس منٹ دوڑنا بھی بہترین طبی سرمایہ کاری ہے۔"

نمک..... اچھا یا برا؟

چند عشرے قبل کی بات ہے، ڈاکٹروں کو بذریعہ تحقیق معلوم ہوا کہ انسان جب نمک زیادہ کھائے تو گردے پانی کی خاصی مقدار جسم میں ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ یوں قدرتاً خون کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تب خون کو رواں دواں رکھنے کی خاطر قلب زیادہ شدت سے کام کرتا ہے اور اگر یہ حالت طویل عرصہ برقرار رہے تو ہائی بلڈ پریشر انسان کو آ دبوچتا ہے۔

نمک کا یہ نقصان دیکھ کر ہی امریکی ڈاکٹروں نے اعلان کر دیا کہ اس معدن کو کم استعمال کیا جائے۔ انھوں نے امریکی شہریوں کو تجویز دی کہ وہ روزانہ زیادہ سے زیادہ ۲۳۰۰ ملی گرام نمک ہی کھائیں۔ ماہرین امراض قلب اس عدد کو مزید نیچے لے گئے یعنی صرف ۱۵۰۰ ملی گرام روزانہ۔

چونکہ دنیا بھر میں امریکی ماہرین طب کی رائے کو مستند سمجھا جاتا ہے لہٰذا دیگر ممالک میں بھی یہ رواج چل نکلا کہ نمک کم سے کم کھایا جائے۔ مگر اب جدید تحقیقات سے انکشاف ہوا کہ نمک کی کمی خصوصاً ان مرد و زن کو بیمار کر دیتی ہے جو محنت والا کام یا سخت ورزش کرتے ہیں۔

یاد رہے کہ بحیثیت معدن نمک ہمارے کئی جسمانی افعال انجام دینے میں معاون بنتا ہے۔ مثلاً اسی کی مدد سے ہمارے خلیے اس قابل ہوتے ہیں کہ دماغ کو پیغامات بھجوائیں اور وصول کریں۔ وہی ہمارے دل کی دھڑکن باقاعدہ رکھتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سخت محنت یا ورزش کے دوران عضلات میں اکڑن جنم لینے کی وجہ سے انسان کو ہاتھ پاؤں دھرتے چھیننا پڑتا ہے۔ نمک ہمیں اس اکڑن سے محفوظ رکھتا ہے۔ مزید برآں یہ پانی جمع رکھنے میں جسم کی مدد کرتا ہے۔ یوں بدن میں پانی کی کمی پیدا نہیں ہو پاتی۔

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ خصوصاً جو مرد و زن سخت ورزش یا محنت والے کام کرتے ہیں، وہ اپنے جسم میں نمک برقرار کم تر ہوتے ہیں..... اور انھیں کو اس معدن کی زیادہ ضرورت بھی ہوتی ہے۔ وجہ یہ کہ جسمانی جدوجہد کے دوران زیادہ پسینا نکلتا ہے۔ یوں جسم سے کثیر مقدار میں نمک خارج ہو جاتا ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ جسمانی مشقت کرنے والے انسان نمک کی معقول مقدار نہ کھائیں تو ان کے عضلات میں درد رہتا ہے۔ نیز وہ ہر وقت تھکن کا شکار رہتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے جب انھیں نمکین غذائیں کھلائیں تو وہ تندرست ہو گئے۔

چناں چہ اب ماہرین طب کا کہنا ہے کہ جو افراد سخت ورزش یا کام کرتے ہیں، انھیں روزانہ ۲۴۲۵ تا ۵۹۰۳ ملی گرام نمک کھانا چاہیے۔ عام افراد بھی موسم گرما میں زیادہ نمک کھا سکتے ہیں کہ تب زیادہ پسینا آتا ہے۔

دہی کی ایک اور خاصیت

پروبائیوٹکس (Probiotics) وہ خورد بینی یا ننھے منے جاندار ہیں جو دہی، پنیر اور کھوئے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ جاندار ہمارے نظام ہضم کو تندرست و توانا رکھتے ہیں۔ اب ایک برطانوی تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ یہ انسان میں بلند فشار خون بھی کم کرتے ہیں۔

ماہرین نے ایک سال تک ایسے ۲۰۰ مرد و زن پہ تحقیق کی جو ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا تھے۔ تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن لوگوں نے غذا میں دہی اور پنیر شامل رکھا، وہ بلند فشار خون کی آفتوں کا کم ہی نشانہ بنے۔ چناں چہ اگر آپ اس موذی بیماری میں مبتلا ہیں تو دہی کھا کر نجات پا سکتے ہیں۔

پروبائیوٹکس ہماری آنتوں میں بستے اور مضر صحت جراثیم کا خاتمہ کرتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ ہمارے جسم کی پولیس ہیں۔ تاہم اینٹی بائیوٹک ادویہ، کافی اور کولڈ ڈرنک کھانے پینے سے صحت کے یہ پاسبان مر جاتے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی ہی سے انسان نظام ہضم کے مختلف امراض مثلاً اسہال کا شکار ہوتا ہے۔

اب تحقیق سے معلوم ہو رہا ہے کہ پروبائیوٹکس دیگر جسمانی افعال و اعضا پر بھی مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ان میں نظام مامون (Immune System)، دماغ، جلد اور خون کا دباؤ شامل ہیں۔

◆◆◆

شیکسپیئر کے اقوال

☆ مرد محبت میں موسم بہار اور شادی کے بعد موسم سرما کی طرح ہوتا ہے۔

☆ جو لوگ اونچی جگہ کھڑے ہو جاتے، انھیں گرانے کے لیے کئی تند ہوائیں چلتی ہیں۔ اگر وہ گر پڑیں تو ان کے جسم کرچیوں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔

☆ بلند حوصلہ انسان کے ہاتھ میں آ کر مٹی بھی سونا بن جاتی ہے۔

☆ محبت ایسی شیرنی ہے جسے چکھ لینے کے بعد دیر تک اس کا ذائقہ برقرار رہتا ہے۔

چاہے آپ برف کی طرح صاف اور شفاف ہوں، تہمت سے نہیں بچ سکتے۔

(انتخاب: روبینہ مظہر، دیپالپور)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

محل تعمیر کرنے میں استعمال کر لیے گئے۔ نرم چونے کے پتھروں یا پالش کیے ہوئے گرینائٹس نے اس کی بالائی سطح کو ڈھکا ہوا تھا لیکن اب ان کا بھی وجود باقی نہیں۔

اس کی ٹوٹی پھوٹی سطح اب بھی متاثر کن ہے۔ ماضی میں ہرم ۴۸۱ فٹ بلند تھا۔ اب اس کی بلندی ۴۵۵ فٹ رہ گئی ہے۔ اس کے نچلے حصے کی چوڑائی ایک سے دوسرے کونے تک ۷۵۶ فٹ ہے۔ اس کا رقبہ ساڑھے بارہ ایکڑ ہے۔ اس کی تعمیر میں پتھر کے ۲۳ لاکھ بلاک استعمال کیے گئے۔ ہر پتھر کا وزن ڈھائی ٹن کے قریب ہے۔ وقت اور انسان کے ہاتھوں شکست و ریخت کے باوجود اس کا رقبہ ۸ کروڑ ۵۰ لاکھ مربع فٹ تک پہنچتا ہے۔

یہ دیو ہیکل عمارت کوئی مندر نہیں کہ دیوتاؤں کی عظمت کا ثبوت پیش کرے۔ یہ شاہی دربار یا دفاعی نوعیت کی عمارت بھی نہیں، صرف ایک مقبرہ ہے۔ یقیناً خوفو اپنے محل کی کھڑکیوں سے اسے تعمیر ہوتا دیکھ کر یقیناً بہت خوش ہوتا ہوگا۔ تاہم خوشی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ فن تعمیر کی محبت نے اسے یہ عظیم عمارت بنانے پر اکسایا، بلکہ اس کو بنانے سے اسے احساس تحفظ ملا۔

یہ تحفظ کسی عام دشمن سے نہیں تھا کیونکہ اس کی افواج شام یا عرب سے حملہ آور ہونے والے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھیں۔ لیکن ایک دشمن ایسا تھا جس کے خلاف کوئی ڈھال کارگر نہ تھی۔ جسے بڑے سے بڑا عظیم لشکر بھی شکست نہیں دے سکتا تھا..... اور وہ دشمن موت تھی۔ اسے بخوبی علم تھا کہ سب انسانوں کی طرح فرعون بھی فانی ہیں۔ وہ دن قریب ہے جب اس کی تمام شان و شوکت اور جاہ و جلال ختم ہوگا اور وہ محض ایک لاش بن جائے گا۔

لیکن وہ موت کو بھی شکست دینا چاہتا تھا۔ اسے دھوکا دینے کا ایک طریقہ تھا۔ مقدس کتابیں اس کے بارے میں بتاتی تھیں۔ یہ فارمولا چند پروہتوں کو معلوم تھا..... ایسے گر جو اتنے کارگر تھے کہ ان کی مدد سے روح کو جسم سے نکلنے کے بعد محفوظ کیا جا سکتا تھا۔

قدیم مصر کی دینیات عجیب و غریب تھی اسے اس کی تمام تر پیچیدگیوں اور گہرائیوں کے ساتھ شاید کبھی نہ سمجھا جا سکے۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ جب تک کسی چیز کا جسم محفوظ ہے تب تک دیوتا روح کو سورج کے نیچے زندہ رہنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اسی لیے فرعون اور دوسرے عظیم لوگ اپنی لاش کو گلنے سڑنے سے بچانے کی بھرپور کوششیں کرتے۔ اس سلسلے میں عجیب و غریب طریقے استعمال کیے جاتے۔ بعدازاں اس لاش کو ایسی جگہوں پر چھپا دیا جاتا جہاں اس کا سراغ نہ لگایا جا سکے۔

اہرام کی تعمیر کے عظیم دور میں یہ رسم تھی کہ ہرم کے وسط میں فرعون کی لاش ایسے کمرے میں رکھتے جسے ایک چٹان تراش کر بنایا جاتا۔ اپنے مقبرے کی تعمیر ہر بادشاہ کی بنیادی دلچسپی بن جاتی۔ وہ بادشاہ بنتے ہی اس کی تعمیر شروع کرتا اور اپنے دور حکومت میں جاری رکھتا۔ اس کی خواہش ہوتی کہ ہرم کی تعمیر کا کام اپنی زندگی ہی میں مکمل ہو جائے۔ یوں اسے ابدی آرام کی جا مل سکتی تھی جہاں اس کا وجود کسی نہ کسی طرح باقی رہتا۔

جب فرعون مرتا تو اس کی لاش کو ممی بنانے والے گروہ کے حوالے کر دیا جاتا۔ وہ مقدس فارمولے کے مطابق یہ کام انجام دیتا۔ لاش دفناتے وقت مختلف رسومات ادا کی جاتیں۔ اس موقع پر قدیم مصری دیوتا اوسیرس کی عبادت ہوتی جسے قتل کر دیا گیا تھا۔ لیکن جو جادوئی عمل کے ذریعے زندہ ہو گیا تھا۔ مصریوں کا اعتقاد تھا، پھر وہ ان لوگوں کو زندگیاں دینے لگا جو اس کی عبادت کرتے اور جن کی ممی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک خاص طریقے سے بنائی جاتی۔

ممی کو ایک سرنگ کے ذریعے ہرم کے اندر بنائے گئے کمرے تک پہنچایا جاتا۔ لاش کو سنگی تابوت میں رکھا جاتا۔ اس کے ساتھ کھانا، پانی، نہانے دھونے کا سامان، جادو کی چھڑی اور دشمنوں و سانپوں سے بچانے کے ٹوٹکے رکھے جاتے۔ پھر گہری سرنگ کو ریت اور بجری سے اس طرح بھرا جاتا کہ کوئی اس کا سراغ نہ لگا سکے۔

خوفو نے اپنی حکومت کے ابتدائی دور ہی میں عظیم ہرم کی تعمیر کا حکم دیا اور حکومت کی کل آمدن کو اس واحد مقصد کی تکمیل پر لگا ڈالا۔ یہ مقصد کیا تھا؟ دنیا کی عظیم ترین عمارت تک ایک چھوٹے سے کمرے میں فنا ہو کر ختم ہو جانا، جب کہ روح دنیا کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی پھرے۔

خوفو کی موت کے دو ہزار سال بعد عظیم یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے مصر کا سفر کیا۔ اس نے پروہتوں سے خوفو کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں۔ پروہتوں نے بتایا کہ خوفو ایک مکار انسان تھا جس نے تاج و تخت سنبھالتے ہی دیوتاؤں کے سامنے ہونے والی تمام قربانیاں بند کر دیں اور معبدوں پر تالے ڈلوا دیے۔ پھر لاکھوں لوگوں کو اپنے مقبرے کی تعمیر کے لیے جبری بھرتی کر لیا۔

مقبرے پر کام کرنے والے ایک لاکھ مزدور دس دس ہزار کے گروہوں یا جتھوں کی شکل میں کام کرتے۔ ہر گروہ ایک وقت میں تین ماہ کام کرتا۔ پتھروں کو ہرم تک لانے پر دس سال صرف ہوئے۔ پتھروں کی کانیں دریائے نیل کے دوسری طرف واقع تھیں۔ بڑے بڑے پتھروں کو جرک کے ذریعے دریا تک لایا جاتا۔ سیلاب آتا تو مزدور انھیں کشتیوں سے اس چٹان کے قریب پہنچاتے جہاں ہرم کی تعمیر جاری تھی۔

پتھر پھر ان سیڑھیوں کے ذریعے اوپر لے جائے جاتے جن کی تعمیر پر بجائے خود دس سال کا عرصہ لگا تھا۔ وہ بھی عظیم ہرم کی طرح حیران کن تھیں۔ یوں پتھر اس سطح مرتفع تک پہنچ جاتے جہاں ہرم کی تعمیر ہوتا تھی۔ ہرم کی تعمیر میں بیس سال کا عرصہ صرف ہوا۔ اسے تین فٹ لمبائی کے پالش کیے ہوئے پتھروں سے بنایا گیا۔ ان پتھروں کو اتنی نفاست سے جوڑا گیا کہ یہ جوڑ ایک انچ کے ہزارویں حصے تک درست ہیں۔

یہ یاد رہے ہرم خوفو کا شمار دنیا کے قدیم سات عجائبات عالم میں ہوتا ہے اور یہ واحد عجوبہ ہے جو اب تک قائم و دائم ہے۔ یہ ۳۸۰۰ سال تک روئے ارض پر انسان ساختہ بلند ترین عمارت رہی۔ تاآنکہ لندن میں ۱۳۱۲ء میں اولڈ پال کیتھیڈرل تعمیر کر لیا گیا۔ اس کی بلندی ۴۸۹ فٹ ہے۔ عظیم مقبرے سے ہٹ کر اس کی ذات کے بارے میں ہمیں زیادہ معلوم نہیں۔ خیال ہے کہ وہ کسی بادشاہ کی اولاد نہیں تھا بلکہ وسطی مصر کے ایک گھرانے سے اس کا تعلق تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے چچی روہن فیرو کے توسط سے اس مقام تک پہنچا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ایک درباری یا جنگجو کی حیثیت سے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔

خوفو کے بارے میں اہم بات یہ ہے کہ اس نے پتھروں کا ایسا ڈیزائن روشناس کرایا جسے دوسروں نے بھی نقل کیا۔ وہ مقبرے نہیں بلکہ ہرم کے نمونے ڈیزائن کا بانی تھا۔ اس کی یہ کامیابی تاریخ کا حصہ بن چکی۔

ماضی میں مشہور تھا کہ ہرم خوفو میں خزانے دفن ہیں۔ اسی لیے خلیفہ مامون الرشید نے اس میں سوراخ کرا کے اندر تک جانے کا راستہ تیار کرایا۔ لیکن جب وہ اس کمرے میں پہنچے جہاں فرعون کی لاش ہونی چاہیے تھی تو وہاں سرخ گرینائٹ کا تابوت چمک رہا تھا۔ اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اس میں سے لاش غائب تھی۔

◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے یا نہیں؟ وہ اسے خط لکھنا چاہتی تھی مگر ولسلیما کوری ان پڑھ تھی اور اس کا بوڑھا شوہر بھی ناخواندہ تھا۔

لیکن اب کرسمس قریب آیا تو ماں کو شدت سے بیٹی کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ وہ گگور کے پاس پہنچ گئی۔ گگور سابق فوجی تھا جو اب مقامی سرائے میں دیہاتیوں کے خطوط لکھا کرتا اور کچھ رقم کما لیتا۔ اس نے خط لکھنے کے 15 کوپک مانگے تو ولسلیما نے ہامی بھر لی۔

بوڑھے میاں بیوی اب گگور کے سامنے بیٹھے تھے۔ یہ سرائے کا باورچی خانہ تھا جو ہمہ اقسام کی خوشبوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ گگور نے سیاہی میں قلم ڈبو کر پوچھا "کیا لکھنا ہے؟"

ماں سوچنے لگی کہ بیٹی کو کن الفاظ سے مخاطب کرے۔ اس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ گھبراہٹ بھی طاری تھی۔ اس نے گگور کو خط لکھوانا شروع کیا "پیاری یفیمیا اور پیارے داماد آندرے ہرلیسن جی! خدا سے دعا ہے کہ تم دونوں جہاں رہو، خوش رہو۔"

"لکھ لیا اب کیا لکھوں؟"

"تمھیں کرسمس کی بہت بہت مبارک باد۔ ہم زندہ ہیں اور خوش وخرم بھی۔ ہمیں یقین ہے تم دونوں بھی خوشی خوشی زندگی بسر کر رہے ہو گے۔ خداوند تم پر اپنا سایہ برقرار رکھے۔ سدا اس کی حفاظت میں رہو۔" یہ کہتے ہوئے بچی ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ رونے لگی۔

ولسلیما پھر کچھ نہ بول سکی۔ لیکن اسی رات جب بوڑھی بیٹی اپنی سوچوں میں گم ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ خط میں بہت سی باتیں نہیں لکھوا سکی۔

جب سے یفیمیا رخصت ہوئی تھی، پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ بیٹی کو یاد کر کے اکثر بوڑھے والدین آنسو بہاتے اور یوں آہیں بھرتے جیسے وہ اسے دفنا کر آئے ہوں۔ تب سے گاؤں میں کئی اموات ہو چکی تھیں اور بہت سے بچوں نے جنم لیا۔ کئی سردیاں گزر گئیں اور راتیں بھی تمام ہوئیں۔

☆

"آج خاصی گرمی ہے۔" گگور کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے بولا۔

بوڑھے میاں بیوی خاموش رہے۔

گگور نے دریافت کیا "تمھارا داماد پیٹرزبرگ میں کیا کام کرتا ہے؟"

بوڑھا کمزور آواز میں بولا "پہلے وہ فوجی تھا۔ پھر فوج چھوڑ کر ایک ڈاکٹر کے ہاں ملازم ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر پانی سے بیماریوں کا علاج کرتا ہے۔"

"اس میں ہمارے داماد کا پتا لکھا ہے۔" بوڑھی نے گگور کو ایک خط تھماتے ہوئے بولی "یہ خط کئی ماہ قبل آیا تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ مر گئی یا زندہ ہے۔"

گگور نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر کاغذ پر تیزی سے لکھنے لگا "اس وقت تمھاری قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ ملٹری کیریئر نے تمھیں بہت کچھ بخشا۔ اب تمھیں چاہیے کہ نظم وضبط کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے دفتر جنگ کے بنیادی اصولوں کا مطالعہ کرو۔ تمھیں دفتر جنگ کے قانون کی تہذیب میں سب کچھ نظر آ جائے گا۔"

یہ خط لکھتے ہوئے گگور انھیں آواز بلند پڑھتا رہا۔ جب کہ ولسلیما یہ سوچنے میں محو تھی کہ وہ بیٹی کو مزید کیا لکھ بھیجے..... کیا یہ کہ وہ بڑی تنگ دستی میں وقت گزار رہے ہیں۔ اس سال ان کی گائے کرسمس سے قبل ہی ختم ہو گئی اور یہ کہ اخراجات پورے کرنے کی خاطر انھیں اپنی گائے فروخت کرنا پڑی۔ وہ بیٹی کو لکھنا چاہتی تھی کہ ہو سکے تو کچھ رقم بھجوا دو۔ اور یہ بھی کہ اس کا باپ بیمار ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کمر دہرے ہوئے ہولے ہولے قدم اٹھاتا سیڑھیاں اترنے لگا جو تہ خانے میں واقع تھیں۔ تہ خانے کے نیچے ایک ہال کے کونے پر اس کا کمرا تھا۔ وہاں اس کی بیوی تھمیا بستر پر بیٹھی نوزائیدہ بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ بڑا بچہ قریب بیٹھا کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ منجھلا محو خواب تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر آندرے نے بیگم کو خط دیا اور بولا "شاید گاؤں سے آیا ہے۔"

وہ پھر اخبار پر نظریں جمانے کمرے سے نکلا اور سیڑھیوں پر کھڑا ہو گیا۔ اسے سنائی دیا کہ تھمیا بھرائی آواز میں خط کے پہلے لفظ پڑھ رہی ہے۔۔۔ اس سے آگے وہ نہ پڑھ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بچے کو مخاطب کر کے غمگین و اداس لہجے میں گویا ہوئی "یہ خط نانا نانی کی طرف سے آیا ہے۔ ہاں ! میرے پیارے گاؤں سے! اف میرے خدا، مجھ پر رحم کر۔ اب تک گاؤں میں برف پڑ چکی ہو گی۔ درخت سفید ہو کے جگمگاتے ہوں گے۔ لڑکے بالوں کی تو موج ہو گی، برف میں خوب پھسلیں گے..... اور تمہارے بوڑھے نانا چولہے سے آگ تاپیں گے۔"

بیگم کی باتیں سن کر آندرے کو یاد آیا، تھمیا نے اسے تین چار بار گاؤں بھجوانے کے لیے خطوط دیے تھے۔ مگر کاموں میں پھنس کر وہ انھیں پوسٹ کرنا بھول گیا۔ بعد ازاں وہ خط ادھر ادھر ہو گئے۔

"اور تمھارے نانا کھیتوں میں دوڑیں گے۔" تھمیا نے بچے کو چومتے اور آنسو بہاتے ہوئے بولنا جاری رکھا۔ "نانا نرم خو اور شریف ہیں، نانی بھی بہت اچھی ہیں، دل کی نیک! گاؤں میں سبھی انھیں پسند کرتے ہیں۔ وہ خدا سے ڈرنے اور گناہوں سے بچنے والے ہیں۔ گاؤں میں چھوٹا سا چرچ بھی ہے جہاں لوگ عبادت کرتے ہیں۔ اے خدا! ہمیں بھی وہاں پہنچا دو۔"

معاملہ آندرے کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ وہ پائپ لینے کے بہانے واپس کمرے میں گھس آیا۔ تھمیا اسے دیکھتے ہی چپ ہو گئی۔ آنسو پونچھے اور بچے کو جھلانے لگی۔ اس کے لب ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔

وہ اپنے شوہر سے ہر دم خوفزدہ رہتی تھی۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر تھمیا کا دل ڈوبنے لگتا۔ آنکھوں میں خوف ابھر آتا اور وہ اس کی موجودگی میں ایک لفظ بولنے کی ہمت نہ کرتی۔

آندرے نے پائپ جلانا چاہا، مگر اسی لمحے اوپر سے گھنٹی کی آواز آئی۔ اس نے [illegible] نظروں سے بیوی کو دیکھا اور جلدی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔

◆◆◆

باکمال لوگ

ایک صاحب اپنے دوست کو بتا رہے تھے: "بھئی یہ پراپرٹی ڈیلر بھی بڑے کمال کے لوگ ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک ڈیلر نے گوادر کی زمین مجھے بیچ دی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہاں زبردست فلیٹ تعمیر ہوں گے اور میں چند لاکھ لگا کر کروڑوں کما لوں گا۔ جب میں نے وہاں جا کر دیکھا تو اس زمین پر دس دس فٹ پانی کھڑا تھا۔"

"اوہ...... حد ہو گئی...... پھر تم اس سے اپنی رقم واپس لینے گئے؟" دوست نے اظہار افسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں گیا تھا...... پیسے تو نہیں ملے۔ البتہ اس نے مجھے ایک لانچ دلوا دی۔" ان صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

(حسنین شبیر، قصور)

WWW.PAKSOCIETY.COM

گئے۔ یہ رقم آج کے حساب سے ۱۳۰٫۳۰ ارب ڈالر (ایک سو تیس کھرب چالیس ارب روپے) بنتی ہے۔

امریکی امداد وصول کرنے والے ممالک میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، ہالینڈ، بیلجیم، سویڈن، ناروے، آسٹریا اور ترکی وغیرہ شامل تھے۔ اسی امداد کے سہارے درج بالا یورپی ممالک میں کاروبار زندگی از سرنو شروع ہوا۔ بعد ازاں وہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی طور پر مستحکم و مضبوط ممالک بن کر ابھرے۔

وہ کون سی وجوہ ہیں کہ ۱۰۳ ارب ڈالر پا کر بھی افغانستان بدستور غریب، غیر مستحکم اور کمزور ملک کی حیثیت رکھتا ہے؟ بڑی وجہ یہ ہے کہ پچھلے تیرہ برس میں افغان قوم کو دیانت دار، محب وطن اور اہل قیادت میسر نہیں آ سکی۔ یہ پس ماندہ ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

افغانستان کو جو امریکی و بیرونی امداد ملی، اس کا بیشتر حصہ حکمران طبقہ فی الحقیقت سے چٹ کر گیا۔ اسی لیے ملک بھر میں کہیں کہیں ترقیاتی منصوبے شروع ہو سکے۔ جو اسپتال، اسکول، سڑکیں، پل اور سرکاری عمارتیں تعمیر بھی ہوئیں، ان میں ناقص و سستا میٹریل استعمال کیا گیا۔ یہی وجہ ہے آج وہ تباہ حالی کا شکار ہیں۔

آج بھی سوا تین کروڑ افغانوں میں سے نصف شدید غربت کا شکار ہیں۔ انھیں عام سہولیات زندگی بھی میسر نہیں اور وہ محنت و مشقت کے بعد ہی جسم و جاں کا رشتہ قائم رکھ پاتے ہیں۔ دوسری طرف افغان حکمران طبقہ جو معاشرے کا ایک فیصد بھی نہیں، عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے۔

حکمران طبقے کی عیاشیوں کے باعث ہی افغان عوام طالبان کو نجات دہندہ سمجھنے لگے۔ حقیقتاً افغان حکومت صرف کابل تک محدود ہے۔ جیسے ہی امریکی و نیٹو افواج رخصت ہوئیں، طالبان اور افغان فوج کے مابین خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔

افغان فوج تقریباً ساڑھے تین لاکھ فوجیوں پر مشتمل ہے۔ یہ فوجی امریکی، یورپی اور بھارتی ماہرین سے تربیت یافتہ ہیں۔ ان کے پاس طالبان کی نسبت جدید اور وافر اسلحہ ہے۔ لیکن میدان جنگ میں اکثر جوش و ولولہ بڑی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

مثال کے طور پر عراق کا معاملہ دیکھیے۔ وہاں بھی امریکی تربیت یافتہ جدید ترین اسلحے سے لیس عراقی فوج چھوڑ کر گئے تھے۔ لیکن جب داعش (آئی ایس آئی ایس) کے جوشیلے جوان عراق کے صوبوں پر حملہ آور ہوئے تو عراقی فوج دم دبا کر وہاں سے بھاگ گئی۔ سو جوش و خروش سے بھرے طالبان کا سامنا کرتے ہوئے افغان فوج کا بھی یہی حال ہو سکتا ہے۔

پورے امریکی اب تک افغان جنگ میں ایک ٹریلین ڈالر (ایک ہزار کھرب روپے) جھونک چکے۔ ثمر حاصل کچھ نہ ہوا۔ بلکہ امریکا میں مقروض قومیں کی کھیپ پیدا ہو گئی۔ اندازہ ہے کہ ان مقروضوں کے علاج پر مزید ایک ٹریلین ڈالر خرچ ہو جائیں گے۔

ارنسٹ ہیمنگوے مشہور امریکی ادیب گزرا ہے۔ اس کا قول ہے ''جنگ کتنی ہی ضروری ہو، اسے جرم ہی سمجھا جائے گا۔'' حیرت یہ ہے کہ یہ جرم کرنے کے بعد جنگ چھوڑنے والے ملک کو نقصان ہی اٹھانا پڑتا ہے مگر تاریخ سے کوئی حکمران سبق نہیں سیکھتا۔ شاید اسی لیے کہ کم ہی حکمران تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اور جب تک انھیں عقل آئے، تو چڑیاں کھیت چگ چکی ہوتی ہیں۔

چین کا پاکستان پر دباؤ

پچھلے چند ماہ میں علیحدگی پسند الغوروں نے چین کے مختلف شہروں میں چینی شہریوں پر حملے کیے اور یوں ہائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

سطح پر توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ان ایغوروں کی داستان المناک اور غمگین ہے۔

ایغور یا اویغور ترک النسل مسلمان ہیں جن کی بڑی تعداد چین کے ایک نیم خودمختار صوبے سنکیانگ میں بستی ہے۔ فی الوقت صوبے کی ۴۳ فیصد آبادی ایغوروں پر مشتمل ہے۔ یہ علاقہ مشرقی ترکستان اور ایغورستان بھی کہلاتا ہے۔ مسلمانان ہند کی طرح یہ ایغور بھی سنکیانگ کو آزاد مملکت بنانا چاہتے ہیں تاکہ وہاں اسلامی طور طریقوں سے زندگی بسر کر سکیں۔ مگر چینی حکمران یہ علاقہ چھوڑنے کو تیار نہیں۔

چونکہ چین میں سب سے زیادہ قدرتی گیس سنکیانگ ہی سے نکلتی ہے۔ مزید براں علاقے میں قیمتی معدنیات اور قدرتی وسائل بھی پائے جاتے ہیں۔ چینی حکومت ہر قیمت پر یہ قیمتی علاقہ ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے۔

سنکیانگ میں اسلام صوفیا نے پھیلایا۔ مزید براں وہاں بہت سے ترک قبائل بھی آباد ہو گئے۔ سولہویں صدی عیسوی تک اسلام اس علاقے میں پھیل چکا تھا۔ سنکیانگ کے مسلمان تاریخ میں ایغور کہلائے۔ رفتہ رفتہ چینیوں اور ایغوروں میں تصادم شروع ہوا۔ علاقے میں کبھی ایغور اپنی حکومت قائم کر لیتے تو کبھی چینی انہیں شکست دینے میں کامیاب رہتے۔

چینی حکومت نے سنکیانگ کو چین میں جذب کرنے کی خاطر شروع ہی سے یہ حربہ اختیار کیا کہ جب بھی وہ علاقے پر قابض ہوتی، بڑی تعداد میں چینی شہری وہاں بسا دیتی۔ یوں ایغوروں کی آبادی کا تناسب کم ہو جاتا۔ لیکن جب ایغور طاقت پکڑتے تو چینی شہری واپس چین بھاگ جاتے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جب قوم پرست چینیوں اور چینی کمیونسٹوں کا ٹکراؤ ہوا تو ایغور مسلمانوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۹۳۳ء میں اپنی آزاد مملکت قائم کر لی۔ اس وقت سنکیانگ میں ۸۰ فیصد آبادی ایغور تھی جبکہ صرف سات فیصد (ہان) چینی وہاں بستے تھے۔ تاہم اگلے سال ماؤزے تنگ کی فوج نے ایغوروں کی مملکت ختم کر دی۔

چنانچہ ۱۹۳۴ء سے مختلف ایغور گروہ تحریک آزادی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ تحریک کبھی ماند پڑ جاتی ہے کبھی اس میں تیزی آ جاتی ہے۔ چینی حکومت ایغور علیحدگی پسندوں سے نہایت سختی کے ساتھ نپٹتی اور ان پر ہر قسم کا ظلم روا رکھتی ہے۔ چونکہ سنکیانگ میں عالمی میڈیا کا عمل دخل بہت کم ہے، یوں ایغوروں پر مظالم کی داستانیں سامنے نہیں آ پاتیں۔

کمیونسٹ حکومت نے بھی سنکیانگ پر قبضے کی خاطر پرانا حربہ اختیار کیا اور وہاں بڑی تعداد میں چینی شہری بسائے گئے۔ چنانچہ آج سنکیانگ کی کل آبادی میں سے ۴۱ فیصد (ہان) چینی ہیں جبکہ ایغور صرف ۴۳ فیصد رہ گئے۔ گویا وہ وقت دور نہیں جب ایغور اپنے ہی وطن میں اقلیت بن جائیں گے۔ یوں چینی حکومت نے مشرقی ترکستان پر لڑے بھڑے بغیر قبضہ کر لیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

چینی حکومت کا دعویٰ تھا کہ ایغور علیحدگی پسند شمالی وزیرستان میں عسکری تربیت پاتے اور پھر واپس آ کر چینی شہروں میں پرتشدد کارروائیاں کرتے تھے۔ اسی لیے چین نے پاکستان پر زور دیا کہ وہ شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن شروع کرے۔ تاہم یہ امر مغربی ماہرین عسکریات کی ازلی افواہ بھی ہو سکتی ہے۔

بھارت میں جنم لیتا زرعی انقلاب

برصغیر پاک و ہند میں اس سال مون سون کی بارشیں کم ہوئی ہیں۔ ماضی میں بارشیں نہ ہونے سے شمالی بھارت کے کسان پریشان ہو جاتے تھے کیونکہ خصوصاً چاول کی فصل انہی کے ذریعے پنپتی ہے۔ مگر اب بارشیں کم ہوں تب بھی چاول اگانے والے ہزارہا بھارتی کسان متفکر نہیں ہوتے۔

وجہ یہ کہ بھارتی زرعی سائنس دان چاول کی ایسی اقسام ایجاد کر چکے جو کم پانی میں بھی فصل دیتی ہیں۔ مزید برآں بھارتی کسان کھیت میں پانی دینے کے جدید طریق ڈرپ اریگیشن اور دیگر زرعی ٹیکنالوجی سے بھی بھرپور فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

جدید ٹیکنالوجی سے استفادے کا نتیجہ ہے کہ بارشیں کم ہونے کے باوجود چاول کی بھارتی فصل پر برے اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ پچھلے برس بھارت میں تقریباً ۱۰ کروڑ ٹن چاول پیدا ہوا تھا۔ اس سال بھی ساڑھے دس کروڑ ٹن چاول بھارتی کسان پیدا کریں گے۔

یاد رہے بھارت ۲۰۱۲ء میں تھائی لینڈ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے چاول کا سب سے بڑا برآمد کنندہ بن چکا۔ اس سال بھی بھارت ۹۷ لاکھ ٹن چاول برآمد کرے گا۔ چاول کی بھرپور فصل نے جہاں بھارتی کسانوں کو خوشحال بنا دیا اور وہ زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

بھارتی زرعی سائنس دانوں نے ۲۰۰۳ء میں چاول کا ایسا پہلا دوغلا (ہائی برڈ) بیج "پوسا ۱۱۲۱" (Pusa 1121) متعارف کرایا جو کم بارش میں بھی فصل دیتا ہے۔ بلکہ اس نے فی ہیکٹر چاول کی پیداوار تین چار ٹن سے بڑھا کر چھے ٹن تک پہنچا دی ہے۔

پچھلے سال بھارتی ماہرین زراعت نے نیا دوغلا بیج "پوسا ۱۵۰۹" ایجاد کیا۔ یہ بھی پوسا ۱۱۲۱ جیسی خصوصیات کا حامل ہے۔ زائد خاصیت یہ ہے کہ چاول کی فصل ۱۴۵ دن کے بجائے صرف ۱۱۰ دن میں تیار کر دیتا ہے۔

فی الوقت بھارت میں ۷۰ فیصد چاول "پوسا ۱۱۲۱" کے ذریعے اگایا جا رہا ہے۔ تاہم بھارتی حکومت پوسا ۱۵۰۹ بیجوں کے تھیلے سستے داموں فروخت کر رہی ہے۔ مدعا یہی ہے کہ اگلے چند برس میں ملک کا بیشتر چاول اسی بیج سے اگایا جائے۔

پاکستان میں بھی پانی تیزی سے نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا پاکستانی زرعی سائنس دانوں کو چاہیے کہ چاول، گندم اور دیگر غذاؤں کے اچھے سخت جان بیج تیار کریں جو شدید موسمی اثرات میں بھی پیداوار دے سکیں۔ یوں کروڑوں پاکستانیوں کا پیٹ بھرنے کے لیے وافر غذا میسر آ سکے گی۔

◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ریاستی دہشت گردی کا بزدلانہ مظاہرہ

لہولہو فلسطین

اسرائیلی قاتل اتنے بزدل تھے کہ دور بیٹھے توپوں، ٹینکوں، ڈرونوں اور طیاروں سے نہتے فلسطینیوں کو نشانہ بناتے رہے

ڈاکٹر انوار الحق

چشم فلک نے انسان نما درندوں کی سفاکی اور منظم ریاستی دہشت گردی کے کئی مناظر دیکھے ہیں۔ لیکن ۲۹ دنوں میں غزہ میں نہتے شہریوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ایسے مناظر بہت کم نظر آتے ہیں۔

افواج کا آپس میں لڑنا اور قتل و غارت کرنا تو میدان کارزار گرم ہوتا ہے لیکن ننھے منے پھول جیسے بچوں، عورتوں، مریضوں کو چن چن کر انتہائی بے دردی سے قتل کرنا انسانی تاریخ کے غیرمعمولی واقعات میں سے ہے۔ قاتل اور دہشت گرد اتنے بزدل تھے کہ دور بیٹھے ڈرونوں، توپوں، ٹینکوں اور جنگی جہازوں سے گولہ باری کرتے رہے۔ ان میں مردوں کے مانند سامنے آ کر مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

دنیا بھر کی حمایت اور امداد کے باوجود اسرائیل

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فوجیوں سے زیادہ کم ہمت اور بزدل فوجی کسی نے نہیں دیکھے۔ بزدلانہ ریاستی اور انفرادی دہشت گردی یہودیوں اور اسرائیل کی تاریخ کا حصہ ہے۔ فلسطین پر ناصبانہ قبضے سے بھی پہلے یہودی دہشت گرد نہتے افراد بالخصوص خواتین اور بچوں کو شکار بناتے رہے ہیں۔ اسرائیلی وزیراعظم نے ایام جوانی میں فلسطینی خواتین کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔

وزیراعظم بنا تو بیگن نے لبنان پر وحشیانہ بمباری کر کے بے گناہ انسانوں کا خوب خون بہایا۔ لطف کی بات یہ کہ اتنے بڑے دہشت گرد کو امن کا نوبل انعام عطا کر دیا گیا! اسرائیل کے وزیر دفاع ایریل شیرون نے صبرا اور شاتیلا مہاجرین کیمپ میں کئی ہزار نہتی فلسطینی خواتین کا قتل عام کیا۔ اس سے قبل فلسطینی مردوں کو کنٹینروں میں بند کر کے [illegible] قتل کر دیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اسرائیلیوں اور یہودیوں کے اندر اتنی درندگی کیوں ہے؟ ان کے دل پتھر سے زیادہ سخت کیوں ہیں؟ تاریخ سے سبق ملتا ہے کہ بدبختی اور خود بازی کے باعث شیطان انسانی ایمان پر قابض ہو جاتا ہے۔ جب دل سیاہ ہو جائے تو پھر انسان پاگلوں جیسی حرکات کرتا ہے۔ وہ اللہ پر بھروسا نہیں کرتا اور مادہ پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر انسان اس حقیر اور ذلت آمیز مقام پر پہنچ جاتا ہے جسے قرآن مجید نے پست ترین قرار دیا ہے۔ وہ ذلت اور پستی کی ایسی گہرائیوں میں جا گرتا ہے جہاں کوئی مخلوق پہنچ ہی نہیں سکتی۔

ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹمی دھماکوں سے چشم زدن میں لاکھوں افراد کو قتل کر دینا بھی اسی شقی کا غماز ہے۔ تاریخ شاہد ہے یہودیوں نے اپنے محسنوں کو بھی نہیں بخشا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سودی کاروبار سے منع کیا تو انھیں قتل کرنے کی کوششیں کیں لیکن منہ کی کھائی۔ بعدازاں یہودی ربی پال نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت پرستی کا ڈھونگ رچا کر عیسائیوں کو شرک میں مبتلا کر دیا۔ شخصیت پرستی کے بھیس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیغام اور دین کی بیخ کنی کرنا انتہائی مکارانہ نفسیاتی حربہ تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور ان کی زندگی کو قرآن مجید میں محفوظ کر لیا۔ متعصب یہودیوں کو سب سے زیادہ خطرہ قرآن مجید ہی سے ہے کیونکہ یہ کتاب مقدس ان کی غلط کاریوں اور حرکتوں کے خلاف سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

آج تمام دنیا سپرپاور اور یورپی حکومتیں اسرائیل کی بھرپور عسکری اور مالی مدد کرتی ہیں۔ جبکہ مٹھی بھر فلسطینی اور افغان صیہونی عزائم کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ تمام تر مالی اور جانی نقصانات اٹھا کر بھی دشمن کے خلاف سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ان میں ایمانی قوت موجود ہے۔ صرف مسلمان ہی صیہونی جارحیت کا شکار نہیں، صیہونی دہشت گردی کے بے شمار روپ ہیں۔

مثلاً معاشی دہشت گردی جس کے ذریعے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک اقوام عالم کا خون چوستے ہیں۔ مختلف ممالک کے درمیان جنگیں برپا کر کے اپنا اسلحہ بیچنا۔ بے حیائی اور فحاشی پھیلا کر خاندانی نظام تباہ کرنا۔ بیہودہ اور بے بنیاد افکار پھیلا کر لوگوں میں کنفیوژن اور انتشار پیدا کرنا۔ ہیروئن کی اسمگلنگ سے لوگوں کو نشئی بنا کر برباد کرنا اور ان کی تباہی پہ [illegible]

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سرپرستی کرنا جس سے عوام خوف و ہراس اور لاقانونیت کا شکار ہو جائیں اور بھتہ دینے پر مجبور ہوں۔ صیہونی یہودی ان تمام شیطانی حرکات سے انسانیت کو مضطرب کر رہے ہیں۔

غزہ پر حالیہ حملے تو ایک طرف، وہاں کے مسلمانوں کو گھیرے میں لے کر ان کی زندگی تباہ کر دینا بھی کم عذاب نہیں۔ وہ سارا سال غزہ کے نہتے مسلمانوں پر طاری رہتا ہے۔ مصر میں جمہوری حکومت کے قیام سے غزہ کے مسلمانوں کو کچھ تقویت ملی تھی مگر اسرائیل نے امریکا کی مدد سے مصر میں ہنگامے کروائے۔ ڈاکٹر مرسی کی حکومت کا تختہ الٹا اور مسلمانان غزہ کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا۔ لیکن الحمدللہ غزہ کے مسلمان تمام مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے ہیں اور ان کے عزم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

رسول پاکؐ نے فرمایا ہے ''امت مسلمہ جسم واحد ہے۔ اس کے کسی حصے میں اگر تکلیف ہو تو پورا جسم تکلیف میں آ کر بے خواب ہو جاتا ہے۔'' ہمیں بھی اپنے بھائیوں کی تکالیف محسوس کر کے متحدہ امت کی طرح اٹھنا چاہیے۔ اس ضمن میں ہم مندرجہ ذیل اہم کام انجام دے سکتے ہیں:

☆ یہودی مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ کر دیجیے۔ مسلم ممالک اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور اپنی معیاری مصنوعات تیار کریں۔ اس سے خطیر زرمبادلہ بچے گا اور ہمارے نوجوانوں کو روزگار بھی مہیا ہو گا۔

☆ قرآن مجید کا سبق سمجھ کر کثرت سے مطالعہ کیجیے۔ قرآن مجید نے بھرپور طریقے سے یہودی نفسیات اور تاریخ کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ قرآن مجید کثرت سے پڑھنے والے یہودی چالوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ترکی کی خلافت عثمانیہ کا خاتمہ یوں ہوا کہ سلطان عبدالحمید نے رحم کھا کر یہودیوں کو ترکی میں بسنے کی اجازت دی۔ یہودیوں نے چند ہی برسوں میں فری میسنری اور اس کی مختلف شاخیں قائم کر کے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا۔

◆◆◆

ایسا بھی ہوتا ہے

ریل کا سفر جاری تھا۔ ان ڈور گیمز کے شوقین ایک صاحب نے اپنے سامنے والی نشست پر بیٹھے شخص سے کہا ''جناب! خاصا لمبا سفر ہے۔ آئیے کچھ دیر تاش کھیل لیجیے۔ وقت اچھا گزر جائے گا۔''

''جی نہیں، میں تاش نہیں کھیلتا۔ زندگی میں صرف ایک بار کھیلا تھا، اس کے بعد دل نہیں چاہا۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''اچھا تو تھوڑی دیر شطرنج ہی کھیل لیتے ہیں۔'' ان صاحب نے دعوت دی۔

''جی نہیں، شطرنج بھی نہیں کھیلتا۔ ایک بار کھیلی تھی پھر کبھی دل نے گوارا نہیں کیا۔'' اس شخص نے یہ دعوت بھی مسترد کر دی۔

''اچھا... تو میرے پاس لڈو بھی ہے، وہ کھیل لیتے ہیں۔'' وہ صاحب ہار ماننے والے نہیں تھے۔

''میں تو لڈو بھی نہیں کھیلتا...... لیکن میرا بیٹا آپ کے ساتھ کھیل لے گا۔'' اس شخص نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... کوئی مضائقہ نہیں۔'' ان صاحب نے ملائمت سے کہا ''غالباً یہ صاحبزادے آپ کی اکلوتی اولاد ہوں گے۔''

(مراسلہ: مہر اشتیاق، اوکاڑہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
چناروں کی قطار
سے بھرپور داستان جس پر وارثوں کے
مابین قانونی جنگ کا آغاز ہو گیا
اردو ڈائجسٹ 212
ستمبر 2014ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

گزشتہ اقساط کی تلخیص

اکہتر سالہ سیتھ ہیورڈ نے چنار کے ایک درخت سے لٹک کر گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال لیا۔ اس نے نہایت عمدہ سیاہی مائل سوٹ پہن رکھا تھا۔ چونکہ بارش ہو رہی تھی اس لیے وہ مکمل طور پر بھیگا ہوا تھا۔ وہ خوش مزاج شخص تھا اور اکثر چرچ بھی جاتا تھا۔ اس کی دو سابق بیویاں تھیں جنھوں نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ سیتھ کے دو بچے تھے جو کہیں اور رہتے اور باپ سے بہت کم ملتے تھے۔ سیتھ ہیورڈ ایک فارم ہاؤس اور اس کے ارد گرد درختوں سے پُر قطعہ زمین کا مالک تھا اور تعمیراتی لکڑی کا کامیاب کاروبار کرتا تھا۔ خودکشی سے پہلے سیتھ نے اپنے ایک ملازم کیلون کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ اسے فلاں جگہ ملے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو مسٹر سیتھ کی گاڑی کھڑی تھی اور ان کی لاش درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس نے پولیس کو فون کیا۔ پولیس افسروں نے آ کر سیتھ کی تصویریں لیں اور لاش درخت سے اتار کر ایمبولنس میں رکھی۔ فورڈ کاؤنٹی کا شیرف اوزی والز بھی وہاں آ پہنچا۔ وہ سیتھ ہیورڈ کو جانتا تھا۔ ایک افسر کیلون کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ جہاں اسے باورچی خانے کے میز پر سیتھ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس نے اپنی جان خود لی ہے اور اس کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے اور اپنی تجہیز و تکفین کے بارے میں کچھ ہدایات بھی لکھ دی تھیں۔

فورڈ کاؤنٹی میں جیک بریگینس ایک مشہور اور نیک نام وکیل تھا۔ کارل ہیلی کا مشہور مقدمہ جیتنے کے باعث وہ شہرت اور عظمت کی بلندیوں پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس کے بعد مقدمے کے مخالف دہشت گردوں نے اس کے مکان کو جلا دیا۔ اب وہ کرائے کے معمولی سے مکان میں رہتا تھا۔ مکان کی انشورنس کا معاملہ ابھی تصفیہ طلب تھا۔ چار دہشت گرد اب قید کی سزا بھگت رہے تھے۔ کچھ کہیں اور منتقل ہو چکے تھے۔ اس لیے جیک ہمیشہ پستول ہمراہ رکھتا تھا۔ وہ صبح جلدی اٹھتا اور تیار ہو کر دفتر چلا جاتا۔ اس کی بیوی کارلا اسکول ٹیچر تھی۔ وہ بعد میں تیار ہو کر اپنی بیٹی حنا کو ساتھ لے کر اسکول چلی جاتی تھی۔ جب جیک گھر سے باہر نکلا تو اس نے پولیس افسر ڈپٹی کو ہیلو کہا جسے اوزی والز نے بریگینس فیملی کی حفاظت کے لیے وہاں متعین کر رکھا تھا۔ وہ جلد ہی پرانی امریکی گاڑی میں اپنے دفتر کے قریب کلینٹن کی کافی شاپ پر پہنچ گیا۔ کافی پیتے ہوئے اس نے دوستوں سے سیتھ ہیورڈ کی خودکشی پر گفتگو کی۔ اس نے سیتھ کی جائداد اور ممکنہ وصیت میں دلچسپی لی کیونکہ اس کا مطلب کسی وکیل کے لیے اچھی خاصی فیس ہوتا ہے۔ جیک حسب معمول کلینٹن چوک میں روزانہ کی چہل قدمی کے بعد اپنے شاندار دفتر میں داخل ہو گیا۔ اس کی سیکرٹری راکسی نچلی منزل پر استقبالیہ کمرے میں بیٹھتی اور وہ خود بالائی منزل پر بیٹھتا تھا۔ اس روز کی ڈاک میں جیک کو اپنے نام ایک لفافہ ملا جس پر لکھنے والے کا نام سیتھ ہیورڈ تحریر تھا۔ اس نے لفافہ احتیاط سے کھولا۔ اس میں سیتھ ہیورڈ کا ایک خط برآمد ہوا جس میں اس نے اپنی خودکشی کی اطلاع دی تھی اور اپنی وصیت کے معاملے میں اس کو اپنا وکیل نامزد کیا تھا۔ خط کے ساتھ سیتھ کی لکھی وصیت بھی تھی جس میں اس نے اپنے دونوں بچوں اور دونوں سابق بیویوں کو جائداد سے محروم کر دیا تھا اور جائداد کا نوے فیصد حصہ اپنی ملازمہ اور دوست لیٹی لینگ کے نام کر دیا تھا جس نے بیماری کے زمانے میں اس کی خدمت کی تھی۔ جیک نے خط اور وصیت کی ایک نقل راکسی کو دی۔ وہ نقول اپنے ڈیسک میں رکھیں اور ایک نقل جیک کے لاکر میں رکھ دی۔ اس کے بعد وہ کاؤنٹی شیرف اوزی والز سے ملنے اس کے دفتر گیا۔ دونوں نے تھوڑی دیر سیتھ ہیورڈ کی خودکشی اس کی وصیت اور سیاہ فام لیٹی لینگ کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔

اوزی نے بتایا کہ وہ لیٹی لینگ کو جانتا ہے۔ وہ ایک چھوٹی آبادی لٹل ڈفنا میں رہتی ہے۔ اس کی شادی سائمن لینگ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے ہوئی ہے جو نکمّا اور آوارہ ہے اور شراب نوشی کرتا ہے۔ ان کے چار یا پانچ بچے ... کو قید جا چکے ہیں۔ ایک لڑکی فوج میں ہے۔ لیٹی بیالیس سال کی ہے۔ اس کا تعلق میرتھیا سے ہے۔ جیک ... آپ سیتھ ہیوبرڈ کو جانتے ہیں۔ لوزی نے کہا کہ اس نے مجھے اخراجات کی ادائیگی کے لیے وہ رقم بھی نہیں جو دو ڈالر دے اور بدلے میں کچھ نہیں مانگا۔ وہ بگوزہ میں کا مالک تھا اور عمارتی لکڑی کا کاروبار کرتا تھا لیکن ایک ناخوشگوار طلاق میں وہ بہت کچھ کھو بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ سیتھ کی تجہیز و تکفین کل سہ پہر چار بجے چرچ سے ملحق قبرستان میں ہوگی۔ اس نے فون کر دیا تھا اور اس کے دونوں بچے ہرشل اور ریمونا جلد پہنچ جائیں گے۔

ہرشل ہیوبرڈ ایک گھنٹے میں ممفس سے فورڈ کاؤنٹی سیتھ کے گھر پہنچ گیا۔ پھر اس کی بہن ریمونا اور اس کا شوہر آیان ڈافو بھی پہنچ گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے سے رسمی تعزیت کی۔ صرف ریمونا کافی دیر روتی رہی۔ ہرشل نے اپنے باپ کے بارے میں کوئی جذبات محسوس نہ کیے۔ وہاں ان کی ملاقات سیاہ فام گھریلو ملازمہ لیٹی لینگ سے ہوئی۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ سیتھ اس کو پانچ ڈالر فی گھنٹا کے حساب سے معاوضہ ادا کرتا تھا جو کہ بہت زیادہ تھا۔ سیتھ کے ہمسائے اور چرچ کے دوست خورد و نوش کی اشیا کے ساتھ تعزیت کے لیے آ رہے تھے۔ لیٹی ان سے کیک اور تعزیت وصول کر رہی تھی کیونکہ سیتھ کے بچوں نے کسی سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جلد ہی انھوں نے سیتھ کی وصیت اور بینک اکاؤنٹس کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ دو پولیس افسر آئے اور انھوں نے سیتھ کی کار واپس کر دی۔ انھوں نے سیتھ کا وہ خط بھی واپس کیا جو ان کو ڈائننگ ٹیبل سے ملا تھا اور جس میں سیتھ نے اپنی تجہیز و تکفین کی ہدایات دی تھیں۔

ہیری ریکس طلاق کے مقدمات کا ماہر مشہور وکیل تھا۔ وہ طلاق کے مقدمے میں سیتھ کی دوسری بیوی سائل کا وکیل تھا۔ اس نے جیک کو بتایا کہ اس مقدمے میں اس نے سیتھ کو سارا روپیہ لے لیا تھا۔ کافی رقم خود رکھی اور باقی موکلہ کو دے دی۔ جیک نے اس سے سیتھ کی موجودہ جائداد اور مالی حیثیت کے بارے میں استفسار کیا۔ سیتھ کے وارث گھر کے پچھلے حصے میں بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ لیٹی نے ان کو لنچ پیش کیا۔ لیٹی نے سنا وہ کہہ رہے تھے تجہیز و تکفین کے اگلے دن وہ لیٹی کو ملازمت سے فارغ کر دیں گے اور گھر کو تالا لگا دیں گے۔

رسل ایمبرگ کیفے میں انتظار کرتا رہا اور کافی سے دل بہلا رہا تھا۔ اگرچہ اس نے سیتھ کے ساتھ دس سال کام کیا تھا لیکن وہ وصیتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ دونوں نے مشرقی ریاستوں میں اکٹھے کافی سفر کیا تھا۔ پھر بھی وہ اس کے بہت قریب نہیں تھا۔ ساڑھے سات بجے جیک کیفے میں داخل ہوا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ چند منٹ فٹ بال اور موسم کی باتوں کے بعد اس نے جیک سے پوچھا: ''کیا وصیت تصدیق کے لیے پیش کر دی گئی ہے؟''

''جی ہاں، کل شام پانچ بجے۔ میں جنازے سے سیدھا کلینٹن عدالت خانے آ گیا تھا۔''

''نقل لائے ہو؟''

''بالکل اس میں تم تعمیل کنندہ کے طور پر نامزد ہو۔''

''کیا میرا بھی کوئی حصہ ہے؟''

''نہیں، کچھ نہیں۔ کیا یہ تمہارے لیے حیرت کا باعث ہے؟''

''بالکل نہیں۔''

''تمھیں تعجب نہیں کہ اس نے اپنے آپ کو مار ڈالا؟''

''ہرگز نہیں۔ گزشتہ بارہ مہینے ڈراؤنے خواب کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرح گزر رہے۔ سمتھ دو سے تنگ آ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا
کہ وہ مر رہا ہے۔ ہم بھی جانتے تھے اس لیے کوئی تعجب
نہیں ہوا۔"

اشبرگ نے کافی کا گھونٹ لیا اور کہا "مسٹر بریگینس!
تم سمتھ کو کیسے جانتے تھے؟"

"میں کبھی اس سے نہیں ملا۔" جیک نے کہا۔ "کیا تم
اس کے معتمد ترین ساتھی تھے؟"

"نہیں ہرگز نہیں۔ درحقیقت میں نہیں جانتا کہ سمتھ
نے مجھے اس میں کیوں ملوث کیا۔ کچھ دوسرے افراد اس
کے زیادہ قریب تھے۔ میں تو اس کی ملازمت چھوڑنا چاہتا
تھا۔ وہ جتنی زیادہ دولت کماتا تھا اتنے ہی خطرات مول
لیتا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ سمتھ اپنا مال و زر کسی دوسرے
ملک میں چھپا کر دیوالیہ پن کا اعلان کرنا چاہتا ہے۔"

"اب ہم اس موضوع پر آ گئے ہیں تو آئیے سمتھ کی
دولت کے متعلق بات کریں۔"

"یقیناً لیکن میں سب کچھ نہیں جانتا۔"

"ٹھیک ہے۔" جیک نے کہا۔ "یہ سب کچھ منظر عام
پر آنے والا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا
اور بولا "سمتھ کے پاس بہت دولت تھی اور اس نے سب
کچھ پچھلے دس سالوں میں بنایا۔ دوسری بیوی کی طلاق کے
بعد وہ بہت دل شکستہ اور تلخ ہو گیا تھا اور اس کے باوجود
دولت کمانے کے چکر میں تھا۔ وہ اپنی دوسری بیوی کو واقعی
پسند کرتا تھا اور جب اس نے اسے دھوکا دیا تو وہ انتقام لینے
پر اتر آیا۔ سمتھ کے لیے انتقام کا مطلب تھا اس سے زیادہ
دولت کمانا جتنی وہ طلاق میں وصول کر چکی تھی۔"

"میں اس کی بیوی کے وکیل کو اچھی طرح جانتا
ہوں۔"

"وہ موٹا تازہ آدمی کیا نام ہے اس کا؟"

"بیری رینکس وارٹ۔"

"ہاں ہاں بالکل وہی۔ بہرحال سمتھ کے پاس اپنا
گھر اور زمین تھی۔ اس نے پھر ڈیجن کے قریب ایک
بڑی آرا فیکٹری خریدنے کی خاطر بھاری قرضہ لے لیا۔
میں وہاں عمارتی لکڑی خریدنے کا کام کر رہا تھا۔ اس طرح
میری سمتھ سے جان پہچان ہو گئی۔ اس نے 1979ء کے
اواخر میں یہ فیکٹری سستی خریدی تھی۔ اس کے بعد طوفان
آئے اور گھروں کا بہت نقصان ہوا۔ پلائی ووڈ اور لکڑی کی
خریداری بڑھ گئی اور ہم نے بہت منافع کمایا۔ سمتھ نے
فیکٹری پر قرضہ لیا اور فرنیچر بنانے والے دو کارخانے خرید
لیے۔ پھر راتوں رات ایک ایسے ادارے سے معاہدہ کر لیا
جس کے ملک بھر میں ریستوران تھے۔ سمتھ نے اسے
جھولنے والی کرسیاں بنا کر دیں۔ طلب اتنی زیادہ تھی کہ وہ
تیز رفتاری کے باوجود بمشکل پوری کر سکے۔ سمتھ نے مزید
قرضہ لے کر ایک اور فرنیچر فیکٹری خرید لی۔ تقریباً اسی
وقت اس کا رابطہ برمنگھم کے ایک بینکار سے ہوا جو اپنے
چھوٹے بینک کو بڑے بینک میں تبدیل کرنے کی کوشش
میں مصروف تھا۔ دونوں کا ایک ہی مقصد تھا۔ سمتھ نے
مزید فرنیچر فیکٹریاں، آرا ملیں اور عمارتی لکڑی کے اسٹاک
خریدے اور بینکار نے قرضہ دینے سے کبھی انکار نہ کیا۔
اس نے ایک ہوائی جہاز بھی خریدا جس پر وہ سفر کرتا تھا۔

"کیا اس کے کاروباری جنون کا انجام اچھا ہوا؟"

"ہاں گزشتہ دس برس کے دوران اس نے کاروبار
بہت زیادہ وسیع کر لیا۔ بے شمار کاروباری کمپنیاں اور
فیکٹریاں خریدیں۔ لیکن کوئی چیز فروخت نہیں کی۔ بس
ایک کے بعد دوسرا سودا۔ وہ دولت کی خوشبو سونگھ لیتا تھا۔
پھر تقریباً ایک سال پہلے وہ بیمار ہو گیا۔ جب ڈاکٹروں نے
بتایا کہ وہ پھیپھڑے کے سرطان میں مبتلا ہے اور زیادہ سے
زیادہ ایک سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ تبھی تو اس کی تباہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کا باعث بنی۔ کسی سے مشورہ کیے بغیر اس نے اپنے
ادارے فروخت کر دیے۔ وہ وکیلوں سے نفرت کرتا تھا
لیکن رش لا فرم کے مشورے پر اس نے سارے اداروں کو
ایک کمپنی میں تبدیل کیا اور اٹلانٹا میں ایک گروپ کے
ہاتھ چھپن ملین ڈالر میں فروخت کر دی۔ اس نے اپنا
چھتیس ملین ڈالر کا قرضہ آسانی سے ادا کیا اور باقی بیس
ملین جمع کرا دیا۔ میں پچھلے سال سبکدوش ہو گیا اس لیے
معلوم نہیں اس نے اپنی دولت کو کیا کیا۔ غالباً اس کے
بیرون ملک ایک دو بینک اکاؤنٹ بھی ہیں۔"

"غالباً؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ مسٹر ہبرڈ اپنے
رازوں سے محبت کرتا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ مسٹر امبرگ! آپ کو اور مجھے جلد اس
کے تمام اثاثوں کا پتا چلانا ہوگا۔"

"زیادہ مشکل نہیں۔ ہمیں صرف پامیرا کے نزدیک
اس کے دفتر جانا ہے۔ وہاں اس کی سیکرٹری آرلین مرچ
کی ذمہ دار ہے۔ اتوار کی رات میں نے اسے فون کر دیا تھا
کہ وہ وکلا کے آنے تک ہر چیز مقفل کر دے۔"

جیک نے کافی کا گھونٹ لیا جو تھوڑی ٹھنڈی ہو چکی
تھی اور ساری معلومات ہضم کرتے ہوئے بولا "بیس ملین
ڈالر؟ میں نہیں سمجھتا کہ فورڈ کاؤنٹی میں کسی اور کے پاس
اتنی دولت ہو سکتی ہے۔"

"کیا اس نے اپنے بچوں کو وصیت سے خارج کر
دیا؟"

"ہاں اپنے دونوں بچوں اور سابق بیویوں کو۔ پانچ
پانچ فیصد حصہ اپنے گم شدہ بھائی اینسل اور اپنے چرچ
کے لیے چھوڑا۔ باقی نوے فیصد اپنی سیاہ فام ملازمہ لٹی
لینگ کے لیے چھوڑ گیا۔"

امبرگ کے چہرے پر گہری شکنیں ابھر آئیں۔ اس
نے ہاتھ بڑھا کر جیک سے وصیت کی نقل لی اور دو مرتبہ
بغور پڑھا۔ پھر پوچھا "مسٹر بریگینس! اس نے ایسا کیوں
کیا؟"

"یہی سوال میں آپ سے پوچھنے والا تھا۔"

"یہ وصیت قابل یقین نہیں۔ وہ اپنے ہوش و حواس
میں نہیں تھا۔"

"بے شک نہیں تھا۔ ایک طرف اس نے اپنی موت
کی بہت عجیب منصوبہ بندی کی۔ دوسری طرف ساری
دولت سیاہ فام ملازمہ کے نام کر دینا سمجھ میں نہیں آتا۔"

"جب تک کہ وہ اس پر اثر انداز نہ ہوئی ہو۔ یہ ہاتھ
سے لکھی ہوئی وصیت قابل قبول نہیں ہو سکتی جس میں اس
نے سب کچھ ایک غیر مستحق سیاہ فام ملازمہ کو دے دیا۔ وہ
یقیناً اس کے بہت زیادہ زیر اثر تھا۔"

"مجھے یقین ہے عدالت میں اس پر بحث ہوگی۔"

"اوکے مسٹر بریگینس، میں اس پر غور کروں گا۔
سیٹھ نے وکیل وصیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں شاید اس
جھمیلے میں الجھنا پسند نہ کروں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم تعمیل کنندہ کے طور پر کام کرنے سے
انکار کر سکتے ہو۔ عدالت کسی اور کو مقرر کر دے گی۔"

دونوں کی ملاقات ختم ہوئی۔ جیک سوچ رہا تھا کہ
آئندہ فورڈ کاؤنٹی کے امیر ترین افراد کی فہرست میں لٹی
لینگ کا نام بھی شامل ہوگا۔

☆☆☆

لٹی اپنی ملازمت کے آخری دن آدھا گھنٹا پہلے پہنچ
گئی۔ اس کو امید تھی شاید پابندی وقت کی عادت سے متاثر
ہو کر مسٹر ہرشل اور مسز ڈافو اسے کام جاری رکھنے کی
اجازت دے دیں۔ اس نے کئی ماہ پہلے سے سیٹھ کو مسٹر
سیٹھ کہنا بند کر دیا تھا سوائے دوسرے لوگوں کی موجودگی
میں۔ وہ ان لوگوں سے نفرت کرتی تھی۔ اس نے انہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہتے ہوئے سنا تھا کہ وہ سخت مجبوری میں وہاں دو راتیں ٹھہرے۔ وہ یہاں سے نکلنے کے لیے بے چین تھے۔ باپ کو قتل کرنا ان کے لیے کسی حیثیت سے کم نہیں تھا۔

مسٹر پرکنس کے اس انکشاف کے بعد کہ سیتھ نے اس کے لیے جائداد کا بڑا حصہ چھوڑا ہے، وہ رات بھر سو نہ سکی۔ اپنے شوہر سامسن کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ سب کیسے ممکن ہوا۔ گھر میں داخل ہوئی تو مسٹر ولفنا اپنے کاغذات میں گھرا کام کر رہا تھا۔ لیلی نے سلام کیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اسی وقت گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو ایک تالے مرمت کرنے والا اندر آیا۔ ہرشل نے اسے بتایا کہ گھر کے چاروں بیرونی دروازوں کے تالے تبدیل کر دو۔ ہرشل نے بے رخی سے کہا "لیلی ہم نے تالے لگوا دیے ہیں۔ بھائی چابیاں اب کام نہیں دیں گی۔"

"میرے پاس تو کبھی کوئی چابی تھی ہی نہیں۔" لیلی نے جواب دیا۔

ہرشل نے کہا "دس بجے وکلا آئیں گے۔ اس لیے تمہاری ضرورت نہیں ہو گی۔ مجھے افسوس ہے لیکن ڈیڈی کی موت نے سب کچھ تبدیل کر ڈالا۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" لیلی نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

لیلی بستروں کی چادریں اکٹھی کر رہی تھی جب وکلا پہنچ گئے۔ آیان، ریمونا اور ہرشل بہترین لباس میں ملبوس بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو سے لیلی کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ بلند توقعات رکھتے تھے۔ آیان کے مطابق صرف گھر اور زمین نصف ملین ڈالر کے تھے۔ ابھی معلوم نہیں تھا کہ اور کتنی جائدادیں موجود ہیں۔

تینوں وکلا اور تینوں وارثان نشست گاہ میں جمع ہوئے۔ وہ خوشگوار موڈ میں تھے۔ لیلی نے مشروبات پیش کیے اور پیچھے ہٹ گئی۔ وکلا نے تعزیت کرتے ہوئے سیتھ کی تعریف کی۔ ہرشل اور ریمونا نے مناسب جوابات دیے۔ البتہ آیان بوریت محسوس کر رہا تھا۔ وہ فوراً کام کی بات کرنا چاہتا تھا۔ ہرشل کی تجویز پر وہ اپنی گفتگو راز میں رکھنے کے لیے باہر چلے گئے۔ لیکن لیلی غسل خانے کی کھڑکی سے آتی آوازیں سن سکتی تھی۔ لیوس میک گواٹر نے بریف کیس سے فائل نکالی، وصیت کی تین نقول انھیں دیں اور کہا "ہماری فرم نے ایک سال پہلے یہ وصیت تیار کی تھی۔" ریمونا نے کہا "ہم اس کو بعد میں پڑھیں گے۔ براہ مہربانی ہمیں بتا دیجیے کہ وصیت میں کیا لکھا ہے۔"

"بہت اچھا۔ مختصراً ہرشل اور ریمونا کو چالیس چالیس فیصد حصہ ملے گا۔ پندرہ فیصد پوتوں نواسوں کے لیے ٹرسٹ میں جائے گا اور پانچ فیصد آئرش روڈ چرچ کو ملے گا۔"

"جائداد میں کیا کچھ ہے؟" ہرشل نے پوچھا۔

سٹل مین رش نے جواب دیا "اندازے سے کہیں زیادہ ہے۔"

جب لیلی تازہ کافی لے کر آئی تو افسردگی اور پریشانی کی جگہ اطمینان اور مسرت نے لے لی۔ ظاہر ہے کثیر دولت جو ہاتھ آ رہی تھی۔ لیوس میک گواٹر کا نام وصیت میں تعمیل کنندہ کے طور پر لکھا تھا۔ اسی نے وصیت تیار کی۔ اب قانونی تصدیق بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ تیسرا وکیل سام ہارکن سیتھ کا کاروباری مشیر رہ چکا تھا اور اس کی وہ قابل یقین کامیابی کو اپنے کھاتے میں ڈال رہا۔ میک گواٹر نے وضاحت کی کہ وہ اب عدالت جائیں گے تاکہ وصیت کی تصدیق ہو سکے۔

سٹل مین رش نے کہا کہ یہ معمول کی کارروائی ہے لیکن اس میں وقت لگے گا۔

"کتنا وقت؟" ریمونا نے دریافت کیا۔

میک گواٹر نے کہا "بارہ سے اٹھارہ ماہ کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ یہ زیادہ وقت نہیں کیونکہ اس میں بہت سے بنیادی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"کیا ہم ٹیکسوں کی بات کر سکتے ہیں؟" آیان نے اصرار کے ساتھ کہا۔

میک گوائر نے مسکراتے اور سر ہلاتے ہوئے کہا "اتنی بڑی جائداد پر پچاس فیصد تک ٹیکس لگے گا۔ ہم اپنی مہارت سے اسے تیس فیصد تک کم کر سکتے ہیں۔"

آیان اور ہرشل فوراً حساب لگانے لگے کہ ٹیکسوں کی کٹوتی بعد ان کے ہاتھ کتنی رقم آئے گی۔ اچانک وکلا نے چلنے کی تیاری کی۔ شل مین رش اور دوسروں نے بریف کیس بند کیے، سیتھ خاندان کو خدا حافظ کہا اور چل دیے۔

ریکونا نے صحن کے پار درختوں اور جنگل کی جانب دیکھا جہاں اس نے اپنا بچپن کھیلتے ہوئے گزارا تھا۔ مسٹر اور مسز ڈافو نے جلدی سے ہرشل کو خدا حافظ کہا اور گاڑی میں سوار ہو کر جیکسن کے لیے روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے وقت کیلون آ پہنچا اور ہرشل نے نئے تالوں کی چابیاں اس کے حوالے کیں اور کہا کہ وہ گھر کا خیال رکھے گھاس وغیرہ کاٹے اور خشک پتے ہٹائے۔ ہرشل نے پھر لیٹی کو اخبار تھیلوں کا معاوضہ نوے ڈالر ادا کیے۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے جانے کو کہا۔ لیٹی نے بھی اس کا شکریہ ادا کیا اور نمناک آنکھوں سے اپنے گھر کی راہ لی۔

تین خوش پوش وکلا بعد کی صبح کلینٹن کی عدالت میں اکڑتے ہوئے داخل ہوئے۔ ان کی ملاقات سارہ سے ہوئی جسے جیک برگینس نے اس بارے میں باخبر کر دیا تھا۔ لیٹی لینگ نے بھی فون کر کے اسے وکلا کی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ شل مین رش نے چیونگم چباتی سارہ کی طرف دلکش مسکراہٹ سے دیکھا اور کہا "ہم لا فرم ٹوپیلو سے آئے ہیں۔ ایک وصیت کی تصدیق کے لیے درخواست جمع کرانا چاہتے ہیں۔" سارہ نے بے اعتنائی سے پوچھا "کس کا انتقال ہوا؟"

"سیتھ ہیوبرڈ نامی ایک شخص۔"

سارہ نے چند قدم دور الماری سے ایک فائل نکالی، اس پر ایک نظر ڈالی اور کہا "سیتھ ہیوبرڈ کی آخری وصیت کی تصدیق کے لیے یہ درخواست ہمیں کل شام موصول ہو چکی۔"

تینوں وکلا اپنی جگہ ششدر کھڑے رہے۔ آخر میک گوائر نے کہا "کیا یہ سرکاری ریکارڈ ہے؟"

"جی ہاں۔" اس نے فائل ان کی طرف سرکا دی۔ تینوں وکلا نے اسے غور سے پڑھا اور پانچ منٹ بعد وہ جیک برگینس کے دفتر پہنچ گئے۔ سیکرٹری راکسی نے جیک کو فون پر ان کی آمد کے بارے میں بتایا۔ جیک نے انھیں تیس منٹ انتظار کرنے کا کہا اور خود فورڈ کاؤنٹی ٹائمز کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اخبار میں سیتھ کی تصویر کے ساتھ اس کی مبینہ خودکشی کی تفصیلی رپورٹ موجود تھی۔ اس دوران راکسی نے وکلا کو کانفرنس روم میں بٹھا دیا۔ بالآخر مسٹر برگینس اندر داخل ہوئے اور انھیں خوش آمدید کہا۔

جیک اور شل مین نے دس سال قبل لا اسکول سے اکٹھے امتحان پاس کیا تھا۔ لا فرم کے مالک کا بیٹا ہونے کے باعث شل مین کا مستقبل محفوظ تھا۔ لیکن جیک اور دوسرے وکلا کو ملازمت پانے کے لیے دھکے کھانے پڑے۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ جیک نے ان سے آنے کی وجہ پوچھی۔ شل مین نے کہا کہ میں نے کل آپ کو سیتھ ہیوبرڈ کے جنازے پر دیکھا تھا۔ ہم نے اس کی ہاتھ سے لکھی ہوئی وصیت پڑھ لی ہے جو بذات خود وضاحت طلب ہے۔ میک گوائر نے کہا کہ اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔

"اسے میں نے تیار نہیں کیا۔" جیک نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"لیکن آپ اسے تصدیق کے لیے عدالت میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیش کر رہے ہیں۔ گویا آپ اس کو صحیح دستاویز سمجھتے ہیں۔"

"یقیناً وصیت میرے پاس ڈاک کے ذریعے پہنچا۔ مجھے اس کی تصدیق کی ہدایت کی گئی تھی۔"

"لیکن آپ اس قسم کی مبہم اور ناقابل اعتبار وصیت کی وکالت کیسے کر سکتے ہیں؟" سام لارکن نے وصیت کی نقل دکھاتے ہوئے کہا۔ جیک نے اُسے نفرت سے دیکھا لیکن پرسکون لہجے میں کہا: "ہم سیٹھ ہیوبرڈ کی ہاتھ سے لکھی وصیت کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کر کے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ یہی کام ہم عدالت میں کر سکتے ہیں۔"

"آپ کا سیٹھ ہیوبرڈ سے کیا تعلق ہے؟" سٹل مین نے شائستگی سے پوچھا۔

"میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ وہ اتوار کو فوت ہوا اور اس کی وصیت سوموار کو مجھے ڈاک میں موصول ہوئی۔ آپ کے پاس پہلی وصیت کی کاپیاں ہوں گی۔ کیا مجھے ایک کاپی دینا پسند کریں گے؟"

سٹل مین نے کہا: "اگر وہ وصیت تصدیق کے لیے قبول کی گئی ہوتی اور سرکاری ریکارڈ کا حصہ بن جاتی تو ہم آپ کو اس کی نقل دے دیتے۔ مگر ابھی اسے ایک خفیہ دستاویز سمجھتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک۔"

سٹل مین نے کہا: "ہم چاہتے ہیں کہ آپ وہ ہاتھ سے لکھی ہوئی وصیت واپس لے لیں اور ہمیں مستند وصیت پیش کرنے دیں۔"

"اس کا جواب نفی میں ہے۔"

"کوئی بات نہیں..... آپ ہمارے لیے کیا تجویز کرتے ہیں؟"

"سٹل مین! یہ بہت سادہ بات ہے۔ آیئے ہم عدالت میں ایک مشترکہ درخواست دیں کہ وہ اس صورت حال کا فیصلہ کرے۔"

"ہم بھی یہی سوچ رہے تھے۔" میک گواٹر نے کہا۔

"میں بخوشی اس کا بندوبست کراؤں گا۔" جیک نے کہا۔

انھوں نے گرمجوشی سے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ اگرچہ چاروں یہ بات جانتے تھے کہ جلد ہی ان کے درمیان زبردست معرکہ برپا ہونے والا ہے۔

ہرشل اور آیان ڈلفو ابھی راستے میں تھے جب سٹل مین رش نے انھیں فون کر کے بتایا کہ صورت حال پیچیدہ ہو گئی ہے۔ سیٹھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی آخری وصیت تصدیق کے لیے پیش کی جا چکی ہے۔ اس نے یہ خوفناک اطلاع بھی دی کہ نئی وصیت کے مطابق ہرشل اور ایمونا کو کچھ نہیں ملے گا جب کہ جائیداد کا نوے فیصد سیاہ فام ملازمہ لیٹی لینگ کے نام کیا گیا ہے۔ یہ خبر ان دونوں کے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ سٹل مین نے انھیں تسلی دی کہ وہ اس وصیت کو عدالت کے ذریعے کالعدم کروا دے گا۔

لیٹی وعدے کے مطابق جیک کے دفتر پہنچ گئی۔ اس نے بتایا کہ سائمن جھگڑا کر کے پھر گھر سے چلا گیا ہے اس لیے وہ اکیلی آئی ہے۔ جیک نے اسے بٹھایا اور کافی پیش کی۔ سیٹھ کی وصیت پڑھنے کو دی۔ وصیت پڑھنے کے بعد وہ رونے لگی اور کافی دیر اپنا سر ہاتھوں میں پکڑ کے بیٹھی رہی۔ جب پرسکون ہوئی تو جیک نے پوچھا "لیٹی اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں نہیں جانتی۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نہیں جانتی۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا اس نے وصیت کے بارے میں تمھیں کچھ بتایا تھا؟"

"پچھلے چند ماہ کے دوران ایک دو مرتبہ سیٹھ نے کہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا کہ وہ میرے لیے کچھ چھوڑ جائے گا۔ لیکن اس نے کبھی نہیں بتایا کہ کیا اور کتنا۔"

"کیا تم اسے مسٹر ہیورڈ، مسٹر سیتھ یا صرف سیتھ کے نام سے پکارتی تھیں؟"

"دوسروں کی موجودگی میں مسٹر سیتھ یا مسٹر ہیورڈ کہتی تھی۔ لیکن جب ہم دونوں تنہا ہوتے تھے تو صرف سیتھ کہتی کیونکہ یہی وہ چاہتے تھے۔"

"وہ تمہیں کس نام سے بلاتا تھا؟"

"ہمیشہ لیٹی کے نام سے۔"

لیٹی نے مزید بتایا کہ وہ اس کے کاروبار کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ وہ اپنے کاغذات گھر پر ہمیشہ مقفل رکھتا تھا۔ بعد میں اپنے دفتر میں منتقل کر دیا۔ وہ بہت زیادہ سفر کرتا تھا، چناں چہ گھر پر خاموشی اور تنہائی چھائی رہتی۔ جب وہ موجود ہوتا تو میں کھانا پکاتی اور صفائی کرتی۔ جب وہ زیادہ بیمار ہو گیا تو زیادہ وقت بستر پر ہی رہتا۔ میں ہی اسے کھانا کھلاتی اور نہلاتی۔ جیک نے لیٹی کو بتایا کہ عدالت میں اس پر الزام لگنے کا امکان ہے کہ وہ سیتھ کے بہت قریب تھی اور یہ کہ وہ وصیت کے مندرجات میں اس پر اثر انداز ہوئی۔ جیک اور لیٹی دونوں جانتے تھے کہ ان کا فائدہ اسی بات میں ہے کہ وہ اس الزام کو غلط ثابت کر دیں۔ جیک نے اسے بتایا کہ سیتھ کے سرمائے کی مالیت تقریباً بیس ملین ڈالر ہے جو کسی بینک میں محفوظ ہے۔ اور یہ کہ عدالتی کارروائی میں ایک سال کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ دو گھنٹے کی ملاقات کے بعد لیٹی نم ناک آنکھوں کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

اسی دن سہ پہر کے وقت فورڈ کاؤنٹی ٹائمز کا نامہ نگار جیک کے دفتر پہنچا۔ اس نے سیتھ ہیورڈ کی وصیت، سرمائے کی تفصیلات اور لیٹی لینگ کے بارے میں سوالات کیے۔ جیک نے بیشتر سوالات کے جوابات گول کر دیے اور ہوں ہاں کر کے اسے چلتا کیا۔ اس کے بعد دفتر کا مالک اور سابق وکیل لیوسین ول بینکس آ پہنچا۔ کہنے لگا، وہ فارغ اور بیکار رہنے سے تنگ آ گیا ہے۔ اس لیے دوبارہ قانون کی پریکٹس شروع کرنے کا سوچ رہا ہے اور سیتھ ہیورڈ کے مقدمے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ جیک کے لیے یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔

....☆....

آخر کار جج ریوبن وی ایٹلی دل کی بیماری سے صحت یاب ہو کر ڈیوٹی پر واپس آ گیا۔ وہ گزشتہ تیس سال سے جج کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ غیر جانبدار، بردبار اور وسیع المشرب منصف ہونے کی شہرت رکھتا تھا۔ سیتھ کی موت کے نو دن بعد جج ایٹلی نے مقدمے کی پہلی سماعت کی۔ کمرۂ عدالت وکلا، مدعیان اور ان کے اقربا، سفید اور سیاہ فام متجسسین سے بھرا ہوا تھا۔ فورڈ کاؤنٹی ٹائمز کا رپورٹر ڈوما لی بھی پچھلی قطار میں موجود تھا۔ جج نے کہا۔ "آج ہمارا مقصد مقدمے کی سماعت نہیں بلکہ صرف عدالتی کارروائی کی منصوبہ بندی کرنا ہے۔ میرے علم کے مطابق مسٹر سیتھ ہیورڈ نے دو وصیتیں چھوڑی ہیں۔ ایک اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی آخری وصیت جو مسٹر بریگینس نے تصدیق کے لیے پیش کی ہے۔" جیک نے اثبات میں سر ہلایا۔ "دوسری وصیت گزشتہ سال ستمبر کی تحریر کردہ ہے جسے ہاتھ سے لکھی ہوئی وصیت میں منسوخ کر دیا گیا۔"

کمرۂ عدالت میں وکلا اور ان کے حمایتی تماشائیوں کے دو واضح گروہ دکھائی دے رہے تھے۔ پہلی وصیت کے دفاع میں سیتھ کے ورثا، ان کے وکلا اور سفید فام افراد کی بڑی تعداد موجود تھی۔ دوسری طرف آخری وصیت کے دفاع میں لیٹی لینگ، سائمن، ان کے وکلا اور سیاہ فام افراد کا ایک گروہ موجود تھا۔ بظاہر دکھائی دیتا تھا کہ یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مقدمہ سفید فام اور سیاہ فام گروہوں کے درمیان لڑا جائے گا۔ جج اسٹلی نے مسٹر فشر گ کو اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہونے کی اجازت دے دی اور جیک کو ہدایات کی کہ دس دن کے اندر متبادل تعمیل کنندہ تجویز کیا جائے اور اس کی تقرری کے بعد اس کے ساتھ مل کر مسٹر سیتھ کے اثاثوں کی فہرست تیار کی جائے۔ لیٹی لینگ کے وکیل، مسٹر بک نے جج سے درخواست کی کہ اس کی مؤکلہ کو متبادل تعمیل کنندہ اور ان کی فرم کو اس کا مشیر بنایا جائے۔ جج اسٹلی نے کہا کہ ہمارے قوانین وصیت لکھنے والے کی خواہشات کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے مطابق مسٹر جیک بریگینس ہی اس کے وکیل ہیں۔ جج نے بغیر سماعت تین دن کے لیے ملتوی کرتے ہوئے عدالت برخاست کر دی۔

لیٹی کو اس کے وکلا اپنی حفاظت میں باہر لے آئے۔ وہاں اہل خانہ اور دوسرے سیاہ فام افراد نے اسے یوں گھیر لیا جیسے اس کی جان کو خطرہ ہو۔ سیتھ ہیوبرڈ کے ورثا بھی ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ انھوں نے سیاہ فاموں کو گھورنے کی کوشش نہیں کی، وہ ان کی دولت ہتھیانے کے چکر میں تھے۔ جیک کمرا عدالت سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا جب ایک عدالتی اہلکار نے آواز دی کہا کہ جج اسٹلی اس سے ملنا چاہتا ہے۔ جج نے جیک کو ایک وکیل، کوئنس لنڈی کے بارے میں بتایا جو وصیتوں کی تصدیق کا طویل تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ جیک اس کا نام تجویز کرے وہ اس کو متبادل تعمیل کنندہ مقرر کر دے گا۔ مزید اس نے کہا کہ وہ ایک حکم کے ذریعے جیک کو سیتھ کا مالیاتی ریکارڈ قبضے میں لینے کا اختیار دے دے گا۔ جج نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ مقدمے کے لیے جیوری کی درخواست دے۔ جیک نے جج کے ساتھ اتفاق کیا۔

بارہ اکتوبر بدھ کے دن فورڈ کاؤنٹی ٹائمز کے پہلے صفحے پر ڈوماز کی اہم رپورٹ شائع ہوئی جس کا عنوان تھا: "ہیوبرڈ کی وصیت پر قانونی جنگ کی تیاری۔" ڈوماز نے اپنے مخصوص انداز میں تصاویر سے مزین کہانی پیش کی تھی: "گزشتہ روز پر ہجوم کمرا عدالت میں متوقع ورثا اور ان کے پرجوش وکلا جج ریوبن اسٹلی کے سامنے پیش ہوئے۔ ابتدائی کارروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ دو اکتوبر کو پھانسی کے پھندے پر جھولنے والے مرحوم سیتھ ہیوبرڈ کے ترکے پر عظیم الشان معرکہ آرائی ہونے والی ہے۔" صفحے کے درمیان میں سیاہ فام خوش شکل لیٹی لینگ کی اپنے وکلا کے ہمراہ بڑی تصویر دی گئی۔ جس کے نیچے لکھا تھا: "باکس ہل سے تعلق رکھنے والی سینتالیس سالہ لیٹی لینگ۔ سیتھ ہیوبرڈ کی سابق ملازمہ، جو مشکوک آخری وصیت سے بظاہر مستفید ہو سکتی ہے۔" ہرشل اور ایمونا کی دو چھوٹی تصویریں بھی رپورٹ کا حصہ تھیں۔ جیک نے بدھ کی صبح اخبار پڑھا، وہ ڈوماز کی صحافیانہ مہارت سے متاثر ہوا لیکن آخری وصیت کے لیے لفظ "مشکوک" استعمال کرنے پر خفگی کا اظہار کیا۔ دراصل یہ رپورٹ کاؤنٹی کے وہ افراد بھی پڑھتے جو مقدمے کے متوقع جیوری ارکان ہو سکتے ہیں۔ تصویر دیکھتے ہوئے جیک نے جیوری کو تخیل کی آنکھ سے دیکھا جو نو سفید فام اور تین سیاہ فام ارکان پر مشتمل ہوتی۔ ظاہر ہے سفید فام لیٹی لینگ کو ناپسند کرتے۔ ایک لمحے کے لیے جیک نے سوچا، وہ اس مقدمے سے الگ ہو جائے کیونکہ اس وحشیانہ لڑائی میں ہار بھی سکتا تھا۔ جب کہ اسے دو دھڑے کے بجائے فیس کی ضرورت تھی۔

تھوڑی دیر بعد جیک کا قدیم اور بھاری بھرکم وکیل دوست ہیری ریکس وانر جیک سے ملنے آیا۔ انھوں نے اس مقدمے کے بارے میں گفتگو کی۔ ہیری ریکس نے جیک

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی حوصلہ افزائی کی اور بہت سے مفید قانونی نکات اور مشورے اس کے گوش گزار کیے۔ اس نے کہا کہ آخری وصیت پر زوردار بحث ہو سکتی ہے اور اس کی تردید میں بہت سے دلائل گھڑے جا سکتے ہیں۔ مثلاً سیتھ کی بیماری کے باعث اس کی دماغی صحت ٹھیک نہ تھی۔ اس کے خوش شکل ملازمہ سے تعلقات تھے اور وہ سیتھ پر اثرانداز ہوئی۔ یہ دلائل جیوری کے کم خواندہ ارکان کو متاثر کریں گے۔ اس نے جیک سے کہا، ضروری ہے کہ وہ کسی طرح سسٹرنک کو مقدمے کی کارروائی سے باہر کر دے۔ اس نے اس سلسلے میں جیک کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

ہیری ریکس کی روانگی کے ایک گھنٹہ بعد جیک کو مقامی وکیل روفس لکّے کا فون آیا۔ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے اور کئی سال سے انھوں نے کبھی ایک دوسرے سے بات نہیں کی تھی۔ روفس نے جیک کو بتایا کہ وکیل سسٹرنک نے اس کو فون کیا ہے۔ اب وہ سیتھ ہبرڈ کے مقدمے میں اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے۔ اس نے جیک سے کہا کہ وہ اس مقدمے سے الگ ہو جائے کیونکہ وہ سول مقدمات میں ناتجربہ کار ہے۔ اس نے مزید کہا کہ سسٹرنک کی معاونت سے وہ یہ مقدمہ یقیناً جیت لیں گے۔

ادھر جال اینڈ مال ریستوران پر آیان ڈافو اور وکیل ویڈ لنچ کر رہے تھے۔ وکیل نے رازدارانہ لہجے میں آیان سے کہا۔ ''ہم یہ مقدمہ عدالت میں لے جائیں گے لیکن ہمیں کسی اور کی معاونت کی ضرورت ہے۔ ہرشل نے بلاوجہ وہ مسخرہ وکیل کھڑا کر لیا جو ہمارے کام میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ اسے کسی وکیل کی ضرورت نہ تھی۔ کیا آپ اس سے یہ بات کر سکتے ہیں کہ لٹ اور اس کی بہن کو ایک ہی وکیل کافی ہے اور میں یہ کام کر سکتا ہوں؟''

''میں نہیں جانتا۔ ہرشل کے اپنے نظریات ہیں اور ریمونا بھی ہمیشہ میرے ساتھ اتفاق نہیں کرتی۔''

''آپ انھیں قائل کرنے کی کوشش کریں کہ ان کے وکلا کی ضرورت نہیں۔ وہ بلاوجہ حصہ دار بن جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ کی فیس کتنی ہو گی؟''

''وصول کردہ رقم کا ایک تہائی۔ قانونی معاملات پیچیدہ نہیں ہیں اور مقدمہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ چلے گا۔ ہم سارے ورثا کا مقدمہ لینا چاہتے ہیں صرف آپ کا نہیں۔ رقم تو آتی ہی آئے گی۔''

''میں دیکھوں گا کہ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''ہم مقدمے کے اخراجات کا بل آپ کو ہر ماہ بھیج دیں گے۔ اور کچھ ماہر گواہان کے اخراجات بھی ہوں گے۔ نیز ایک تفتیش کنندہ بھی درکار ہو گا جو لیٹی لینگ کے ذاتی معاملات کی تحقیق کر کے الزامات کا مواد اکٹھا کرے گا۔''

''کل کتنے اخراجات ہوں گے۔''

''پچاس ہزار مقدمے کے اخراجات اور پچیس ہزار تفتیش کنندے کے۔''

''میرا خیال ہے میں اس مقدمے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔''

''آپ جلد دولت مند بننے والے ہیں۔ بس میرے ساتھ وابستہ رہیے۔''

''میں صرف پچیس ہزار ادا کروں گا۔ باقی اخراجات آپ خود کریں۔ آخر میں اس کا حساب کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ ہرشل سے بات کریں۔ اگر وہ نہیں مانا تو مجھے کوئی اور حربہ آزمانا پڑے گا۔''

''میں کوشش کروں گا۔'' (جاری ہے)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

طبی خلل

چودہ سالہ شہلا اپنی جماعت میں خاصی مقبول تھی۔ وہ ذہین، خوش شکل اور خاصی سڈول تھی۔ لیکن پھر اچانک اس کی زندگی تلپٹ ہو گئی۔

چند ماہ قبل شہلا نے معمول کے مطابق غذا کھانی چھوڑ دی۔ دوران طعام وہ صرف ایک روٹی کھانے ہی کی حد تک رہتی۔ اس نے چاول کھانے بھی چھوڑ دیے۔ معمول ہو گیا کہ دستر خوان سے پلیٹ میں بچا کھچا کھانا چھوڑ دیتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ چند ہی ہفتوں میں کمزور ہو گئی۔ چہرے کے بھی خال و خد ابھرنے لگے۔ اب وہ اپنی سہیلیوں سے بھی دور ہو گئی۔

بچی کی نازک حالت نے والدین کو شدید پریشان کر دیا۔ وہ جب بھی شہلا کو زیادہ کھانے کو کہتے، وہ تڑپ کر کہتی "آپ چاہتے ہیں میں موٹی ہو جاؤں۔ میں دوسری لڑکیوں کی طرح اسمارٹ اور خوب صورت نظر آنا چاہتی ہوں۔"

جب شہلا کی حالت مزید بگڑی، تو والدین زیادہ پریشان ہو گئے۔ وہ پھر عزیز و اقربا سے مشورے کرنے لگے۔ مگر کوئی نہ بتا سکا کہ شہلا نے کھانا پینا کیوں کم کر دیا؟ وہ سب لڑکی کی پُراسرار بیماری سے خوفزدہ ہو گئے۔ آخر ڈاکٹر سے رجوع کرنے پر انکشاف ہوا کہ شہلا ایک نفسیاتی عارضے "اینوریکسیا نروسا" (Anorexia Nervosa) میں مبتلا ہے۔ اس خلل میں مبتلا انسان پر

دبلا ہونے کے لیے مرے جانا

فیشن یا خوبصورتی کی خاطر خود کو بھوکا رکھ کے دبلا کرنا آپ کی جان بھی لے سکتا ہے

میں نے نہیں کھانا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوف طاری رہتا ہے کہ وہ فربہ ہو رہا ہے۔ سو وہ بھوک لگنے کے باوجود بہت کم کھانا کھاتا ہے۔

خاص بات یہ ہے کہ عموماً نوجوان شباب میں قدم رکھتی لڑکیاں اس خلل کا نشانہ بنتی ہیں۔ انہی میں شہلا بھی شامل تھی۔ جب وہ بہت کمزور ہوگئی تو اسے اسپتال داخل کرانا پڑا۔ وہاں ڈاکٹروں نے اسے طاقت بخش ادویہ اور غذائی سپلی منٹ دیے تو اس کی حالت سنبھلی۔

لیکن نفسیاتی طور پر شہلا صحت یاب نہ ہوسکی۔ جلد ہی وہ قے کرکے کھایا پیا باہر نکالنے لگی۔ تب معالجین کو معلوم ہوا کہ بچاری لڑکی کھانے پینے سے وابستہ ایک اور خلل "بولیمیا" (Bulimia) کا شکار ہو چکی ہے۔ اس ذہنی خلل میں مبتلا انسان دیوانوں کی طرح کھاتا پیتا اور پھر سارا کھایا پیا بذریعہ قے نکال دیتا ہے۔

شہلا امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ سو والدین نے بیٹی کے گرد ہر اقسام کے ڈاکٹر اکٹھے کر دیے کہ وہ صحت یاب ہو سکے۔ معالجین کی شبانہ روز کوششیں رنگ لائیں اور شہلا تندرست ہونے لگی۔ اس نے معمول کے مطابق کھانا پینا شروع کیا تو جلد اس کا وزن 48 کلو ہو گیا۔

درج بالا داستان عیاں کرتی ہے کہ کھانے پینے کے خلل (Disorders) پاکستان میں 12 سے 25 سال کے نوجوانوں کو نشانہ بنانے لگے ہیں۔ ان میں اکثریت نوجوان لڑکیوں کی ہے جو خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ لڑکیاں انوریکسیا نروسا یا بولیمیا کا شکار ہوتی ہیں۔

یہ صورت حال خاصی عجیب ہے۔ کیونکہ ایک طرف لاکھوں پاکستانیوں کو دو وقت کی روٹی بمشکل دستیاب ہوتی ہے۔ انہیں کھانے کو کم غذا ملتی ہے۔ دوسری سمت خصوصاً شہروں میں ایسے کئی نوجوان لڑکے لڑکیاں ملتے ہیں جو وانستہ بھوکے رہتے ہیں۔

مسئلے کی جڑ

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ معاشرے میں ٹی وی ڈراموں، اشتہاروں اور فلموں کی بھرمار ہو گئی ہے جن میں اسمارٹ اور حسین و جمیل لڑکیاں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی خصوصاً شہری لڑکیاں بھی یہ سعی کرتی ہیں کہ وہ ڈراموں کی ہیروئنوں اور ماڈلز کے مانند دبلی پتلی اور جاذب نظر آئیں۔ یہی تمنا پہلے انہیں کم کھانے پر مجبور کرتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ وہ انوریکسیا نروسا کا نشانہ بن جاتی ہیں۔

مزید برآں کسی موٹی لڑکی یا فربہ لڑکے کا مذاق اڑایا جائے، تو وہ بھی کم کھانے کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق کھانے پینے سے وابستہ خلل میں مبتلا ہونے والے (۱۱) فیصد مریض نفسیاتی امراض کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن کھانے پینے سے متعلق درج بالا دونوں ذہنی خلل خاصے خطرناک ہیں۔ کیونکہ یہ بہت عرصے چمٹے رہیں تو انسان امراض قلب کا نشانہ بن جاتا ہے۔ نیز فاقے سے ہڈیوں کا گودا کم ہوتا ہے۔ یوں بڑھاپے میں خصوصاً خواتین کی ہڈیاں بھربھری ہو جاتی ہیں۔ نیز ماہواری نظام میں گڑبڑ سے لڑکی کے بانجھ ہونے کا خطرہ بھی رہتا ہے۔

ڈاکٹر مزید خبردار کرتے ہیں کہ انوریکسیا نروسا اور بولیمیا، دونوں ذہنی امراض مزید بھی خرابیوں کو جنم دیتے ہیں۔ مثلاً مسلسل قے آنے سے دانتوں کی حفاظتی تہہ (انیمل) اتر جاتی ہے۔ خون کم ہوتا نیز دیگر اہم جسمانی اعضا گردوں اور جگر کو نقصان پہنچتا ہے۔

سو جو لڑکیاں یا لڑکے اسمارٹ اور خوب صورت نظر آنے کے چکر میں فاقہ کریں، انہیں درج بالا دونوں قسم کے ذہنی خلل سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

حسد کی آگ میں جلنے والی عورت کا عبرت انگیز انجام

جگر کا ٹکڑا

کشمیری بادشاہ نے پیچیدہ مقدمہ اپنی ذہانت کے بل پر حل کر لیا......ایک اچھوتا سچا واقعہ

محمد مقبول حسین خان کا تحفہ

آج سے سات سو سال پہلے کشمیر پر شہنشاہ سلطان زین العابدین کی حکومت تھی۔ سلطان جب تخت نشین ہوا تو ملک میں بدامنی کا دور دورہ تھا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصے میں شورش فرو کر کے ملک کو امن کا گہوارہ بنا دیا۔ سلطان نے انصاف عوام کے گھروں کی دہلیز تک پہنچانے کے لیے نئے قوانین بنائے۔ یہ قوانین تانبے کی تختیوں پر کندہ کر کے ہر قصبے اور گاؤں میں نمایاں مقامات پر آویزاں کروا دیے گئے۔

آج بھی کشمیر میں وہ قصے مشہور ہیں جب سلطان نے حق پر انصاف فیصلے کیے۔ کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ سلطان نے کئی ایسے پیچ دار مقدموں کا صحیح فیصلہ دیا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ ایک بار سلطان زین العابدین کے انصاف کے ترازو میں عجیب مقدمہ آیا۔ آئیے اس مقدمے کا قصہ سنیے۔

ایک روز دو عورتوں کو دربار میں لایا گیا۔ دونوں پر الزام تھا کہ انھوں نے ایک ننھا بچہ قتل کر دیا ہے۔ سلطان کی اجازت سے پہلی عورت نے عرض کیا:

"عالی جاہ! یہ عورت میری سوکن ہے۔ اس نے مجھے برباد کرنے کی خاطر میرا بچہ قتل کر دیا ہے۔ میں انصاف کی طالب ہوں۔ جہاں پناہ! وہ بچہ میرے جگر کا ٹکڑا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سوکن کے جلاپے میں کتنی آگ ہوتی ہے۔"

"اے عورت! کیا تو سچ کہتی ہے کہ تمھاری سوکن ہی نے تمھارا بچہ قتل کیا ہے؟" بادشاہ نے پوچھا۔

وہ چیخ چیخ کر کہنے لگی "ہاں! اسی ڈائن نے میرا بچہ ہلاک کیا ہے اور میں خون کے بدلے خون چاہتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوں۔

سلطان نے دوسری عورت سے پوچھا ”تم اپنی صفائی میں کیا کہتی ہو؟“

”حضور والا! خدا آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ سلامت رکھے۔ میں نے بچے کو قتل نہیں کیا۔ وہ بے شک اس کا بچہ تھا مگر میں بھی اسے دل و جان سے چاہتی اور پیار کرتی تھی۔ یہ عورت اتنی ظالم ہے کہ مجھے قتل کرانے کے لیے اس نے اپنے بچے کو خود ہی اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا۔ اور اب یہ مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہی ہے۔“ عورت نے دست بستہ عرض کی۔

یہ سن کر سلطان سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بات درست تھی کہ کوئی ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو نہیں مار سکتی۔ دوسری طرف اس کی سوکن جرم سے انکار کر رہی تھی اور پھر یہ مسئلہ بھی تھا کہ موقع کا کوئی گواہ موجود نہ تھا۔

سلطان کچھ سوچ کر دربار سے اٹھا اور محل کے ایک کمرے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے پہلی عورت کو بلایا اور اس سے کہنے لگا:

”دیکھو! میں تمھارا بیان ایک شرط پر صحیح مان سکتا ہوں۔“

”انصاف کی خاطر مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے حضور!“ عورت نے جواب دیا۔

اگر واقعی تم نے اپنے بچے کو قتل نہیں کیا بلکہ مارنے والی تمھاری سوکن ہے، تو تم اپنا دوپٹہ اتار کر برہنہ سر درباریوں کے درمیان سے گزر جاؤ۔ اگر تم ایسا کرو، پھر ہم تمھیں بے گناہ مان لیں گے۔“

عورت چند لمحے خاموش رہی پھر بولی ”اگر میرے برہنہ سر ہونے کی بنا پر میری سوکن کو قتل کی سزا مل سکتی ہے اور انصاف کا یہی تقاضا ہے تو حضور والا میں تیار ہوں۔“

سلطان نے اسے دربار میں واپس بھیج کر دوسری عورت کو بلایا اور اس سے کہا ”تم کہتی ہو کہ تم نے اپنی سوکن کا بچہ نہیں مارا۔ لیکن وہ کون سی وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو مار دے؟“

”حضور والا! یہ مجھ سے خواہ مخواہ حسد کرتی ہے۔ جبکہ میں نے کبھی بھی دل میں اس کے خلاف حسد یا بغض نہیں رکھا۔ اس نے خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو قتل کیا ہے تاکہ مجھے قتل کرا سکے۔ میں بے گناہ ہوں۔“ عورت نے عاجزی سے وہی جواب دیا جو بھرے دربار میں وہ سب کے سامنے دے چکی تھی۔

سلطان نے کہا ”اگر تم نے اس کے بچے کو نہیں مارا، تو ہم ایک صورت میں تمھارے بیان کو سچ مان سکتے ہیں کہ تم اپنا دوپٹہ اتار کر بھرے دربار سے گزر جاؤ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم سمجھیں گے کہ تم بے قصور ہو۔

”جہاں پناہ! گستاخی معاف! آپ مجھے خواہ اسی وقت یہاں قتل کرا دیں، لیکن میں یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتی۔“ اس عورت نے جواب دیا۔

”اے عورت! ایک بار پھر سوچ لے ابھی تمھارے پاس وقت ہے۔ تمھاری بے گناہی ثابت ہونے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔“ سلطان نے کہا۔

”حضور! مجھے قتل ہونا منظور ہے، لیکن بھرے دربار میں اپنی رسوائی اور ذلت منظور نہیں۔“ عورت نے نہایت عاجزی سے کہا۔

”بہتر!“ سلطان نے تالی بجائی۔ چوب دار کمرے میں داخل ہوا اور عورت کو دربار میں واپس لے گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کچھ دیر بعد سلطان دربار میں آیا۔ سب درباری ادب سے کھڑے ہو گئے۔ ان کی نظریں سلطان پر مرکوز تھیں کہ وہ اب کیا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ سلطان نے تخت پر بیٹھتے ہی حکم دیا کہ جلاد کو حاضر کیا جائے۔ جب جلاد حاضر ہوا تو سلطان نے پہلی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"اس عورت نے اپنے بچے کو قتل کیا ہے۔ اسے ہمارے سامنے اتنا پیٹا جائے کہ یہ اپنا جرم مان لے۔"

اسی وقت عورت کو شکنجوں میں جکڑ دیا گیا۔ ابھی چند کوڑے ہی پڑے تھے کہ وہ چیخ اٹھی: "عالم پناہ! رحم! مجھ پر رحم کیجیے۔ میں نے ہی اپنے جگر کے ٹکڑے کو قتل کیا ہے۔"

سلطان نے ہاتھ کے اشارے سے جلاد کو روکا اور پوچھا "اے ظالم عورت! تو نے اپنے ہی بچے کی جان لے لی۔ آخر کیوں؟"

"حضور! میں حسد کی آگ میں اندھی ہو گئی تھی۔ میں اپنی سوکن کو کسی طرح ختم کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کر دیا۔ میری سوکن بے گناہ ہے۔" عورت نے رو رو کر کہا۔

"تم جیسی ظالم اور بدفطرت عورت کا وجود انسانوں میں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ تمھیں موت کی سزا دی جاتی ہے۔"

یہ کہہ کر سلطان اٹھا اور دربار برخاست ہو گیا۔

◆◆◆

انسان کی بدنصیبی

آج کا انسان بہت ساری معلومات کے باوجود، جو مسلسل تجربات سے پرکھی جا چکی ہیں، حاصل ہونے والے واضح نتائج قبول کرنے کو تیار نہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ کئی علوم سے واقف ہونے کے باوجود اپنی ہی فکر کا غلام ہے۔

اسٹیفن ہاکنگ برطانیہ کے مشہور سائنسدان ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب کا نام "عظیم منصوبہ" (The Grand Design) رکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "یہ کائنات پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق نہیں بنی۔ کچھ طبعی قوانین (Physical Laws) تھے جن کی بنیاد پر یہ کائنات اتفاقیہ (By Chance) اور حادثاتی (Accidental) طور پر عظیم دھماکے (Big Bang) سے بننا شروع ہو گئی"۔ حیرت انگیز!

پھر یہ بھی کہتے ہیں "عظیم دھماکے سے پہلے کچھ بھی نہ تھا، نہ توانائی، نہ مادہ، نہ ہی کوئی دھماکہ کرنے والا۔" گویا اس دھماکے کے لیے نہ بارود تھا، نہ دیا سلائی، نہ بارود کو دیا سلائی دکھانے والا، بس دھماکا ہو گیا، اور اس کام کے لیے وہ کسی خالق (God) کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ یعنی پر عظمت ڈیزائن (Grand Design) تو موجود تھا مگر کوئی عظیم ڈیزائنر (Grand Designer) نہیں تھا، طبعی قوانین تو تھے مگر اس کا کوئی بنانے اور چلانے والا نہیں تھا، قوانین حرکت میں تھے، حرکت دینے والا کوئی نہ تھا۔" کیا یہ ایک انتہائی مضحکہ خیز، غیر علمی، غیر منطقی اور غیر سائنسی بات نہیں؟ (مرسلہ: قاضی مظہر الدین طارق، ادارہ معارف اسلامی، کراچی)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

رپورٹنگ چھت پھاڑ کر نیوز روم سے باہر نکل جانے۔ اس کوشش میں جس کے ہاتھ جو لگا، رپورٹ کیا اور جس کو جو ملا، وہی چلا۔ بہت سارے رپورٹرز تو ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے کہ کسی طرح اس توجہ حاصل کر لیں:

"یہ دیکھیں یہ زخمی اہلکار ہے..... ادھر دیکھیں یہ اہلکار لگتا ہے شہید ہو چکا......

ٹی وی اینکر چیخ چیخ کر بتا رہے تھے "ہم نے ابھی کچھ ہی دیر پہلے آپ کو ایک دہشت گرد کی لاش دکھائی ہے۔"

"ہم نے سب سے پہلے یہ خبر بریک کی۔"

"ہمارے رپورٹر نے سب سے پہلے بریک کیا کہ دہشت گردوں نے جہاز کو آگ لگا دی......"

اور میں ڈر رہا تھا کہ ابھی ان میں سے کوئی چینل یہ نہ کہہ دے "ہم نے آپ کو تین دن پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کراچی ہوائی اڈے پر حملہ ہونے والا ہے۔"

تعجب خیز بات یہ تھی کہ اسکرین پر یہ پٹی چلا کر کہ "بچے اس کو نہ دیکھیں" سب کچھ دکھایا جا رہا تھا یعنی بچے نہ دیکھیں، باقی عوام کو دعوت عام ہے۔ سونے پر سہاگا، ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جا رہا تھا "ہم آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہم نے ذمہ دارانہ رپورٹنگ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور پل پل آپ کو باخبر رکھا۔"

واقعے کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ نہ تو نیوز اینکروں کی پیاس کم ہو رہی تھی نہ ہی چینلوں کی۔ بول بول کر اینکرز اور رپورٹرز کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ اور جو الم غلم منہ میں آ رہا تھا، بس بولے چلے جا رہے تھے۔ لیکن سنسنی تھی کہ لمحہ بہ لمحہ بڑھائی گئی بلکہ چینلوں کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح ایک دہشت گرد سے بھی بات کر لیں اور یہ پوچھیں "اس حملے کا مقصد کیا ہے اور آپ اپنے ساتھ کس کس نسل کے بم لائے ہیں؟" کیوں کہ سوال کچھ ایسے ہی پوچھے جا رہے تھے۔ جیسے ایک اینکر نے آئی جی سندھ پولیس سے پوچھا "آپ یہ آپریشن کتنی دیر میں ختم کر لیں گے؟"

اس پر آئی جی سندھ کو کہنا ہی پڑا "بھائی یہ کیسا بیوقوفانہ سوال ہے۔"

بغیر سوچے سمجھے جانے وقوعہ کی لائیو فوٹیج دکھائی جاتی رہی۔ ایک طرف پاک فوج اور رینجرز آپریشن کر رہے تھے۔ دوسری طرف لائیو کوریج کے نام پر سب کچھ دکھایا جا رہا تھا۔ آپریشن کی ساری تفصیلات بڑے جوش و خروش کے ساتھ بیان کی گئیں کہ پاک فوج کی کون کون سی گاڑیاں ہوائی اڈے کی طرف جا رہی ہیں کتنے دستے جا رہے ہیں۔ سب تفصیلات لمحہ بہ لمحہ فراہم کی جا رہی تھیں۔ یقیناً دہشت گردوں کے ساتھیوں تک بھی یہی معلومات پہنچ رہی ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ آئی ایس پی آر کو یہ نوٹ کرنا پڑی کہ امدادی کارروائیوں میں رکاوٹ نہ بنیں۔ لیکن مت سے بھاگ نکلا ئے اینکروں اور رپورٹروں کے کانوں پر مجال ہے جوں تک بھی رینگی ہو۔

سفید چادروں میں لپٹی لاشوں کی قریب سے کھینچی گئی تصاویر "ایکسکلوزو" کے نام پر صحافتی اقدار کی دھجیاں بکھیر رہی تھیں۔ اور والله ہم کوں کی کوئی آدھ درجن اقسام اور ان کی کارکردگی سے تو میں آج کی رات میں ہی روشناس ہو گیا.... دستی بم اور فاسفورس بم وغیرہ وغیرہ۔

اب خدا جانے اندر کیا ہو رہا تھا مگر گھروں میں بیٹھے ناظرین یہی سمجھتے رہے کہ ہر دس منٹ بعد ایک دھماکا ہو رہا ہے۔ کیونکہ انہیں بتایا ہی گیا۔

ایک چینل نے تو ایسی پھرتی دکھائی کہ باقی سب منہ ہی تکتے رہ گئے۔ اینکر نے ایک جہاز کے مسافر سے بھی رابطہ کر لیا اور اس سے اپ ڈیٹ لینی شروع کر دی "آپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بتائیں، کیا صورت احوال ہے؟"

اس بچارے کے جواب پر مجھے ہنسی آگئی۔ وہ قسمت کا مارا پتا نہیں کس حال میں بیٹھا تھا کہنے لگا "میں تو جہاز میں دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھا ہوں مجھے کیا پتا باہر کیا ہو رہا ہے۔"

اس پر اینکر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور جاتے جاتے یہ بھی کہہ گیا..... "آپ فکر نہ کریں جلد از جلد دہشت گردوں پر قابو پالیا جائے گا۔"

دو چینل بتا رہے تھے کہ آپریشن ختم ہو چکا۔ باقی کہہ رہے تھے نہیں ابھی آپریشن چل رہا ہے۔

کسی حکومتی یا سرکاری پریس کانفرنس سے پہلے ہی ٹی وی چینلوں نے یہ کہنا بھی شروع کر دیا کہ حملے میں بھارتی ساخت کا اسلحہ استعمال کیا جا رہا ہے۔

خبروں کے میدان میں آنے والے ایک نئے نیوز چینل نے یہ تک کہہ دیا کہ دہشت گردوں نے ایک طیارہ ہائی جیک کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک چینل نے تو حد ہی کر دی پانچ گھنٹے تک اس چینل کے اینکر اور رپورٹر شور مچاتے رہے کہ دہشت گردوں نے ایک طیارے کو آگ لگا دی۔ رات گیارہ بجے سے لے کر صبح پانچ بجے تک چینل اسی بات پر مصر رہا کہ ایک طیارے میں آگ لگائی گئی ہے۔ وہ تو بھلا ہو ڈی جی (آئی ایس پی آر) عاصم باجوہ کا جنہوں نے یہ ٹویٹ کی کہ کسی طیارے کو آگ نہیں لگی۔

ڈھٹائی دیکھیے کہ چینل نے فوری طور پر اپنا بیان بدل کر یہ کہنا شروع کر دیا "ہم آپ کو اپ ڈیٹ کرتے چلیں کہ کسی طیارے میں آگ نہیں لگی۔"

مطلب یہ کہ پچھلے پانچ گھنٹے سے ہم جو آپ کو اپ ڈیٹ کر رہے تھے وہ سب بکواس تھا..... بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا جتنے چینل اتنی باتیں!

ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ اگر ماضی کے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو یہی پتا چلتا ہے کہ جب جب ایسا کوئی واقعہ پیش آیا اس کی لائیو کوریج میں ہمیشہ سے ٹی وی چینلوں کا یہی وتیرہ رہا ہے۔ چاہے وہ مہران نیول بیس کا واقعہ ہو یا کامرہ ایئربیس کا، ائیر بلیو حادثہ ہو یا بھوجا ائیر کا، ٹی وی چینلوں نے "ریٹنگ" کی دوڑ میں بنیادی صحافتی اخلاقیات کو لپیٹ کر الماری میں رکھ دیا۔

مجھے تو یہ لگتا ہے کہ برگر، سگریٹ اور سونا بیچنے والے ٹی وی چینلوں کے مالکان کے نزدیک صحافتی اخلاقیات محض ایک کاغذ (ریپر) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آزادی اظہار رائے جس کا ڈھول ٹی وی پروگراموں میں آج کل سب سے زیادہ پیٹا جاتا ہے محض ڈھکوسلہ ہے جسے یہ میڈیا ہاؤس بوقت ضرورت اپنی منشا کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔

سنا ہے، پیمرا نامی ایک ادارہ تھا جس نے کوئی چھوٹا سا ضابطہ اخلاق بھی بنایا تھا۔ یا شاید یہ ادارہ بھی اب اسلام آباد کی ایک شیشوں والی عمارت میں مقید ہے..... پیمرا جیسے فالج زدہ ادارے سے توقعات تو آج کل دیوانے کا خواب لگتا ہے کیونکہ عموماً ایسے حالات میں یہ ادارہ بھنگ پی کر سو رہا ہوتا ہے۔ جہاں معاملہ ہو کسی چینل کو بند کرنے کا، وہاں اس کی پھرتیاں دیدنی ہوتی ہیں۔

اب تو لگتا ہے پیمرا کو منظم کرنے کے لیے ایک ادارہ بنانا پڑے گا..... پوری دنیا میں ایسے واقعات کی لائیو کوریج کے لیے ایک ضابطہ اخلاق ہوتا ہے لیکن میاں! یہاں کہاں کا ضابطہ کیسا اخلاق! بات وہیں آ رکی ہے "جس کی لاٹھی اسی کی بھینس۔"

◆◆◆

WWW.PAKSOCIETY.COM

دنیا میں مطمئن و پُر سکون
رہنے کا نسخہ

پیار بانٹتے چلو

انسان کو بادل کی طرح ہونا چاہیے
جو پھولوں کے ساتھ ساتھ
کانٹوں پر بھی برستا ہے

وحید ممتاز

ایک انسان کے اپنے نفس، ماحول اور اس میں موجود مختلف اشیا اور لوگوں سے طرزِ عمل کا نام "رویہ" ہے۔ ہر انسان مختلف رویہ رکھتا ہے۔ کچھ لوگوں کی خصلت میں اچھائی یا برائی ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کو حالات اچھا یا برا بنا دیتے ہیں۔

بچوں کا رویہ سب سے اچھا اور مثالی ہوتا ہے۔ ان کی فطرت میں فرشتوں کی سی پاکیزگی ہوتی ہے۔ انھیں حالات کی کوئی پروا نہیں ہوتی، بس اپنی لگن میں مگن ہر وقت کھیلتے کودتے رہتے ہیں۔ ان بچوں کو نہ حسد کا پتا ہوتا ہے اور نہ ہی نفرت کے معنی سے واقف ہوتے ہیں۔

کھیل کے دوران آپس میں لڑ پڑتے ہیں مگر ان کے اس عمل میں بھی معصومیت ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد ہی جن کھلونوں کے لیے لڑ رہے تھے، انھی سے مل کر کھیلتے ہیں۔ بغض اور کینہ سے پاک اس زندگی کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

اس کے برعکس بالغ حضرات بچوں کی چھوٹی سی لڑائی کو لے کر بڑے جھگڑے کرتے ہیں۔ ایسا ہر جگہ نہیں ہوتا مگر اکثر صورتوں میں نتیجہ دشمنی اور لڑائی جھگڑے ہی کی صورت نکلتا ہے۔ بڑوں کو احساس ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں ہوتا کہ جن بچوں کے لیے وہ لڑ رہے ہیں، وہ تو اپنی لڑائی بھلا کر پھر کھیلنے میں مگن ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں تعلقات میں اکثر خلیج کی صورت اختیار کر لیتی اور قطع تعلق کا سبب بنتی ہیں۔

جب بچے کچھ بڑا ہو جائے یعنی لڑکپن کی حدود میں پہنچے، تو اپنے ماحول سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ مشاہدہ کرتا ہے کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ جو اچھی یا بری عادتیں اس کے بڑوں یا ماحول میں پائی جائیں، انھیں اختیار کر لیتا ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اگر بڑے کر رہے ہیں، تو یہ عمل ٹھیک ہی ہوگا۔ اس مرحلے پر بچوں کو والدین کی توجہ درکار ہوتی ہے۔ والدین کو چاہیے کہ بچوں پر سختی کریں مگر ہلکی پھلکی تاکہ وہ اچھی عادات کی طرف مائل ہو جائیں نہ کہ ذلت و رسوائی کا باعث بننے والی عادتیں اپنا لیں۔

جوانی وہ دور ہے جس میں انسان خود کو آزاد سمجھتا ہے۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اس مرحلے پر اچھا رویہ اختیار کرتا ہے یا اپنا جوش اسے برائی کی طرف لے جائے۔ اب انسان عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ تب اس کے لیے اپنے ساتھی، رفیق کار اور باس کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا ضروری ہے۔ اگر کسی شخص کو یہ ہنر آ جائے تو وہ ترقی کی منازل طے کرتا جاتا ہے، بصورت دیگر اسے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

جوانی کے بعد ادھیڑ پن آتا ہے۔ اس عمر کے افراد زیادہ تر پُرسکون رہتے ہیں۔ ان کا رویہ بھی لوگوں کے ساتھ مشفق اور پیار بھرا ہوتا ہے۔ پھر بڑھاپا آ پہنچتا ہے۔ اس مرحلے میں اکثر لوگ چڑچڑے پن کا شکار ہو جاتے اور بچگانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اس عمر کے لوگوں کو پیار اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب انسان کو احساس ہوتا ہے کہ اس نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

اکثر لوگوں کو نوجوانی کے کچھ برے اعمال کی سزا بڑھاپے میں ملتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم اخبار میں پڑھتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنے باپ کو گھر سے نکال دیا، فلاں نے باپ کو گولی مار دی وغیرہ۔ ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص معاشی حالات سے تنگ آ کر اپنے بوڑھے نحیف والد کو جنگل میں پھینکنے کی غرض سے لے گیا۔ جب وہ مناسب جگہ تلاش کر کے اپنے والد کو پھینکنے لگا، تو والد چلا چلا کر روتا اور فریاد کرتا ہے کہ مجھے یہاں نہ پھینکو۔

بیٹا پوچھتا ہے "کیوں؟"

باپ سسکتے ہوئے جواب دیتا ہے "اس جگہ میں نے اپنے باپ کو پھینکا تھا۔"

یہ دنیا واقعی مکافات عمل کی جگہ ہے۔

ایک سروے کے مطابق ۲۱ تا ۱۸ سال اور ۳۰ سال کے بعد کی عمر کے لوگ زیادہ پُرسکون اور خوش رہتے ہیں۔ ۲۱ تا ۱۸ سال وہ عمر ہے جب ہر انسان اپنی زندگی میں مگن ہوتا ہے۔ ۳۰ سال کی عمر کے لوگ اس لیے پُرسکون ہوتے ہیں کہ وہ ایک مقام پر پہنچ چکے اور انھیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ سروے سے ثابت ہوتا ہے کہ نوجوانی عیش و عشرت نہیں بلکہ احتیاط کا دامن پکڑے گزارنی چاہیے کیونکہ یہ دنیاوی زندگی کا سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ اسی میں انسان کو سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً روزگار کی فکر، معاشی پریشانیاں، شادی وغیرہ۔

رویے کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سب سے افضل رویہ حسن خلق ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "تم میں سے کامل ترین ایمان والا وہ ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو اخلاق میں تم سب سے افضل ہے۔" اگر انسان حسن خلق اختیار کرے، تو سمجھیں وہ دنیا میں کامیاب ہو گیا اور اس کی آخرت بھی سنور گئی۔ حسن خلق ہی وہ ہتھیار ہے جس سے بڑے سے بڑے دشمن کو زیر کرنا ممکن ہے۔ ایک مشہور کہاوت ہے "اپنے دشمن سے بھی ایسی گفتگو کرو کہ وہ اگر تمھارا دوست بن جائے، تو تمھیں اپنے الفاظ پر شرمندہ نہ ہونا پڑے۔"

اکثر لوگ اس رویے کو منافقت خیال کرتے ہیں۔ وہ دشمن کو نقصان سے دوچار کر فخر سے یہ داستان کے کہتے ہیں "دیکھو! ہم منافقوں میں سے نہیں، جو دل میں کچھ اور زبان پر کچھ اور رکھتے ہیں۔ ہم تو وہی کرتے ہیں جو ہمارے دل میں ہو۔"

تاہم یہ رویہ سراسر غلط ہے۔ جو لوگ یہ رویہ اختیار کر لیں، وہ عموماً بعد میں پچھتاوے سے دوچار ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ لیے دیے رہنے کے نام پر بالکل ہی اپنی ذات کے خول میں سمٹ اور تنہا ہو جاتے ہیں۔ یوں ان کی ذہنی صحت متاثر ہوتی ہے۔ وہ لوگوں سے بات کرتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار ہوتے اور بہت احمق اور دبو سے لگتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کو اپنی حدود میں رہنا چاہیے مگر مسکرانے اور خوش اخلاقی پر تو ہمارے مذہب نے بھی پابندی نہیں لگائی۔ اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہیں جو پیار کرتے، بانٹتے اور کرنا سکھاتے ہیں۔ بدلے میں ڈھیر سارا پیار اور خوشیاں ملتی ہیں کہ جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔

ہیلن کیلر نے بہترین زندگی کا راز بتاتے ہوئے کہا ہے: "کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، زندگی کا ہر دن ایسے انداز میں گزارا جائے جیسے ہم نے کل مر جانا ہے۔" یہ رویہ ہمیں زندگی کی اقدار سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ تب ہم زندگی کے زیادہ قدردان بن جاتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ کچھ عرصہ موت کے سائے تلے رہ لیں، وہ اپنے ہر کام میں زندگی کی ہلکی سی مٹھاس لے آتے ہیں۔

پیار بھرا رویہ واقعی بہترین زندگی گزارنے کا راز ہے۔ زندگی گزارنے کا لطف ہی اسی میں ہے کہ انسان صرف اپنی ذات سے وابستہ لوگوں کا ہی خیال نہ رکھے بلکہ کبھی ملنے جلنے والوں کے ساتھ محبت اور شفقت کا رویہ اختیار کرے۔ حضرت امام حسینؓ نے فرمایا ہے: "انسان کو بادل کی طرح ہونا چاہیے جو پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹوں پر بھی برستا ہے۔" آپؓ نے یہ بھی فرمایا "جو لوگ تمھارے دوست بننا چاہتے ہیں، ان کے ساتھی بنو، بادل کہلاؤ گے۔"

اس کے برعکس ایسا رویہ جو دوسروں کے لیے کوفت اور نقصان کا باعث بنے، وہ اپنے لیے بھی خوشی کا باعث نہیں بنتا۔ حسد کرنے والا شخص خود کو نقصان پہنچاتا اور ہر وقت کڑھتا رہتا ہے۔ یوں اس کی جسمانی اور ذہنی حالت پر برا اثر پڑتا ہے۔ حالانکہ وہ شخص جس سے حسد کرتا ہے، اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔

ایسا ہی حال منافق لوگوں کا ہے۔ وہ منہ پر تو لوگوں کی خوشامد کرتے، مگر پیٹھ پیچھے برے القابات سے پکارتے ہیں۔ کچھ عرصہ تو لوگ اس رویے سے خوش رہتے ہیں کیونکہ تعریف کس کو اچھی نہیں لگتی؟ مگر ایک مرتبہ اصلیت کھل کر سامنے آ جائے، تو اپنے غیر سب پیچھے ہٹتے اور ایسے شخص سے کترانے لگتے ہیں۔

جو لوگ جھوٹ بولیں، ان کا حال بھی زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ جھوٹ کے باعث وہ اپنا اعتبار کھو دیتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں۔ ان کا احساس انہیں اسی وقت ہوتا ہے جب پچھتاوے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کوئی ان کا دوست نہیں بنتا کیونکہ وہ برائیوں کی دلدل میں دھنس چکے ہوتے ہیں۔ مشہور کہاوت ہے "جھوٹ تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔"

بے رحم لوگوں کو خدا بھی ناپسند کرتا ہے۔ حدیث مبارک میں آتا ہے جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ ہماری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ ہم نے راہ ہدایت چھوڑ دی۔ ہم قرآن پڑھتے ہی نہیں تو ہمیں کیسے پتا چلے کہ اللہ تعالیٰ کے کیا احکامات ہیں؟

آج اگر ہم اور ہمارا ملک پستی کی طرف جا رہا ہے، تو اس میں کچھ نہ کچھ ہمارے رویے کا بھی حصہ ہے۔ اگر ہم جھوٹ بولنا اور چوریاں کرنا چھوڑ دیں، تو کیا حکومت کو جگہ جگہ ناکے لگانے اور کروڑوں روپے خرچ کرنے پڑیں؟ اگر ہر شخص عدالت میں خود جا کر بتا دے کہ اس کی ڈگری جعلی ہے تو کیا حکومت ان کے خلاف اقدامات کرنے میں واقعی اتنی مصروف ہوگی کہ تعلیم کی طرف توجہ ہی نہ دے سکے؟

اگر ہم بچپن ہی سے بچوں کی گھٹی میں یہ بات ڈال دیں کہ جھوٹ بولنا، چوری کرنا اور منافقت بری عادتیں اور اسلامی شریعت کے خلاف ہیں تو کیا وہ ان عادتوں کی طرف مائل ہوں گے؟ آئیے اپنا احتساب خود کریں کہ کہیں ہمارا رویہ بھی ان رویوں میں شامل نہیں جو ملک کو پستی کی طرف لے کر جا رہے ہیں! اور خود سے عہد کر لیں کہ پورے معاشرے کی نہیں، صرف اپنی اصلاح کریں گے، کیوں کہ:

"قطرہ قطرہ مل کر سمندر بنتا ہے۔"

◆◆◆

بات کی اہمیت

☆۔ جو شخص ایک مرتبہ بھی فضول بات کرے، وہ اپنی عقل کا ایک حصہ ختم کر دیتا ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆۔ جو بات دشمن سے پوشیدہ رکھنی ہے وہ دوست سے بھی نہ کہہ، ممکن ہے وہ کسی دن تیرا دشمن بن جائے۔ (لقمان حکیم)

☆۔ جو بات تم سے پوچھی نہ جائے اس کا جواب نہ دو اور نہ اس بات کو پوچھو جس سے تمہارا واسطہ نہیں۔ (لقمان حکیم)

☆۔ بات کو پہلے دیر تک سوچو، پھر منہ سے نکالو اور پھر اس پر عمل کرو۔ (افلاطون)

☆۔ اچھی بات خواہ کوئی کہے، پلے باندھ لو کیونکہ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ موتی کو سمندر کی تہہ سے ڈھونڈ کر باہر لانے والا شریف تھا یا رذیل۔ (سقراط)

☆۔ بات واضح، صاف اور غیر مبہم کیجیے تاکہ آپ کا حریف فائدہ نہ اٹھا سکے۔ (روزویلٹ)

☆۔ بات اگرچہ تیر نہیں لیکن تیر سے زیادہ زخمی کرتی ہے۔

(اصدق امین، واہ کینٹ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

قصہ کوئز/۱

لاہور میں واقع دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے جس کے صحن میں ایک لاکھ کے قریب افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔ عید کی نماز کے موقع پر یہاں تقریباً ۵ لاکھ افراد کا اجتماع ہوتا ہے جو اردگرد کے باغات میں دور دور تک صفوں کی صورت میں پھیلا ہوتا ہے۔ مسجد لاہور کے اکبری دروازے کے سامنے مغرب کی جانب سطح زمین سے ۱۵ فٹ بلند چبوترے پر واقع ہے۔ اس کے دروازے کے سامنے کچھ فاصلے پر لاہور کا شاہی قلعہ واقع ہے۔ قلعہ اور مسجد کے درمیان حضوری باغ اور رنجیت سنگھ کی بارہ دری ہے، جسے جلو خانہ بھی کہتے ہیں۔ اس پر مغلیہ دور کا ۱۶ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

(الف) یہ مسجد کس نے اور کب تعمیر کرائی؟

(ب) اس مسجد کا اصل نام کیا ہے؟

قصہ کوئز/۲

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر نے جب اجودھیا کا دورہ کیا تو فتح کی خوشی اور اس دورے کی یادگار کے طور پر فیض آباد سے کوئی دس کلومیٹر کے فاصلے پر اجودھیا کے مقام پر تین بڑے گنبدوں والی عالی شان مسجد تعمیر کروائی۔ تعمیر کی نگرانی بابر کے امیر، میر عبدالباقی کے سپرد تھی۔ چند سال پہلے بعض متعصب ہندو لیڈروں نے اچانک یہ دعویٰ کر کے عوام کو ورغلایا اور مسجد منہدم کر دی کہ اس مقام پر رام چندر جی کی جنم بھومی تھی جو پورے ہندوستان کی تاریخی، مذہبی، تہذیبی، ثقافتی اور سماجی قدروں کا مرکز تھی۔

(الف) کس مسجد کا ذکر ہے؟

(ب) اس مسجد کو ہندوؤں نے کب شہید کیا؟

قصہ کوئز/۳

بچپن میں اسے ترکستان سے نیشاپور لایا گیا اور حاکم نیشاپور نے اسے خرید کر اس کی تعلیم و تربیت کی۔ بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں وہ سلطان معز الدین غوری کے پاس غزنی میں آیا تو وہ زمانہ اس کی جوانی کا تھا۔ سلطان غوری نے اس کی قابلیت اور لیاقت دیکھ کر چھوٹے چھوٹے عہدے تفویض کیے۔ ترائین کی دوسری لڑائی کے بعد معز الدین سلطان غوری نے ممالک پاک و ہند کا نظم و نسق اور اس کی توسیع کا کام بڑی حد تک اس کے حوالے کر دیا۔ شمال مغربی سرحد پر خطرے کی وجہ سے اسے اکثر لاہور میں رہنا پڑا۔ ایک بار چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گرا اور زخمی ہو گیا اور چار سال بعد اسی زخم سے وفات پا گیا۔ اس کا مقبرہ انار کلی بازار سے ملحقہ گلی میں ہے۔ ہندوستان کی بیشتر فتوحات اس کے ہاتھ یا اس کی سرپرستی میں ہوئیں۔ وہ لکھ بخش کے لقب سے بھی مشہور تھا۔ اس نے بہت ساری تاریخی عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔ جن میں مسجد قوت الاسلام دہلی، مسجد اجمیر شریف قابل ذکر ہیں۔ وہ خاندان غلاماں کا بانی کہلایا۔

(الف) کس بادشاہ کا ذکر ہے؟

(ب) اس نے ایک مینار تعمیر کرایا اس کا نام بتائیں اور وہ کون سے شہر میں ہے؟

خوبصورت اور معیاری کتب کم قیمت اعلیٰ معیار

منشورات

اشاعت کے لیے تعاون

منصورہ، ملتان روڈ لاہور

042-35434909

042-35425356

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

قابلِ تعریف کاوش

آپ کا ارسال کردہ اردو ڈائجسٹ ملا۔ بہت خوشی ہوئی۔ قوم کی سیاسی، اخلاقی اور اقتصادی ترقی اور عروج کے لیے آپ کی کاوش بہت حوصلہ افزا ہے۔ میں آپ کے تجزیوں سے بہت متاثر ہوں۔ وقت نکال کر ضرور اردو ڈائجسٹ پڑھوں گا۔

(جسٹس مظہر عالم خان میاں خیل، چیف جسٹس پشاور ہائی کورٹ)

فیصلہ کن معرکہ

شمارہ جولائی موصول ہوا۔ شمالی وزیرستان میں جاری آپریشن ضربِ عضب میں مسلح افواج کی تائید و حمایت پر ہم آپ کے مشکور ہیں۔ افواجِ پاکستان اور ہماری قوم اس وقت حالتِ جنگ میں ہے اور ایک معرکہ بتا فیصلہ کن مراحل میں ہے۔ عوامی تائید کے بغیر کوئی جنگ جیتی نہیں جا سکتی۔ اس سلسلے میں آپ کی کاوش قابلِ تحسین ہے۔ جاری رکھیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

(لیفٹیننٹ جنرل سجاد غنی، کمانڈر کور، کراچی)

اردو کی ترقی و ترویج

آپ کی نیک خواہشات کا شکریہ۔ اردو ڈائجسٹ موصول ہوا۔ اردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے اردو ڈائجسٹ اور آپ کی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔

(مریم نواز شریف، دفتر وزیراعظم، اسلام آباد)

بلوچستان کے پہلے جنرل

شمارہ اگست میں جناب لیفٹیننٹ (ر) عبدالقادر بلوچ کو "بلوچستان سے بننے والا پہلا لیفٹیننٹ جنرل" بتایا گیا جو درست نہیں۔ جنرل محمد موسیٰ کئی سال پہلے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

صرف لیفٹیننٹ جنرل بنے بلکہ جنرل کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

(راجا محمد اکرام اللہ خان، راولپنڈی)

نوٹ: جنرل محمد موسیٰ کوئٹہ میں پیدا ہوئے لیکن وہ ۱۹۳۵ء میں برطانوی ہند کی فوج کا حصہ بنے اور جب وطن عزیز آزاد ہوا تو وہ کیپٹن بن چکے تھے۔ جب کہ جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ کو پاک فوج میں کمیشن ملا۔ اس لحاظ سے انھیں ہی پاک فوج کا پہلا لیفٹیننٹ جنرل سمجھنا چاہیے۔

مل کر ملک مضبوط کیجیے

یک جہتی کانفرنس کا احوال پڑھ کر سیروں خون بڑھ گیا۔ سابق راہنماؤں کے خیالات دل میں اتر جانے والے تھے۔ قوم میں تو دم بہت ہے، کاش منزل کی راہ پانے کی سعی کرنے والے راہنما بھی ہمیں میسر آ جائیں۔ موجودہ حکومت سے کچھ امید تو بندھ چکی بشرطیکہ ترام پر چلنے والے سیاستدان ڈنڈی نہ ماریں بلکہ ملک کو مضبوط بنائیں۔ (آمین)

جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ کا انٹرویو اور بلوچستان کے اس نامور سپوت کی تمام باتیں پہلی بار ابھر کر سامنے آئیں۔ حاصل مطالعہ اس دفعہ "نبی کریم ﷺ کی تکریم کرنے والے درخت" کا معلوماتی مضمون رہا۔ سبحان اللہ

(جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی)

بزرگوں کا تجربہ

اردو ڈائجسٹ کی ہمیشہ سے الگ شان رہی ہے۔ یہ ریڈرز ڈائجسٹ کے نمونے کا بہ صحت اور پروقار رسالہ سنجیدہ طبقے کا پسندیدہ چلا آ رہا ہے۔ بڑے اور چھوٹے قریشی صاحبان کے مشورے لیتے رہیے۔ بزرگوں کا تجربہ کام آنے والی چیز ہے اور بہترین راہنما نیک خواہشات کے ساتھ۔ (فرزانہ نگہت، لاہور)

نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی

۲۰۰۰ء سے اردو ڈائجسٹ زیر مطالعہ ہے۔ میں لوگوں کو اکثر ڈائجسٹ کی خصوصیت سے آگاہ کرتا اور انھیں اس کے مطالعے کا مشورہ دیتا ہوں۔ اردو ڈائجسٹ نے میرے اندر بھی لکھنے کا شوق ابھارا۔ ڈائجسٹ کی یہ خصوصیت بھی قابلِ داد ہے کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

(نجم شہزاد، راولپنڈی)

عوام کے لیے سوچیے

پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ جب بھی حکمران تخت پر بیٹھیں تو عوام سے کٹ جاتے ہیں۔ انھیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ عوام کس قسم کے مسائل و مشکلات میں مبتلا ہیں۔ ان مسائل کے حل نہ ہونے کی وجہ سے آج پاکستان مسائل کا گڑھ بن چکا۔ جب کہ حکمران چین و سکون کی بانسری بجاتے رہتے ہیں۔ حکمران عوام کی مشکلات دور کریں، ان کے متعلق سوچیں، تبھی ملک ترقی کر سکتا ہے۔

شمارہ اگست اچھی کاوش رہی۔ گو آزادی کے حوالے سے مواد زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ بہرحال قائداعظم کے بارے میں بہت کچھ پڑھنے کو ملا۔ جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ کا انٹرویو عمدہ تھا۔ "پاکستان اور بدلتا عالمی منظرنامہ" اور "بھارتی مسلمان اچھوت بن گئے" بھی قابلِ مطالعہ تحریریں تھیں۔

(محمود منور خان ایڈووکیٹ، سنبل نواں میانی سرگودھا)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

شمارہ اگست پر تبصرہ

سبز ہلالی پرچم نے شمارہ اگست کے سرورق کو دلکش بنا دیا۔ وفاقی وزیر عبدالقادر بلوچ کی کامیابی و کامرانی کی کہانی دلچسپ لگی۔ اصولوں کی خاطر نظام سے لڑنے والے شخص کی کہانی میں بہت سے اسباق پوشیدہ تھے۔ ''نبی کریم ﷺ کی تکریم والے درخت'' ''جعلی پیری'' منفرد موضوعات پر مشتمل تحریریں تھیں۔ آزادی نمبر کے حوالے سے خصوصی تحریریں بھی دل کو بھائیں۔

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس ملک میں رہنے والے بعض پاکستانی اسی کو برا بھلا کہتے نہیں تھکتے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جس تھالی میں کھاتا ہے، اس میں چھید کبھی نہیں کرتا۔ جس شاخ پر بیٹھتا ہے اس کو کبھی نہیں کاٹتا لیکن یہ ہمارا المیہ ہے کہ ہم اپنے ملک کی خامیاں بیان کرتے نہیں تھکتے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ہماری ہی پیدا کردہ ہیں۔

متاثرین وزیرستان کے حوالے سے اردو ڈائجسٹ نے جس یکجہتی کانفرنس کا انعقاد کیا، یہ خوش آئند اقدام ہے۔ کیونکہ ہجرت کرنے والے اسی ملک کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ ان کی مالی و اخلاقی مدد ہمارا فرض ہے۔ خدانخواستہ ہمیں اپنا گھر بار چند دنوں کے لیے چھوڑنا پڑے تو ہماری کیا کیفیت ہوگی؟ ان کا احساس کیجیے جنھوں نے رمضان المبارک کا مہینا بھی اپنے گھر سے دور بے سروسامانی میں گزارا۔ مجبوری میں کی گئی ہجرت کے دکھ کیا ہوتے ہیں، ہم شاید اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ امید ہے کہ اس طرح کی کانفرنسیں قوم کے اندر نئی صبح کے طلوع ہونے کا باعث بنیں گی۔

معروف دانشور و کالم نگار ڈاکٹر صفدر محمود کی تحریر ''وطن کی مٹی سے رشتہ'' جذبہ حب الوطنی میں گندھی ہوئی تحریر تھی۔ اپنی چھت اپنی ہی ہوتی ہے، خواہ ٹپکنے والی ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ٹپکنے لگے تو اسے چھوڑا نہیں بلکہ درست کیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح اپنا ملک اپنا ہوتا ہے خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو! اگر بگڑ جائے تو اسے چھوڑا نہیں درست کیا جاتا ہے۔

ام ایمان، خولہ مظہر نواز کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ مجموعی طور پر اگست کا شمارہ زبردست ہے۔ ہو سکے تو ڈائجسٹ کے صفحات میں اضافہ کیجیے۔

(رانا محمد شاہد، بورے والا)

تصحیح فرمائیے

شمارہ اگست میں ممتاز قانون دان خالد اسحاق مرحوم کی تاریخ پیدائش غلطی سے ۱۹۳۶ء شائع ہوگئی۔ درست پیدائش ۱۹۲۶ء ہے۔ (ادارہ)

توجہ فرمائیے

خط کے علاوہ آپ ہمیں درج ذیل ٹیلی فون نمبر (۹۲-۰۴۲-۳۵۲۹۰۷۳۸) اور ہماری ای میل سائیڈ (editor@urdu-digest.com) کے ذریعے بھی تازہ شمارے پر تبصرہ کر سکتے ہیں۔ قارئین کے تبصرے اردو ڈائجسٹ کو سنوارنے اور بہتر بنانے میں مدد و معاون بنتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM